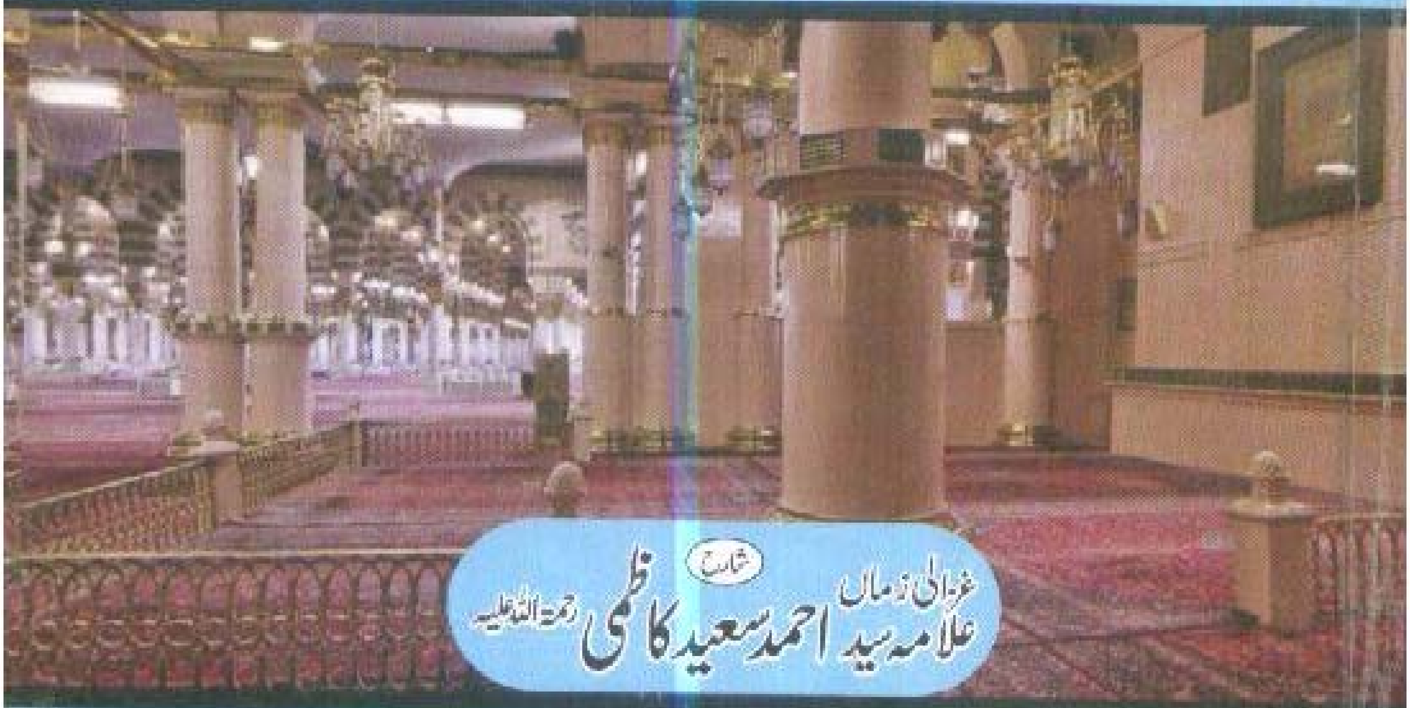
مشکل و پیچیدہ احادیث طیبہ کی تشریح پر مشتمل کتاب

مشکلات الحدیث



شارح

غزالی زماں

علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب

ابو کلیم محمد صدیق فانی

تحقیق و تخریج

خلیل احمد رانا

ورلڈ ویو پبلشرز

مشکل و پیچیدہ احادیث طیبہ کی تشریح پر مشتمل کتاب

بنام

مشکلات الحدیث

شارح

غزالی زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب

ابوکلیم محمد صدیق فانی

تحقیق و تخریج

خلیل احمد رانا

ورلڈ ویو پبلشرز

اردو بازار، لاہور

کتاب کا نام	:	مشکلات الحدیث
شارح	:	غزالی زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی علیہ الرحمۃ
ترتیب	:	ابوکلیم محمد صدیق فانی
تکمیل وتخریج	:	خلیل احمد رانا
پہلا ایڈیشن	:	فروری، ۲۰۲۰ء/ جمادی الثانی ۱۴۴۱ھ
تعداد	:	500
مطبع	:	ورلڈ ویو پبلشرز
ناشر	:	مقصود احمد کامران (0333-3585426)

ورلڈ ویو پبلشرز

ورلڈ ویو پبلشرز دکان نمبر ۱۱، الحمد مارکیٹ فرسٹ فلور غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

0333-3585426 042-37236426

worldviewforum786@gmail.com

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صلی اللہ علی حبیبہ سیدنا محمد و آلہ وسلم

سخنانِ چند

حاضر جوابی کے سلسلہ میں زندگی میں کئی ایک واقعات نظر سے گذرے ،مولوی سید آفتاب حسین میرٹھی کا ایک واقعہ نور احمد میرٹھی کی کتاب ''شخصیات میرٹھ'' میں پڑھا تھا کہ ایک مرتبہ مولوی سید آفتاب حسین اپنے ایک دوست اور مشہور شاعر مرتضیٰ حسین بیان میرٹھی سے ملنے گئے ،مکان پر پہنچ کر آواز دی ،بیان صاحب نے پوچھا کون ہے؟ جواب میں مولوی صاحب نے کہا'' آفتاب''،مرتضیٰ بیان صاحب نے کہا مغرب کے بعد آفتاب کیسا؟ مولوی صاحب نے فرمایا'' مرتضیٰ کے واسطے رجعت کی ہے''۔

حاضر جوابی کے سلسلہ میں بس کچھ ایسا ہی معاملہ حضرت کاظمی کریم علیہ الرحمہ کا دیکھا۔

ایک مرتبہ مدرسہ انوار العلوم ملتان کے سالانہ جلسہ میں دن کی نشست میں حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ مدعو تھے، محدث کچھوچھوی نے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے بے تکلفانہ انداز میں فرمایا کہ علامہ کاظمی صاحب نے آج مجھے معراج کے موضوع پر تقریر کرنے کا فرمایا ہے، حالانکہ معراج تو رات کو ہوئی تھی اور علامہ صاحب اس کا بیان دن کو کرا رہے ہیں،حضرت کاظمی علیہ الرحمہ اس وقت سٹیج پر تشریف فرما تھے،آپ نے حضرت محدث صاحب کی بات سن کر فوراً فرمایا! حضرت معراج تو رات کو ہوئی تھی مگر اس کا تذکرہ دن کو ہی ہوا تھا،

محدث صاحب آپ کے اس برجستہ جواب پر بہت محظوظ ہوئے اور آپ کو دعائیں دیں۔ ؎

احقر ۱۹۶۳ء میں پہلی بار حضرت ضیغم اسلام علامہ سید احمد سعید کاظمی امروہوی محدث ملتانی قدس سرہ العزیز (متوفی ۱۹۸۶ء) کی زیارت سے مشرف ہوا، آپ بے حد منکسر مزاج اور متواضع شخصیت کے مالک تھے، طبیعت میں سوز و گداز تھا، درس حدیث شریف کے وقت اکثر آنکھیں اشکبار رہتی تھیں، حاضر جوابی میں کمال کی ذہانت تھی، آپ کی حاضر جوابی نے احقر کو بہت متاثر کیا۔

۱۹۷۵ء میں رمضان المبارک کے دوسرے جمعۃ المبارک کے موقعہ پر راقم الحروف نے پہلی بار آپ کی اقتداء میں نماز ادا کی، دوران تقریر کسی صاحب نے ایک چٹ بھیجی کہ آپ لوگ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بہت تعریف کرتے ہیں اور حد سے زیادہ تعریف کرنا اللہ تعالیٰ سے بڑھانا ہے، حضرت کاظمی کریم علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ بھائی کیا آپ کے ذہن میں اللہ تعالیٰ کی کوئی حد ہے؟ آپ نے کیسے کہہ دیا کہ ہم حد سے بڑھا دیتے ہیں؟ وہ کہنے لگا کہ نہیں وہ تو لامحدود ہے، آپ نے فرمایا کہ بھائی جب اللہ تعالیٰ کی کوئی حد نہیں تو ہم کیسے بڑھا سکتے ہیں، یہ جواب سن کر وہ صاحب گنگ ہو گئے۔

۲۶ ستمبر ۱۹۸۰ء بروز جمعۃ المبارک جامع مسجد شاہی عیدگاہ ملتان میں راقم الحروف حاضر تھا، دوران تقریر حضرت علامہ کاظمی علیہ الرحمہ سے کسی صاحب نے یہ سوال کیا کہ آپ لوگ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بہت زیادہ تعریف کرتے ہیں، حالانکہ التحیات میں ہے کہ "اشھد ان محمد عبدہ" یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے بندے ہیں، تو بندے کی سی تعریف کرنی چاہئے۔

علامہ کاظمی کریم علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ بھئی "التحیات میں السلام علیك ایھا النبی" بھی تو ہے، اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عام بندے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی تخصیص

؎ ماہنامہ جناب عرض، رحیم یار خاں، شمارہ مارچ ۱۹۹۰ء، ص ۲۶۹

وفضیلت نہیں، تو آپ التحیات میں السلام علیك یافلاں صاحب یا خان صاحب یا چودھری کیوں نہیں کہتے، معلوم ہوا کہ حضور نبی کریم ﷺ عبد خاص ہیں، اور ایسے عبد کہ تمام عباد اللہ میں ممتاز ہیں، عبد کے معنی بندہ ہیں، بندہ غلام کو بھی کہتے ہیں جو کسی کی ملک ہو، تو سب بندے اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں، مسلم ہوں یا غیر مسلم لیکن ان میں مراتب کا فرق ہے۔ دیکھئے ایسے بندے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو مانتے ہی نہیں، اور نافرمان ہیں، اور ایسے بندے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں لیکن ان سے کچھ غلطیاں اور گناہ سرزد ہو جاتے ہیں، اور ایک ایسے بندے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ہر امر کی تعمیل کرتے ہیں۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کو نہ ماننے والا، خدا کے ماننے والے گنہگار بندے کے برابر نہیں، اسی طرح خدا کو ماننے والا گنہگار بھی اللہ تعالیٰ کے ماننے والے کامل واکمل بندے کے برابر نہیں، میں کہتا ہوں کہ حضور ﷺ کے عبد ہونے کے یہ معنی نہیں کہ حضور ﷺ ہمارے جیسے بندے ہیں، بلکہ یہ معنی ہیں کہ حضور ﷺ معبود نہیں، الحمدللہ ہمارا ایمان ہے کہ حضور ﷺ اللہ کے عبد ہیں اور جو عبد نہ وہ تو معبود ہوتا ہے، اور ہم حضور پرنور ﷺ کو عبد مانتے ہیں مگر بقول علامہ اقبال علیہ الرحمہ ؎

عبد دیگر عبدہ چیزے دگر
ادسرا پا انتظار ایں منتظر

ایک مرتبہ حضرت غزالی زماں علامہ کاظمی قدس سرہ سے ایک شخص نے کہا کہ آپ لوگ یہ جو "یارسول اللہ مدد" کہتے ہیں، یہ جائز نہیں ہے، اس کے بجائے "یا اللہ مدد" کہنا چاہیے، کیونکہ غیر اللہ سے مدد مانگنا یہ تو اللہ تعالیٰ کو عاجز سمجھنا ہے، کیا اللہ تعالیٰ مدد نہیں کر سکتا؟

حضرت علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ حرف "یا" سے اُسے پکارا جاتا ہے جو دُور ہو، یا پھر اُسے مخاطب کیا جاتا ہے جو نزدیک ہو لیکن غیر متوجہ ہو، آپ دیکھئے اللہ تعالیٰ نہ تو دُور ہے اور نہ ہی غیر متوجہ ہے، تو پھر "یا اللہ" کہنے کا کیا مطلب ہوا؟

پھر آپ نے خود ہی فرمایا! ارے بھائی یا اللہ کہنا دراصل اللہ تعالیٰ کی رحمت کو متوجہ کرنا مقصود ہوتا ہے، اب ایمان سے کہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کون ہیں؟ ارے اللہ تعالیٰ کی رحمت میرے آقا رسول کریم ﷺ ہی تو ہیں، گویا یا اللہ کہنا بھی یا رسول اللہ ہی کہنا ہے۔

رہا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں سے مدد مانگنا اگر اللہ تعالیٰ کے عاجز و مجبور ہونے کی دلیل ہے، تو اللہ تعالیٰ بھی بندوں سے مدد مانگتا ہے، آپ کہیں گے کہ اللہ کا مدد مانگنا کہاں ہے؟ تو میں نہیں کہتا قرآن مجید نے صاف کہا:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے '' ان تنصروا الله ينصركم '' (سورۃ محمد، آیت ۷)

'' ان تنصروا الله '' جملہ شرطیہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا، اب اگر کوئی کہے کہ ہم تو اللہ ہی سے مدد مانگیں گے، تو جناب اللہ تعالیٰ نے تو اپنی مدد کرنے کو مشروط کر دیا تمہارے مدد کرنے سے، یعنی تم میری مدد کرو گے تو میں بعد میں تمہاری مدد کروں گا، کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جزا شرط کے بعد ہوتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت کا مطلب و معنی کیا ہے؟ یعنی اس آیت میں اللہ کی مدد کرنے سے کیا مراد ہے؟ آیت کے معنی یہ ہوں گے '' ان تنصروا الله اي تنصروا دين الله ينصركم '' یعنی اگر تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔

اب دیکھئے اللہ اپنے دین کی مدد تم سے کرا رہا ہے، آپ کیوں نہیں کرتا، کیا اللہ تعالیٰ مجبور اور محتاج ہے؟ ارے بھائی یہ تم سے جو مدد کرا رہا ہے یہ اللہ ہی کا مدد کرنا تو ہے، اسی طرح انبیاء و اولیاء کا مدد کرنا وہ اللہ ہی کا مدد کرنا ہی تو ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی نے مدد کرنے کی طاقت ان کو دی، اللہ تعالیٰ ہی کا تو حکم متعلق ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت ان سے متعلق ہے، اگر تمہارا مدد کرنا اللہ کا مدد کرنا ہے تو انبیاء و اولیاء کا مدد کرنا، اللہ کا مدد کرنا ہے۔

ایک مرتبہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں ایک پروفیسر صاحب نے حضرت غزالیٔ

زماں علیہ الرحمہ سے کہا کہ میں اپنی ایک الجھن دور کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا عقیدہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کو ماکان ومایکون (جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ ہونے والا ہے) کا علم ہے، اس طرح آپ حضور ﷺ کے علم کو اللہ تعالیٰ کے علم کے مساوی مانتے ہو، کیونکہ جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ ہونے والا ہے، یہی علم الٰہی ہے۔

آپ نے فرمایا کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ جو کچھ ہوا اور جو کچھ قیامت تک ہوگا، اس سب کا کل علم متناہی ہے، اور اس کا علم حضور ﷺ کو تدریجاً عطا ہوا۔ ماکان ومایکون کا علم ماضی و مستقبل کی سب موجودات کا علم ہی تو ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا علم تو غیر متناہی ہے،، جو کچھ ہو سکتا تھا مگر نہیں ہوا اس سب کا علم بھی اللہ تعالیٰ کو ہے یعنی موجودات کے علاوہ جمیع ممکنات (جو کہ لامتناہی ہیں) کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ کیا لامتناہی (جس کی انتہا نہ ہو) اور متناہی (جس کی انتہا ہو) برابر ہو سکتے ہیں؟ یقیناً نہیں ہو سکتے تو حضور نبی کریم ﷺ کا متناہی علم، علم الٰہی کے مساوی کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ جواب سن کر پروفیسر صاحب خاموش ہو گئے۔

علامہ سید احمد سعید کاظمی امروہوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک مرتبہ کوٹ ادو ضلع مظفر گڑھ (پنجاب) کے علاقہ میں ایک پروگرام میں تقریر کے لئے تشریف لے گئے، اس جگہ کے رہنے والوں نے حضرت کاظمی علیہ الرحمہ کو بتایا کہ چند روز پہلے یہاں بدعقیدہ لوگوں کا جلسہ ہوا، جس میں ایک مقرر نے اپنی تقریر میں کہا کہ اے لوگو! تم رسول اللہ ﷺ سے مدد اور اعانت کے طلب گار ہوتے ہو، یہ کس قدر بے وقوفی کی بات ہے، دیکھو اماں عائشہ، رسول اللہ کی چہیتی بیوی تھیں، وہ تو ساری عمر ایک بیٹے کے لئے ترستی رہیں لیکن رسول اللہ انہیں ایک بیٹا نہیں دے سکے، اور تم ان سے مانگتے ہو تمہیں کیا ملے گا؟

علامہ کاظمی کریم علیہ الرحمہ نے جب یہ واقعہ سنا تو اس بدعقیدہ مولوی کے گستاخانہ انداز والفاظ کے باعث چہرہ پر انتہائی غیظ وغضب کے آثار نمودار ہوئے، اور فرمایا ان شاء اللہ میں ابھی تقریر میں اس کا جواب دوں گا، اس گفتگو کے کچھ دیر بعد تقریر کا آغاز ہوا تو آپ نے بد

عقیدہ لوگوں کے اس جلسہ میں ہونے والے اعتراض کو بیان فرمایا، پھر لوگوں سے دریافت فرمایا کہ اگر کوئی تمہاری ماں، بہن، باپ، بھائی پر کوئی الزام تراشی کرے، بہتان باندھے تو کیا تم برداشت کرو گے؟ تمام مجمع نے کہا کہ ہرگز نہیں، ہم ایسا کبھی برداشت نہیں کریں گے۔

اس پر علامہ کاظمی علیہ الرحمہ نے کہا کہ اس بدگو، بدطینت شخص نے تمام مومنوں کی ماں پر بہتان باندھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان اور وضاحت کے باوجود بہتان باندھا۔ علامہ کاظمی علیہ الرحمہ نے اپنی اس بات کی وضاحت فرمائی کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی پاک بیویوں سے فرمایا!

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا۔ [1]

(یعنی اے نبی ﷺ اپنی بیویوں کو بلا کر ان سے فرما دو اگر تمہیں دنیا کی زندگی اور اس کی زینت مطلوب ہے تو آؤ میں تمہیں مال دے کر اچھی طرح الگ کر دوں۔)

اس آیت میں حضور نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی ازواج مطہرات کو حیاتِ دنیا کی زینت عطا فرمانے کا کہا ہے، زینت حیات کی وضاحت خود قرآن مجید نے ہی دوسری آیت میں کی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرمایا ہے: ''اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا''۔ یعنی مال اور بیٹے دنیوی زندگی کی زینت ہیں۔ (سورۃ الکہف، آیت ۴۶)

احادیث سے ثابت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی پاک بیویوں نے دنیاوی جاہ وحشم اور زینت کو ترک کر دیا تھا اور حضور پر نور ﷺ کی رفاقت کو اختیار کیا، لیکن بدعقیدہ لوگ بہتان باندھتے ہیں کہ ازواج مطہرات کو حضور ﷺ کی زوجیت کی نہیں بیٹے کی تمنا تھی۔ [2]

---

[1] سورۃ الاحزاب، آیت ۲۸

[2] ماہنامہ ''السعید'' ملتان، شمارہ مارچ ۱۹۹۵ء، ص ۲۶

راقم الحروف اکتوبر ۱۹۸۱ء کے آخری جمعہ کو کبیر والا ضلع خانیوال میں مولانا عبدالقادر سعیدی علیہ الرحمہ سابق سٹیج سیکرٹری سالانہ جلسہ جامعہ انوار العلوم ملتان کی خدمت میں حاضر ہوا، مولانا نے حضرت علامہ کاظمی کریم علیہ الرحمہ کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ ایک دن علامہ کاظمی علیہ الرحمہ نے مجھے فرمایا کہ ایک مرتبہ سندھ کے تبلیغی دورہ سے واپسی پر گھوٹکی (ضلع سکھر) میں دیوبندی مکتبہ فکر کے چار مولویوں سے مختلف مسائل پر گفتگو طے پائی، یہ چاروں مولوی دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے، پہلے مولوی صاحب سے مولوی اشرف علی تھانوی کے کتابچہ ”حفظ الایمان“ کی مشہور گستاخانہ عبارت پر گفتگو شروع ہوئی، دیوبندی مولوی نے عبارت میں تاویل شروع کردی کہ عبارت میں لفظ ”ایسا“ سے یہ مراد نہیں وہ مراد نہیں، آپ نے فرمایا صرف اتنی بات بتادیں کہ حضور پرنور ﷺ کا علم شریف ”قطعی“ ہے یا ”ظنی“ ہے؟ یعنی حضور نبی کریم ﷺ کا علم یقینی ہے یا گمانی ہے؟ اگر آپ کہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ کا علم ظنی یا گمانی یا قیاسی ہے تو اسلام کی تمام عمارت ہی منہدم ہو جائے گی، کیونکہ پھر تو ہر کوئی کہہ سکتا ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ کا علم یقینی نہیں بلکہ ظنی یا گمانی ہے تو کسی احکام کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ صحیح ہے، کیا خبر کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے گمان سے کہا ہو اور یہ صحیح نہ ہو، لامحالہ آپ کو ماننا پڑے گا کہ حضور نبی کریم ﷺ کا علم قطعی اور یقینی ہے کیونکہ یہ وحی کا علم ہے۔

اب آپ یہ ثابت کریں کہ جمیع حیوانات اور فلاں کا علم بھی قطعی اور یقینی ہے، اگر نہیں ثابت کرسکتے تو تھانوی صاحب نے یہ کیا لکھ دیا کہ اس میں حضور کی کیا تخصیص ہے ایسا (قطعی) علم غیب تو فلاں فلاں کو بھی حاصل ہے یقیناً تھانوی کی یہ عبارت لغو، فضول اور حضور نبی کریم ﷺ کی توہین ہے، کیونکہ اس علم غیب میں علم قطعی ہونے کی وجہ سے حضور ﷺ کی تخصیص ہے، جب زید وعمر وغیرہ کا علم قطعی نہیں تو تشبیہ بھی غلط اور گستاخی ہے۔

ایک مرتبہ غزالی زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمتہ اللہ علیہ بہاول پور (پاکستان) میں

تقریر فرما رہے تھے، کسی نے سوال کیا کہ آپ تو کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ کے نور کا حصہ، ٹکڑا یا جز نہیں ہیں، مگر اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی حدائق بخشش میں کہتے ہیں:

''نور وحدت کا ٹکڑا ہمارا نبی''

تو آپ کیسے کہتے ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا ٹکڑا نہیں مانتے؟

علامہ کاظمی صاحب علیہ الرحمہ نے جواب میں فرمایا کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ نے کس کا ٹکڑا مانا، واحد کا یا وحدت کا؟ آپ اللہ تعالیٰ کو واحد کہتے ہیں یا وحدت کہتے ہیں؟ ارے وحدت تو وصف ہے، اور صفات کے جلوے اور انوار ہوتے ہیں، اگر اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ فرماتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم واحد کا ٹکڑا ہیں یا اِلٰہ واحد کا ٹکڑا ہیں، تب تو آپ کی بات درست ہوتی، اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ واحد کا ٹکڑا نہیں فرما رہے وہ تو فرما رہے ہیں ''نور وحدت کا ٹکڑا ہمارا نبی''، وحدت صفت ہے اور اس صفت کے جو انوار و تجلیات ہیں وہ میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی صفت وحدت کے نور کا جلوہ ہیں، اللہ کی ذات کا ٹکڑا نہیں ہیں، ہم تو اللہ تعالیٰ کو واحد کہتے ہیں، تم اللہ تعالیٰ کو وحدت کہو تو تمہاری مرضی، بتائیے اللہ تعالیٰ واحد یا وحدت ہے؟ یقیناً اللہ واحد ہے، تو اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے کب کہا کہ حضور واحد کا ٹکڑا ہیں؟ پہلے تم وحدت کو اللہ بناؤ پھر اعلیٰ حضرت پر اعتراض کرو کہ انہوں نے اللہ کا ٹکڑا بنا دیا، اگر وحدت تمہارے نزدیک اللہ ہے تو پھر تم اپنے ایمان کی خبر لو۔ [1]

''نور من نور اللہ'' کا مفہوم

''نور من نور الله'' کے معنی یہ نہیں کہ معاذ اللہ حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نور، اللہ تعالیٰ کے نور کا مادہ ہے، یا حصہ ہے، جز ہے، جیسا کہ بعض لوگوں کو جہالت کی بنا پر مغالطہ ہوتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نور، اللہ تعالیٰ کے نور کا نہ تو مادہ ہے، نہ جز اور نہ ٹکڑا ہے،

---

[1] روایت حافظ بشیر احمد سعیدی خطیب جامع مسجد البدر بہاری کالونی بہاولپور

لفظ "من" جزیت کے لئے نہیں ہے بلکہ لفظ "من" تشریفیہ ہے، یعنی شرافت اور بزرگی کے لئے ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نور براہ راست نور ذات الٰہی کے فیض سے پیدا کیا گیا ہے، لفظ "من" سے مغالطہ میں مبتلا ہو کر یہ خیال کرنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نور، اللہ تعالیٰ کے نور کا جز ہے تو خالص کفر ہے۔

امام احمد رضا قادری بریلوی رحمۃ اللہ علیہ "مِنۡ نُوۡرِہٖ" کی تشریح میں فرماتے ہیں!

"عین ذات الٰہی سے پیدا ہونے کے یہ معنی نہیں کہ معاذ اللہ ذات الٰہی، ذات رسالت کے لئے مادہ ہے، جیسے انسان مٹی سے پیدا ہوا، یا عیاذ باللہ ذات الٰہی کا کوئی حصہ یا کل ذات نبی ہو گیا، اللہ عزوجل حصے اور ٹکڑے اور کسی کے ساتھ متحد ہونے یا کسی شے میں حلول فرمانے سے پاک و منزہ ہے"۔[۱]

علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمتہ اللہ علیہ حدیث نور کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے نور پاک یعنی ذات مقدسہ کو اپنے نور یعنی اپنی ذات مقدسہ سے پیدا فرمایا، اس کا معنی یہ نہیں کہ معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ کی ذات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات کا مادہ ہے یا نعوذ باللہ حضور کا نور اللہ کے نور کا کوئی حصہ یا ٹکڑا ہے، عن ذالک علوا کبیرا، اگر کسی ناواقف شخص کا یہ اعتقاد ہے تو اسے توبہ کرنا فرض ہے، اس لئے کہ ایسا ناپاک عقیدہ خالص کفر و شرک ہے، اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے، بلکہ اس حدیث کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی ذاتی تجلی فرمائی جو حسن الوہیت کا ظہور اول تھی، بغیر اس کے کہ ذات خداوندی نور محمد کا مادہ یا حصہ اور جزو قرار پائے، یہ کیفیت متشابہات میں سے ہے، جس کا سمجھنا ہمارے لئے ایسا ہی ہے جیسا کہ قرآن و حدیث کے دیگر متشابہات کا سمجھنا"۔[۲]

---

[۱] امام احمد رضا بریلوی، صلاۃ الصفا فی نور المصطفیٰ، مطبوعہ لاہور، ص ۴۷

[۲] علامہ سید احمد سعید کاظمی، میلاد النبی، مطبوعہ مبارک پور اعظم گڑھ ۱۴۰۰ھ ص ۱۹

علامہ سید احمد سعید کاظمی علیہ الرحمہ نے ایک دوسری جگہ اس کی وضاحت اس طرح کی ہے!

''حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدا کے نور سے مخلوق ماننے کا یہ مطلب نہیں کہ معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے جزو ہیں، بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نورِ ذات کا جلوہ ہیں، بلاتشبیہ جس طرح آئینہ میں سورج کی روشنی اس کے انوار کا جزو نہیں ہوتی بلکہ ایک تجلی ہوتی ہے، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نورِ ذات کی تجلی اور اس کا جلوہ ہیں، البتہ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اقانیم ثلاثہ میں سے ایک اقنوم مانتے ہیں اور ''اب، ابن اور روح القدس'' تینوں کو اجزاء قرار دے کر ان کے مجموعے کو خدا کہتے ہیں، مختصر یہ کہ خدائے قدوس کے لئے اس کے نورِ ذات کا جلوہ ماننا اسلام ہے اور اس کے لئے جز ثابت کرنا عیسائیت ہے''۔[1]

ایک الجھن کا حل

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا نور کبھی جزء نہیں ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نور سے کیسے پیدا ہو گئے، یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی۔

اس سوال کا جواب علامہ سید احمد سعید کاظمی علیہ الرحمہ نے اپنی ایک تقریر میں آسان لفظوں میں دیا ہے، جو درج ذیل ہے، آپ فرماتے ہیں!

''دیکھئے سورج آسمان پر چمک رہا ہے، آپ نیچے زمین پر آئینہ رکھ دیں، ایمان سے کہنا کہ اس آئینے میں سورج چمکتا ہوا نظر آئے گا یا نہیں؟ اس آئینے میں روشنی اور نور آئے گا یا نہیں؟ یقیناً آئے گا، اب بتائیے کہ اس آئینے میں جو روشنی ہے وہ سورج کی روشنی ہے یا نہیں؟ اب اگر کوئی یہ کہے کہ نہیں جناب یہ سورج کی روشنی نہیں، اگر یہ سورج کی روشنی ہے تو جتنی روشنی

---

[1] علامہ سید احمد سعید کاظمی، اسلام اور عیسائیت، مطبوعہ ملتان ۱۹۶۲ء، ص ۲۲

اس میں آئی اتنی روشنی سورج میں کم ہو جانی چاہیے، کیا آپ اس بات کو مان لیں گے؟ یقیناً نہیں مانیں گے، آپ دوسرا آئینہ رکھ دیں، تیسرا رکھ دیں، ہر آئینہ میں پورا سورج چمکتا ہوا نظر آئے گا، مگر وہاں کوئی کمی نہیں آئے گی، اگر کوئی کہے کہ نہیں صاحب کمی تو ہو ہی گئی، تو میں ان سے پوچھتا ہوں کہ ایک دو آئینے رکھنے سے تو کچھ کمی ہوا اور اگر ہزاروں لاکھوں آئینے رکھ دیئے جائیں تو سورج کا تو بالکل صفایا ہی ہو جائے اور سورج کا سارا نور ان آئینوں میں تقسیم ہو کر ختم ہو جائے، تو میرے بھائی اگر کروڑوں اربوں آئینے بھی رکھ دیئے جائیں تو وہاں کمی نہیں آئے گی، جب وہاں کمی نہیں آئی تو پتہ چلا کہ آئینہ جو سورج کے نیچے رکھا ہے وہ سورج کا جز نہیں ہے، اور سورج جو اس آئینے میں چمکتا ہوا نظر آرہا ہے آپ اس آئینے کے نور کو کیا کہیں گے؟ سورج کا جز تو کہہ نہیں سکتے کیونکہ نہ تو اصل سورج آئینے میں آیا اور نہ ہی آئینہ سورج کا حصہ بنا بلکہ آئینہ سورج کے نور کا مظہر بنا، لہذا اس کو سورج کے نور کا جلوہ کہیں گے، حصہ، جز یا ٹکڑا نہیں کہہ سکتے"۔ [۱]

حدیث میں ایک مشکل کا حل

اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اپنے حسن الوہیت کی جلوہ گاہ اپنے محبوب ﷺ کو بنایا اور حسن مصطفیٰ ﷺ کے حسن محمدیت کی جلوہ گاہ مقام ولایت ہے، اگر رسول کو علم غیب نہ ہو تو خدا تعالیٰ کے علم غیب کی دلیل کہاں سے آئے گی، میرے آقا ﷺ کا علم غیب معجزہ ہے، یہ معجزہ خدا تعالیٰ کے کمالات الوہیت کی دلیل ہے اور اولیاء اللہ کی کرامات، وہ معجزات مصطفیٰ ﷺ کی دلیل نہیں ظہور ہیں، نبی کو علم عطائی اور یقینی ہوتا ہے، اور ولی کو علم غیب کا انکشاف ہوتا ہے، جو

---

[۱] علامہ سید احمد سعید کاظمی، تقریر مقصود کائنات، مطبوعہ لاہور ۱۹۸۵ء، ص ۱۴

ظنی ہوتا ہے، یہ الہامِ ولایت ہے، الہامِ ولایت پر سرکار ﷺ کے زمانہ میں ایک عجیب واقعہ ہوا، وہ یہ کہ حضور ﷺ کے ایک صحابی حسن بن نضر رضی اللہ عنہ کی بہن کی لڑائی کسی دوسری عورت سے ہوگئی اور اس کا دانت توڑ دیا، یہ مقدمہ سرکار ﷺ کی بارگاہ میں پیش کیا گیا کہ انس بن نضر کی بہن نے ہماری بہن کا دانت توڑ دیا، مدعی اور مدعا علیہ دونوں سرکار ﷺ کی بارگاہ میں پیش ہیں اور سرکار ﷺ کے فیصلے کے منتظر ہیں، تو حضور ﷺ نے فرمایا! "یا انس کتاب اللہ والقصاص" اے انس! اللہ سبحانہ تعالیٰ کی کتاب کا فیصلہ یہ ہے کہ تمہیں قصاص دینا ہوگا کہ تیری بہن نے ان کی بہن کا دانت توڑا ہے لہذا تمہاری بہن کا دانت توڑنا پڑے گا، آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت، حضرت انس کہنے لگے حضور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری بہن کا دانت کبھی بھی نہیں توڑا جائے گا۔[1]

حالانکہ جب اللہ سبحانہ تعالیٰ کا رسول کوئی فیصلہ سنا دے اور کوئی اس فیصلہ کے خلاف قسم کھا لے کہ یہ نہیں ہوگا، (تو صحابی رسول ﷺ نے یہ کیا کہہ دیا؟)

اور قرآن کریم کہتا ہے :

فلا وربك لا يومنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا
يجدوا في انفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما۔[2]

(تو (اے محبوب) آپ کے رب کی قسم وہ لوگ مسلمان نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ حاکم مانیں آپ کو ہر اس جھگڑے میں جو ان کے درمیان پیدا ہو پھر نہ پائیں وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی ہر اس فیصلے سے جو آپ نے کیا اور بخوشی دل سے مان لیں)

مذکورہ بالا حدیث یہ مشکلات حدیث میں سے ایک حدیث ہے، ایک مشہور محدث سے اس حدیث کے بارے میں گفتگو ہوئی اس نے مجھ سے اس حدیث کے بارے میں مطلب

---

[1] بخاری شریف، کتاب بدء الوحی، باب الصلح فی الدیت، حدیث ۲۷۰۳

[2] سورۃ النساء، آیت ۶۵

پوچھا تو میں نے بتایا کہ حضور ﷺ کا کوئی صحابی حضور ﷺ کے سامنے جس کا آئینہ قلب صاف ہو کہ اگر حضور ﷺ کے علم کی تجلی کا کوئی ذرہ وہاں چمک جائے تو وہ کمال اس صحابی کا نہیں، اس غلام کا نہیں بلکہ آقا ﷺ کا کمال ہے، حضور ﷺ اس وقت حاکم کے مقام پر تھے، حاکم کی حیثیت میں ہی فرمانا تھا کہ یاانس کتاب اللہ والقصاص، اور حاکم کا کام ہے کہ قانون کے مطابق فیصلے کی بات کرے مگر اگلی بات بھی حضور کو معلوم تھی کہ آگے کیا ہوگا؟

میرے آقا ﷺ کے علم کی تجلی حضرت انس کے سینے میں چمکی اس لئے انس کو معلوم ہوگیا تھا کہ مدعی قصاص نہیں لیں گے، دیت لیں گے، چنانچہ لڑکی کے ورثاء نے کہا ہم دیت پر راضی ہوتے ہیں، قصاص نہیں لینا چاہتے، انہوں نے قصاص معاف کر دیا، ان کو اجر حاصل ہوا اور حضرت انس کی قسم بھی پوری ہوگئی، کیوں؟ اس لئے کہ سرکار ﷺ کا فرمان ہے کہ میرے غلاموں میں اللہ سبحانہ تعالیٰ کے کچھ ایسے بندے موجود ہیں کہ اگر وہ اللہ سبحانہ تعالیٰ پر کوئی قسم کھالیں تو اللہ سبحانہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا فرماتا ہے، یہ کیا تھا؟ یہ میرے آقا ﷺ کے علم کی تجلی کا جلوہ حضرت انس کے سینے میں ظاہر ہوا، آپ ﷺ اپنے علم کے جلوے اپنے غلاموں کو عطا فرمانے والے ہیں، لہذا کمال ولایت کیا ہوا؟ کمالات ولایت، کمالات نبوت کی تجلی ہے تو اب اگر کوئی کمالات ولایت کو نہیں مانتا تو حضرت انس بن النضرؓ کی بات سے اس کا جواب سمجھے، کمالات ولایت ایک حقیقت ہے جس کا تعلق الہام سے ہے جو انس بن نضر کو ہوا، وہ الہام کیا تھا؟ وہ علم نبوی کی تجلی کا ظہور تھا، اگر کمالات ولایت نہ ہوتی تو انس بن نضر یہ قسم کیسے کھاتے؟ حضور ﷺ فرماتے ہیں: یاانس کتاب اللہ والقصاص اور انس کہتے ہیں خدا کی قسم میری بہن کا دانت نہیں توڑا جائے گا، تو نبی اور ولی کی بات میں بالمشافہ کیسے تضاد ہو سکتا ہے؟ وہ نبی کا معجزہ ہے اور یہ ولی کی کرامت ہے، لہذا نبی کے معجزہ پر بھی ہمارا ایمان ہے اور ولی کی کرامت پر بھی ہمارا ایمان ہے۔

''امام طیبی شارح مشکوٰۃ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت انس بن نضر کے "لا واللہ" کہنے سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا رد نہ تھا بلکہ وقوع کی نفی مراد تھی، اللہ کی قسم دانت نہیں توڑا جائے گا سے عدم وقوع کی اطلاع دی، چونکہ انہیں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل تھا، انہیں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پختہ یقین حاصل تھا کہ وہ قسم میں حانث نہیں ہونگے، اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا فرمائیں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ورثاء کے دل میں عفو و درگزر کے جذبات پیدا فرما دیئے''۔[1]

---

1. عمدۃ القاری شرح بخاری، کتاب الصلح، باب الصلح فی الدیت، مطبوعہ دار الفکر بیروت، جز ۱۳، ص ۲۸۱
مرقاۃ شرح مشکوٰۃ، کتاب القصاص، حدیث ۳۴۶۰
فتح الباری شرح صحیح بخاری: کتاب الدیات، باب السن بالسن، مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت، ص ۲۲۴
تقریر علامہ کاظمی: "توحید و رسالت"، ماہنامہ السعید ملتان، شمارہ فروری ۲۰۱۸ء

سلسلة الذهب

سندِ حدیث غزالی زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی علیہ الرحمہ
تا
امام محمد بن اسماعیل البخاری علیہ الرحمۃ الباری

مرتبہ: خلیل احمد رانا

غزالی زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ جن دنوں جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں شیخ الحدیث کے عہدہ پر فائز تھے تو مخالفین نے اعتراض کیا کہ ان کی تو سند حدیث ہی منقطع ہے، کیونکہ حضرت شاہ احمد سعید مجددی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت نہیں ہے، شاہ احمد سعید مجددی علیہ الرحمہ کو تو اپنے والد ماجد شاہ ابوسعید دہلوی علیہ الرحمہ سے سمع ہے اور ان کو شاہ عبد العزیز دہلوی علیہ الرحمہ سے، تم شاہ احمد سعید مجددی علیہ الرحمہ کی اجازت بلاواسطہ شاہ عبد العزیز دہلوی علیہ الرحمہ سے ملاتے ہو۔ تو علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے مخالفین کے سامنے مولوی عبد الحی حسنی ندوی (متوفی ۱۳۴۱ھ) کی کتاب ''نزہۃ الخواطر'' (عربی)، مطبوعہ دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن (بھارت)، جلد ۷، ص ۱۴۱ کی یہ عبارت پیش کی:

''وحصلت له الاجازة من الشيخ عبدالعزيز المذكور الصحاح الست والحصن الحصين ودلائل الخيرات والقول الجميل وغيرها'' [ل]

یعنی حضرت شاہ احمد سعید مجددی دہلوی علیہ الرحمہ کو حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ سے صحاح ستہ، حصن حصین، دلائل الخیرات اور القول الجمیل وغیرہ کی اجازت حاصل

ل نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر مطبوعہ دار ابن حزم، بیروت، لبنان ۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء، ص ۹۰۶

ہے۔ مخالفین یہ عبارت دیکھتے ہی مبہوت ہو کر لاجواب ہو گئے۔ حضرت غزالئی زماں کی سند حدیث کئی اور واسطوں سے بھی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتی ہے۔

غزالی زماں ضیغم اسلام علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہٗ

علامہ سید احمد سعید کاظمی بن مولانا سید مختار احمد کاظمی علیہم الرحمہ ۱۹۱۳ء میں امروہہ (یوپی، بھارت) میں پیدا ہوئے، آپ کی تعلیم آپ کے بڑے بھائی اور آپ کے شیخ طریقت علامہ سید محمد خلیل کاظمی محدث امروہوی رحمۃ اللہ علیہ کے زیر نگرانی مکمل ہوئی، جو ایک جید عالم دین اور صاحب نظر درویش تھے، سترہ سال کی عمر میں علوم دینیہ سے فارغ ہو کر لاہور کی قدیمی درس گاہ جامعہ نعمانیہ میں تدریس کا آغاز فرمایا، ۱۹۳۱ء میں واپس امروہہ تشریف لے گئے اور چار سال تک مدرسہ محمدیہ حنفیہ امروہہ میں درس دیا، یہاں سے تھوڑا عرصہ کے لئے اوکاڑہ (پنجاب) تشریف لائے، ۱۹۳۵ء میں ملتان تشریف لائے، مسجد حافظ فتح شیر خاں بیرون لوہاری دروازہ اور مسجد حضرت چپ شاہ میں اٹھارہ سال تک قرآن وحدیث کا درس دیا، ۱۹۴۴ء میں کچہری روڈ پر مدرسہ عربیہ انوار العلوم کی بنیاد رکھی، آپ عظیم محقق، مفسر، محدث، فقیہ اور علم کے بحر ذخار تھے، ہزاروں طلبہ آپ کے چشمہ فیض سے سیراب ہوئے، ۱۹۶۳ء تا ۱۹۷۴ء اسلامی یونیورسٹی بہاول پور میں شیخ الحدیث کے عہدہ جلیلہ پر فائز رہے، پھر ملتان تشریف لے آئے۔ آپ اسلامی مشاورتی کونسل (پاکستان) کے ممبر بھی رہے اور ہر دور میں اسلامی قوانین کے نفاذ اور قوانین کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے پاکستان کی حکومتیں آپ کی فقیہانہ آراء سے مستفید ہوتی رہیں۔ ۲۵ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ / ۴ جون ۱۹۸۶ء کو ملتان میں وصال ہوا۔[۱]

۱۔ ماہنامہ السعید ملتان، متفرق شمارے

استاذ العلماء علامہ سید محمد خلیل کاظمی محدث امروہوی قدس سرہٗ

علامہ سید محمد خلیل کاظمی رحمۃ اللہ علیہ بن مولانا سید مختار احمد کاظمی علیہم الرحمہ یکم شوال ۱۳۱۳ھ/ ۱۶ر مارچ ۱۸۹۶ء کو صبح صادق کے وقت امروہہ ضلع مراد آباد (یو پی، بھارت) میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے پائی شرح جامی تک پڑھ کر مدرسہ عالیہ رام پور میں داخلہ لیا اور جلیل القدر اساتذہ سے تمام علوم وفنون میں تعلیم مکمل کی، تکمیل کے آخری سال میں حفظ قرآن کا شوق ہوا اور اڑھائی تین ماہ میں قرآن مجید حفظ کر لیا، تکمیل علوم کے بعد چونڈیرہ ضلع بلند شہر، شاہ جہانپور اور امروہہ میں کئی سال تدریس فرمائی، پاک وہند اور دیگر ممالک اسلامیہ میں آپ کے شاگرد ہزاروں کی تعداد میں ہیں علوم طریقت، تصوف اور سلوک میں آپ کا بلند مقام تھا، آپ کی غالب نسبت سلسلہ چشتیہ صابریہ میں تھی، شاعری میں خاکی تخلص فرماتے تھے، آپ کا وصال بحالت روزہ ۲۷ر رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ/ ۲۸ر نومبر ۱۹۷۰ء بروز ہفتہ صبح چھ بجے ہوا، مزار مبارک امروہہ ضلع مراد آباد (یو پی، بھارت) میں ہے۔[1]

شمس المحدثین مولانا ریاست علی خاں شاہ جہان پوری قدس سرہٗ

حضرت مولانا ریاست علی خاں حنفی بن مطیع اللہ خاں علیہم الرحمہ محلہ خلیل غربی، شاہ جہان پور (یو پی، بھارت) میں پیدا ہوئے، ابتدائی کتابیں اپنے شہر کے علماء سے پڑھیں پھر رام پور جا کر مولانا ارشاد حسین عمری رام پوری رحمۃ اللہ علیہ سے اکتساب علم کیا اور سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں انہیں سے بیعت ہوئے، تحصیل علم کے بعد شاہ جہانپور آ کر اپنے مکان پر ہی تدریس شروع فرمائی، آپ معقول ومنقول پڑھانے والے اکابر علماء میں سے تھے، زمانہ ترک

---

[1] ماہنامہ السعید ملتان، شمارہ فروری ۱۹۶۲ء
پیش لفظ دیوان نور وحکمت، سید مرغوب امین کاظمی، مطبوعہ امروہہ ۱۹۸۹ء

موالات ۱۹۲۰ء میں مسئلہ خلافت پر آپ نے فرض منصبی کو نہایت دلیری اور ہمت سے انجام دیا، شاہ جہاں پور میں آپ کا سلسلہ بیعت کافی وسیع تھا، آپ نہایت ہی نیک طبیعت، سادہ مزاج، بے تکلف، پابند شریعت بزرگ تھے۔ [1]

امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی قدس سرہ کی بلا سود بینکاری پر مشہور کتاب "کفل الفقیہ الفاھم فی احکام قرطاس الدراھم" کی تائید میں آپ کا فتویٰ کتاب کے آخر میں شائع ہے۔ [2]

آپ کا ایک فتویٰ ندا، "یا شیخ عبد القادر جیلانی شیأ للہ" کے جواز میں انجمن نعمانیہ ہند لاہور نے ۱۹۳۶ء میں مطبع خادم التعلیم لاہور سے شائع کیا۔ [3]

حضرت شاہ ابوالحسن زید فاروقی دہلوی اپنے والد ماجد حضرت شاہ ابو الخیر دہلوی علیہ الرحمہ کی سوانح حیات میں لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ حضرت شاہ ابو الخیر عبد اللہ محی الدین فاروقی نقشبندی مجددی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۳ء) سجادہ نشین خانقاہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ، خانقاہ میں تشریف فرما تھے، مولانا سیف الرحمن صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی، مولانا مشتاق احمد انبیٹھوی اور چند دوسرے علماء اور اہل حلقہ بیٹھے تھے کہ شاہ جہان پور کے مولانا ریاست علی خاں تشریف لائے، یہ مولانا ارشاد حسین رامپوری کے شاگرد و مرید تھے، انہوں نے التحیات میں آنحضرت ﷺ کے تصور مبارک کے متعلق "صراط مستقیم" (از اسماعیل دہلوی) کی گندی عبارت کا ترجمہ آپ کو روتے ہوئے سنایا اور کہا حضرت! یہ لوگ ایسی عبارتیں لکھ رہے ہیں، آپ کو نہایت ملال ہوا اور آیت "ان الذین یؤذون اللہ

---

[1] محمد تبیح الدین، تاریخ شاہ جہان پور مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۳۲ء، ص ۱۸۹

[2] کفل الفقیہ الفاھم، مطبوعہ نوری بک ڈپو ص ۱۲۱

[3] مولانا محمد حسن بجنوری فتویٰ جواز یا شیخ عبد القادر جیلانی شیأ للہ، مطبوعہ انجمن نعمانیہ ہند لاہور، ص ۳۸

ورسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا والآخرۃ" پڑھ کر فرمایا ایسے افراد پر لعنت ہے اور انتہائے رنج والم کی وجہ سے آپ اٹھ کر حرم سرا میں چلے گئے"۔ [۱]

آپ کی تصانیف میں "زلالین شرح جلالین" اور "لباب التنزیل فی حل المشکلات القرآن"، التحقیقات لدفع التحریفات (رد المھند) مشہور ہیں، "زلالین شرح جلالین" مطبوعہ بمبئی کا ایک نسخہ علامہ سید احمد سعید کاظمی علیہ الرحمہ (ملتان) کے کتب خانہ میں موجود ہے، ۲۰۱۶ء میں راقم الحروف (خلیل احمد رانا) دعوت اسلامی کے مرکز فیضان مدینہ کراچی گیا، وہاں شعبہ علمیہ کا دورہ کیا تو ایک جگہ دیکھا کہ حاشیہ جلالین لکھنے پر کام ہو رہا ہے، وہاں حاشیہ درسی جلالین پر کام کرنے والے دعوت اسلامی کے ایک نوجوان نے بتایا کہ حاشیہ لکھنے کے سلسلہ میں ہمیں مولانا ریاست علی خاں شاہ جہان پوری علیہ الرحمہ کے حاشیہ کی ضرورت پڑی تو ہمیں بابائے اردو مولوی عبدالحق لائبریری کراچی سے یہ نسخہ ملا، جب ہم نے دیوبندی مکتبہ کے مطبوعہ نسخہ کو دیکھا تو وہ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ وہی حاشیہ ہے جو مولانا ریاست علی شاہ جہاں پوری علیہ الرحمہ کا ہے لیکن انہوں نے مولانا کا نام نہیں لکھا۔

مولانا ریاست علی خاں شاہ جہان پوری رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۴۹ھ/ ۱۶ ستمبر ۱۹۳۰ء کو بعارضہ ہیضہ وصال فرمایا اور اپنے مدرسہ بحر العلوم جو آپ کے مکان کے قریب مسجد محلہ خلیل شاہ جہان پور میں ہے، دفن ہوئے، اللہ کریم جل مجدہ آپ کے مزار اقدس پر رحمتیں فرمائے، آمین [۲]

---

[۱] شاہ ابوالحسن زید فاروقی، مقامات خیر، مطبوعہ دہلی ۱۹۷۲ء، ص ۵۰۶

[۲] نزھۃ الخواطر، عبدالحی لکھنوی ندوی، جلد ۸، مطبوعہ کراچی ۱۹۷۶ء، ص ۱۵۳

حافظ عبدالستار قادری، مرآۃ التصانیف، مطبوعہ لاہور ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء، ص ۲۳

ماہنامہ السواد الاعظم، مراد آباد (یوپی، بھارت) شمارہ محرم ۱۳۵۰ھ، ص ۱۰

نبراس الفقہاء مولانا ارشاد حسین فاروقی مجددی رامپوری قدس سرہٗ

مولانا ارشاد حسین بن مولانا حکیم احمد حسین بن غلام محی الدین بن فیض احمد بن شاہ کمال الدین بن شیخ درویش احمد بن شیخ زین العابدین معروف بہ شاہ فقیر اللہ بن شیخ فیاض الدین بن یوسف بن شاہ محمد یحییٰ بن مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی رحمہم اللہ تعالیٰ، ۱۴ر صفر ۱۲۴۸ھ کو رام پور (یوپی، بھارت) میں پیدا ہوئے، کتب فارسی اپنے والد ماجد اور شیخ احمد علی اور اپنے بھائی مولوی امداد حسین سے پڑھیں، صرف ونحو کی تعلیم حافظ غلام نبی، مولوی جلال الدین اور مولوی نصیر الدین خاں سے حاصل کی، یہ تینوں حضرات مشہور زمانہ اور اپنے کمالات میں یگانہ تھے، لکھنؤ جاکر منقول کی کتابیں پڑھیں، پھر رام پور واپس آکر علامہ دوراں ملا محمد نواب بن سعد اللہ افغانی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء) سے باقی کتب معقول کا درس لیا، مولانا محمد نواب مکی علیہ الرحمہ کی ہدایت پر دہلی جاکر حضرت شاہ احمد سعید مجددی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے، آپ حضرت شاہ احمد سعید مجددی کے اجل خلفاء میں سے تھے، آپ نے اپنے شیخ کی خدمت میں رہ کر تصوف، حدیث وتفسیر کی کتابیں بھی پڑھیں، حضرت شاہ احمد سعید دہلوی علیہ الرحمہ آپ کے حال پر بہت عنایت فرماتے تھے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانہ میں جب حضرت شاہ احمد سعید مجددی علیہ الرحمہ حرمین شریفین کو ہجرت کے لئے روانہ ہوئے تو آپ کو پانی پت سے رام پور رخصت کیا، کچھ دنوں بعد آپ ایک خادم خاص محمد موسیٰ بخاری کو ساتھ لے کر زیارت حرمین شریفین کو روانہ ہوئے، یہ سفر آٹھ مہینوں میں پیدل طے کیا، ایک سال تک مدینہ منورہ میں حضرت شاہ احمد سعید مجددی دہلوی کی خدمت میں رہے، پھر رام پور واپس تشریف لائے اور حضرت عبد الکریم رامپوری المعروف ملا اخوند فقیر قادری قدس سرہ (متوفی ۱۲۰۶ھ) کی مسجد کے حجرہ میں قیام کیا، یہیں نو ماہ میں قرآن مجید حفظ کیا، بعد میں ایک بیوہ سے نکاح فرمایا، توکل پر گذارہ ہوتا تھا، ہر جمعہ کو

اپنی مسجد میں وعظ فرماتے، ذوق وشوق اور گریہ وبکاہ سے مجلس نمونہ حشر معلوم ہوا کرتی تھی، اوراد ووظائف، حلقۂ ذکر اور درس وتدریس سے آپ کے اوقات معمور تھے۔ [1]

سفید عمامہ سر پر باندھتے تھے، لباس سنت کے موافق پہنتے تھے، تسبیح وعصا ہاتھ میں رکھتے تھے، گفتار زم وشریں اور کلام محبت بڑھانے والا ہوتا تھا، تمام اہل شہر آپ کے گرویدہ تھے، جب ایک تہائی شب رہ جاتی تو نماز تہجد ادا فرماتے، پھر ادعیہ ماثورہ سے فراغت کے بعد صبح تک تلاوت کلام مجید میں مشغول رہتے، پھر سنت فجر ادا کر کے بائیں پہلو پر قدرے آرام فرماتے، پھر فجر کے فرض طویل قرآت کے ساتھ مسجد میں باجماعت ادا فرماتے، پھر اشراق تک تسبیح خانہ میں اوراد وظائف میں مشغول رہتے۔

صبح کو بعد نماز اشراق اور شام کو بعد نماز مغرب ختم حضرت امام ربانی اور ختم حضرات خواجگان کے بعد حلقہ فرماتے، صبح کو حلقہ سے فارغ ہو کر دو پہر تک درس وتدریس میں مشغول رہتے، نماز عصر کے بعد مثنوی مولانا روم اور مکتوبات امام ربانی کا درس دیتے، ہفتہ میں دو دن منگل وجمعرات فتاویٰ کی تحریر کے لئے مقرر تھے۔

جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ تا نماز عصر قرآن مجید کی تفسیر بیان فرماتے، انداز بیان بڑا مؤثر ہوتا تھا، ایک مرتبہ مولوی محمد قاسم نانوتوی (دیوبند)، رامپور آئے اور حضرت سے ملاقات کے لئے بعد نماز جمعہ مسجد میں پہنچے، اس وقت تفسیر ہو رہی تھی، حضرت کی عادت شریفہ تھی کہ اثنائے بیان میں آنکھیں بند رکھتے تھے، مسجد سامعین سے بھری ہوئی تھی، مولوی قاسم نانوتوی ایک طرف بیٹھ گئے، جب اُٹھ کر گئے تو یہ کہتے ہوئے گئے کہ "بیان اس کو کہتے ہیں اور تفسیر ایسی ہوتی ہے"۔

---

[1] تذکرہ کاملان رامپور، حافظ احمد علی شوق، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۸۶ء، ص ۳۰، ۳۱

تذکرۃ المشائخ، مولانا حامد علی خاں رامپوری ثم ملتانی، مطبوعہ ملتان ۱۹۶۸ء، ص ۱۱۹ تا ۱۲۲

مقامات ارشادیہ، مقصود احمد عمری، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۹ء، ص ۳۰۶ تا ۳۱۲

آپ کے مشہور تلامذہ میں مولانا عنایت اللہ خاں رام پوری (متوفی ۱۳۴۵ھ)، مولانا ریاست علی خاں شاہجہانپوری (متوفی ۱۳۴۹ھ)، مولانا عبدالغفار خاں رام پوری (متوفی ۱۳۴۸ھ)، مولانا ظہور الحسین رامپوری (۱۳۴۲ھ)، مولانا شاہ سلامت اللہ رام پوری (متوفی ۱۳۳۸ھ)، مولانا سید دیدار علی شاہ الوری (متوفی ۱۳۵۴ھ) اور شبلی نعمانی اعظم گڑھی (متوفی ۱۳۳۲ھ) مشہور ہیں۔

آپ ہم عقیدہ مسلمانوں پر غایت شفقت فرماتے اور باطل پرستوں سے شدید نفرت برتتے تھے، مولوی نذیر حسین دہلوی غیر مقلد کی کتاب "معیار الحق" کا جواب "انتصار الحق" کے نام سے لکھا، جس میں دلائل عقلیہ ونقلیہ سے تقلید شخصی کا وجوب وثبوت ثابت کیا۔ [۱]

فتاویٰ ارشادیہ بھی آپ کی عظیم تالیف ہے، مولانا محمد اول جونپوری (متوفی ۱۳۳۹ھ) "فتاویٰ ارشادیہ کے متعلق لکھتے ہیں:

"مصنف اس کے حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب رامپوری متوفی ۱۳۱۱ھ ہیں، یہ فتاویٰ ہنوز چھپا نہیں، کئی جلدوں میں ہے، مگر راقم الحروف نے اس کی ایک جلد کلاں بخدمت محب الفقراء والمساکین الداعی الی السبیل مولاہ مولانا محمد سلامت اللہ اعظم گڑھی متوطن رامپوری دیکھی ہے"۔ [۲]

اس کے علاوہ "ارشاد الصرف" علم صرف میں (یہ مولانا عنایت اللہ خاں رامپوری کے لئے لکھی گئی)۔ [۳]

---

[۱] محمود احمد قادری، تذکرہ علمائے اہل سنت، مطبوعہ مظفر پور (بہار، انڈیا) ۱۳۹۱ھ، ص ۲۳
مولانا حامد علی خاں رامپوری ثم ملتانی، تذکرۃ المشائخ، مطبوعہ ملتان ۱۹۶۸ء، ص ۱۲۴، ۱۲۵
مقصود احمد عمری، مقامات ارشادیہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۹ء، ص ۳۱۴، ۳۱۶

[۲] محمد اول جونپوری، مفید المفتی، مطبوعہ لاہور ۱۴۰۱ھ، ص ۲۶۲

[۳] مولانا حامد علی خاں رامپوری ثم ملتانی، تذکرۃ المشائخ، مطبوعہ ملتان ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۷

انوار ساطعہ فی جواز مولود و فاتحہ بھی آپ کی تصنیف ہے۔ [۱]

ترجمہ کتاب الحیل عالمگیری اُردو قلمی ۱۳۶ صفحات کی کتاب کتب خانہ ریاست رامپور میں ہے۔ [۲]

آپ کی اولاد میں آپ کے بعد چار بیٹے اور دو بیٹیاں زندہ رہیں، بڑے صاحبزادے مولانا احسان حسین (متوفی ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء)، دوسرے صاحبزادے میاں رضوان حسین (دس برس کی عمر میں انتقال کیا)، تیسرے صاحبزادے مولانا معوان حسین رامپوری (متوفی ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۳ء)، آپ کچھ عرصہ بادشاہی مسجد لاہور کے خطیب بھی رہے، چوتھے صاحبزادے مولانا ریحان حسین (متوفی ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء)۔

۸/ جمادی الآخر ۱۳۱۱ھ کو تپ محرقہ ہوا، اسی حالت میں تمام امانتیں واپس کیں، شدت تپ میں اوقات نماز میں فرق نہ ہوا، دوشنبہ کے دن ۱۵/ جمادی الآخر ۱۳۱۱ھ کو وصال فرمایا تمام شہر نماز جنازہ میں اُمڈ آیا، عیدگاہ کے میدان میں نماز ہوئی اور اپنی مسجد کے متصل جانب شرق اپنی ملکیت کی زمین میں دفن ہوئے۔ [۳]

شیخ المشائخ حضرت شاہ احمد سعید مجددی دہلوی مہاجر مدنی قدس سرہٗ

حضرت ابو المکارم شاہ احمد سعید بن شاہ ابو سعید بن شیخ صفی القدر بن شیخ عزیز القدر بن شیخ محمد عیسیٰ بن شیخ سیف الدین بن خواجہ محمد معصوم بن امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہم۔ [۴]

یکم ربیع الآخر ۱۲۱۷ھ/ ۳۱/ جولائی ۱۸۰۲ء کو ریاست رام پور میں پیدا ہوئے، ''مظہر

---

[۱] ارشاد احمد عارف، ضمیمہ مفید المفتی، مطبوعہ لاہور ۱۳۰۱ھ، ص ۲۷۵

[۲] حافظ احمد علی شوق، تذکرہ کاملان رامپور، مطبوعہ پٹنہ (بھارت) ۱۹۸۶ء، ص ۳۳

[۳] حافظ احمد علی شوق، تذکرہ کاملان رامپور، مطبوعہ پٹنہ (بھارت) ۱۹۸۶ء، ص ۳۲، ۳۳

[۴] شاہ محمد مظہر مجددی مہاجر مدنی، رشحات عنبریہ، تحقیق و تعلیق محمد اقبال مجددی، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۹ء، ص ۱۸

یزدال" تاریخی نام ہے، آپ کے نانا حضرت شاہ غلام صدیق نے جو نہایت عالم اور بزرگ صاحب باطن تھے، آپ کا مشرب باطنی از روئے طریقہ درویشی جان کر غلام غوث نام رکھا، کیونکہ رشد و ہدایت کے آثار خورد سالی سے آپ میں ظاہر تھے، بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا، جس زمانہ میں آپ قرآن مجید حفظ کر رہے تھے، اپنے والد ماجد حضرت شاہ ابوسعید دہلوی علیہ الرحمہ (متوفی ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵ء) کے ساتھ حضرت شاہ درگاہی مجذوب رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء) کے پاس جایا کرتے تھے، وہ آپ کو محبت سے اپنے پاس بٹھاتے اور قرآن مجید سنتے، جب آپ کی عمر دس سال کی تھی تو آپ کے والد ماجد حضرت شاہ ابوسعید دہلوی نے آپ کو حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۴۰ھ) سے بیعت کرا دیا، حضرت شاہ صاحب آپ پر نہایت مہربان تھے، حضرت شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں نے لوگوں سے ایک بچہ طلب کیا کسی نے نہیں دیا، ابوسعید نے میری طلب پوری کر دی اور اپنا بیٹا مجھے دے دیا۔[۱]

حضرت شاہ احمد سعید علیہ الرحمہ نے حضرت شاہ غلام علی دہلوی قدس سرہ سے کتب تصوف رسالہ قشیریہ، عوارف المعارف، احیاء العلوم، نفحات الانس، رشحات، مکتوبات امام ربانی، مثنوی معنوی وغیرہ، اور حدیث میں مشکوٰۃ، ترمذی شریف پڑھیں، باقی کتب معقول و منقول علمائے دہلی مولانا فضل امام خیرآبادی (متوفی ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء)، مولانا رشید الدین خاں (متوفی ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء) شاہ رفیع الدین دھلوی (متوفی ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء)، شاہ عبدالقادر (متوفی ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۴ء) اور شاہ عبدالعزیز دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) وغیرہ سے پڑھیں، رام پور میں مفتی شرف الدین (متوفی ۱۲۶۸ھ) اور اپنے والد ماجد کے خالو مولانا سراج احمد (متوفی ۱۲۳۰ھ) بن حضرت محمد مرشد بن محمد ارشد بن حضرت فرخ شاہ بن حضرت محمد سعید بن حضرت مجدد الف ثانی علیہم الرحمہ سے بھی کتابیں پڑھیں، لکھنؤ میں مولانا محمد

---

[۱] شاہ ابوالحسن زید فاروقی، مقامات خیر، مطبوعہ دہلی ۱۹۷۲ء، ص ۸۲، ۸۳، ۸۴

اشرف اور مولانا نور صاحب سے بھی پڑھا۔ بیس سال کی عمر میں دستار فضیلت بندھی، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ سے حدیث کی اجازت لی، آپ کی سند حدیث "مناقب احمدیہ و مقامات سعیدیہ" میں موجود ہے۔[۱]

سرسید احمد خاں علی گڑھی لکھتے ہیں :

"علم حدیث وفقہ تفسیر بدرجہ کمال حاصل تھا، دن رات مشغلہ تدریس جاری رہتا تھا۔ مسائل دینی آپ کے فیض سے حل ہوتے تھے اور فتویٰ شرع شریف آپ کی مہر سے مسجل کیے جاتے تھے"۔[۲]

مولوی عبدالحی حسنی ندوی لکھتے ہیں :

"وحصلت له الاجازة من الشيخ عبدالعزيز المذكور الصحاح الست والحصن الحصين ودلائل الخيرات والقول الجميل وغيرها"۔[۳]

سلوک کی اجازت سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں شاہ غلام علی دہلوی اور والد ماجد شاہ ابوسعید دہلوی سے ملی، اور شاہ صاحب نے ہی آپ کو خلافت عطا کی، چونکہ آپ نے جمیع مقامات میں اپنے والد بزرگوار سے توجہات لیں، اسلئے شجرہ میں آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی بھی لیا جاتا ہے۔

حضرت شاہ غلام علی دہلوی علیہ الرحمہ نے اپنے ایک رسالہ "کمالات مظہری" تالیف ۱۲۳۷ھ میں حضرت شاہ احمد سعید علیہ الرحمہ کے بارے میں لکھا ہے :

"حضرت احمد سعید فرزند حضرت ابوسعید بہ علم و عمل و حفظ قرآن مجید و احوال نسبت شریفہ قریب است بہ والد ماجد خود"۔

---

[۱] حافظ احمد علی شوق، تذکرہ کاملان رامپور، مطبوعہ خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ ۱۹۸۶ء، ص ۱۵

[۲] مقالات سرسید، مرتبہ مولوی اسماعیل پانی پتی، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء، ص ۲۲۶

[۳] عبدالحی حسنی ندوی، نزہۃ الخواطر، جلد ۷، مطبوعہ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن، ۱۹۵۹ء، ص ۴۱

۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۴ء میں آپ کے والد ماجد جب حج کے لئے روانہ ہوئے تو خانقاہ شریف آپ کے حوالے کی، جہاں آپ نے طالبانِ حق کو چوبیس سال سات ماہ تک فیض یاب کیا۔[1]

۱۲۴۹ھ/ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حجاز مقدس کی طرف ہجرت کی، ان انتہائی خراب حالات میں بھی آپ چار ماہ تک کامل استقامت کے ساتھ دہلی میں مقیم رہے، جب کوئی آپ سے ہجرت کے لئے کہتا تو آپ فرماتے کہ ہم اپنے مشائخ کرام کی اجازت کے بغیر شہر سے باہر نہیں جاسکتے۔ ان حالات میں آپ خود مع فرزندان و مریدین، سراج الدین محمد ابوظفر بادشاہ کے پاس تشریف لے گئے اور کتاب و سنت کے موافق بادشاہ کی فہمائش کی۔[2]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جن علماء نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا، اس فتوے کے اولین محرک اور دستخط کنندہ آپ ہی تھے۔[3]

آخر استخارہ مسنونہ کے بعد آپ ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۷ء میں مع اہل و عیال حرمین شریفین کی طرف ہجرت کے لئے روانہ ہوئے اور راستے میں بے شمار مصائب کے باوجود آپ اپنے خلیفہ نامدار حضرت خواجہ حاجی دوست محمد قندھاری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۸۴ھ/ ۱۸۶۷ء) کے پاس ان کی خانقاہ موسیٰ زئی شریف ضلع ڈیرہ اسماعیل خان تشریف لے گئے، حاجی صاحب نے نہایت تپاک سے خیر مقدم کیا، حضرت حاجی دوست محمد قندھاری علیہ الرحمہ نے

---

[1] شاہ ابوالحسن زید فاروقی، مقامات خیر، مطبوعہ دہلی ۱۹۷۲ء، ص ۸۴

[2] محمد اقبال مجددی، مقدمہ اثبات المولد والقیام، عربی (بحوالہ محمد معصوم شاہ، ذکر السعدین فی سیرۃ الوالدین، ص ۲۳) مطبوعہ لاہور ۱۹۷۹ء، ص ۳

[3] محمد اقبال مجددی، مقدمہ اثبات المولد والقیام، عربی ص ۵ بحوالہ عبداللطیف، روزنامچہ ۱۸۵۷ء، مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ کمال الدین حیدر، قیصر التواریخ، جلد ۲، ص ۳۵۔ غالب، خطوط۔ جلد ۲، ص ۵۴۔ محمد ایوب قادری، جنگ آزادی، ص ۲۰۷، ۲۰۸۔ عتیق صدیقی، اٹھارہ سو ستاون اخبار اور دستاویزیں، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۶ء، ص ۱۹۹

اپنے خلیفہ مولوی رحیم بخش علیہ الرحمہ (متوفی ۱۲۸۳ھ) کو اسی وقت حضرت شاہ احمد سعید رحمۃ اللہ علیہ کی موجودگی میں انہیں خانقاہ شریف دہلی جانے کا حکم دیا، وہ اسی وقت روانہ ہو گئے۔ [1]

موسیٰ زئی سے آپ بمبئی روانہ ہوئے، جہاں آپ کی تاریخ ورود ۲۳/مارچ ۱۸۵۸ء ہے، وہاں سے بحری جہاز میں سوار ہو کر حجاز کا قصد کیا۔ [2]

جہاز آخر شوال میں جدہ پہنچا، آپ نے ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء کا حج ادا کیا، یہاں کثرت سے لوگ داخل طریقہ ہوئے، چار مہینے مکہ معظمہ میں قیام فرما کر ربیع الاول ۱۲۷۵ھ میں اپنے فرزندوں اور درویشوں کے ساتھ مدینہ منورہ روانہ ہوئے، اہل مدینہ بھی نہایت تعظیم وتکریم سے پیش آئے، خالد پاشا محافظ مدینہ منورہ حلقہ ارادت میں داخل ہوئے، اور ایک مکان کرایہ پر لے کر اس کی کنجی حضرت کے پاس بھیج دی، یہ مکان محلہ مناخہ میں متصل مسجد حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ تھا، مدینہ منورہ کے قیام میں زیادہ حصہ مسجد نبوی میں گزرتا تھا، بہت سے لوگ مرید ہوئے۔ [3]

حضرت شاہ احمد سعید مجددی رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاق اور اوصاف حمیدہ کے باب میں تحریر ہے کہ آپ کسی کو بُرے الفاظ سے یاد نہیں کرتے تھے لیکن وہابیہ کی قباحت اور ان کے اقوال وافعال کے فریب سے آگاہ فرماتے رہتے تھے، آپ کے صاحبزادے حضرت شاہ محمد مظہر مجددی مدنی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ولم یذکر احدا بالسوء الفرقة الوهابية لتحذير الناس من قباحة افعالهم واقوالهم'' [4]

---

[1] شاہ ابوالحسن زید فاروقی، مقامات خیر، مطبوعہ دہلی ۱۹۷۲ء، ص ۸۹، ۹۰

[2] شیخ محمد اکرام، رود کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۸۷ء، ص ۶۶۳

[3] حافظ احمد علی شوق، تذکرہ کاملان رامپور، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۸۶ء، ص ۱۸

[4] المناقب الاحمدیہ والمقامات السعیدیہ، مطبوعہ قزان ۱۸۹۶ء، ص ۱۷۶

(حضرت شاہ احمد سعید قدس سرہ کسی کی برائی نہیں کرتے تھے سوائے وھابیہ کے گمراہ فرقہ کے تاکہ لوگوں کو ان کے افعال واقوال کی قباحت سے ڈرائیں)

اسی صفحہ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

وکان قدس سرہ یقول ادنیٰ ضرر صحبتھم ان محبۃ النبي صلی اللہ علیہ وسلم التي ھي من اعظم ارکان الایمان تنقص ساعۃ فساعۃ لا یبقي منھا غیر الاسم والرسم فکیف یکون اعلاہ فالحذر الحذر عن صحبتھم ثم الحذر الحذر عن رؤیتھم فاحفظہ''۔[۱]

(حضرت فرمایا کرتے تھے کہ وھابیوں کی صحبت کا معمولی نقصان یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت جو ایمان کے بڑے ارکان میں سے ہے لحظہ بہ لحظہ کم ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ نام ونشان کے علاوہ کچھ بھی نہیں رہ جاتا، جب معمولی ضرر کا یہ حال ہے تو بڑے نقصان کا کیا عالم ہوگا، لہذا ان کی صحبت سے بچو، ضرور بچو بلکہ ان کی صورت تک دیکھنے سے ضرور بالضرور اجتناب کرو۔)

آپ کی اولاد میں چار صاحبزادے حضرت عبدالرشید (متوفی ۱۲۸۷ھ)، حضرت عبدالحمید، حضرت محمد عمر (متوفی ۱۲۹۸ھ)، حضرت محمد مظہر (متوفی ۱۳۰۱ھ) رحمہم اللہ تعالیٰ اور ایک صاحبزادی روشن آرا تھیں، حضرت عبدالحمید اور صاحبزادی روشن آرا کا بچپن میں انتقال ہوا، باقی تینوں صاحبزادے بزرگوار خلیفہ اور صاحب ارشاد ہوئے۔

حافظ احمد علی شوق نے تذکرہ کاملان رامپور ص ۲۰،۱۹ پر آپ کے خلفاء کی تعداد تہتر لکھی ہے، جب کہ حضرت شاہ محمد مظہر علیہ الرحمہ نے مناقب احمدیہ میں اسی افراد کے نام لکھے ہیں، اور یہ بھی تحریر فرمایا کہ کہاں تک آپ کے خلفاء اور اصحاب اجازت کے نام لکھوں وہ

---

[۱] المناقب الاحمدیہ والمقامات السعیدیہ، مطبوعہ قزان، ۱۸۹۶ء، ص ۱۷۶

بہت ہیں۔

آپ کے شاگردوں میں مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا ارشاد حسین رام پوری، مولانا فیض الحسن سہارنپوری وغیرہ مشہور ہیں۔

۲ ربیع الاول ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء کو مدینہ منورہ میں وصال فرمایا اور حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ [۱]

آپ کی تصانیف کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ سعید البیان فی مولد سید الانس والجان (اردو)

۲۔ الذکر الشریف فی اثبات المولد المنیف (فارسی)

۳۔ الفوائد الضابطہ فی اثبات الرابطہ (فارسی)

۴۔ انہار اربعہ (فارسی)

۵۔ تحقیق الحق المبین فی اجوبۃ المسائل الاربعین (فارسی)

۶۔ اثبات المولد والقیام (عربی)

۷۔ مکتوبات، آپ کے تمام مکاتیب تاحال جمع نہیں کئے گئے، صرف ایک سو سینتیس مکاتیب آپ کے خلیفہ حضرت حاجی دوست محمد قندھاری علیہ الرحمہ نے جمع کئے، جنہیں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں (حیدرآباد، سندھ) نے تحفہ زواریہ کے نام سے ۱۳۷۳ھ میں کراچی سے شائع کیا۔

۸۔ فتاوی، آپ احیانا فتوی بھی دیتے تھے لیکن کسی نے انہیں جمع نہیں کیا۔ [۲]

---

[۱] تذکرہ کاملان رامپور، حافظ احمد علی شوق، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۸۶ء

محمد مظہر مجددی مدنی، مناقب احمدیہ ومناقب سعیدیہ، فارسی، مطبوعہ دہلی ۱۲۸۳ھ

[۲] محمد اقبال مجددی، مقدمہ اثبات المولد والقیام، عربی، مطبوعہ خانقاہ موسیٰ زئی شریف ۱۳۹۹ھ ص ۷۔۸

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی قدس سرہٗ

سراج الہند، حجۃ اللہ، آیۃ اللہ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہم اللہ، ۲۵ / رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے، سلسلہ نسب سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے،، پندرہ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد سے تمام علوم عقلیہ ونقلیہ سے فراغت حاصل کی اور کمالات ظاہری و باطنی بھی انہی سے حاصل کئے، بعض کتب حدیث شاہ محمد عاشق پھلتی اور خواجہ امین اللہ کشمیری سے پڑھیں، آپ کی ذات سے برصغیر پاک وہند میں علوم اسلامیہ خصوصاً تفسیر وحدیث کا بڑا چرچا ہوا۔

آپ کے شاگردوں میں مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی، مولانا مخصوص اللہ دہلوی، مولانا فضل حق خیر آبادی، شاہ ابو سعید دہلوی، شاہ احمد سعید مجددی دہلوی، مخدوم آل رسول مارہروی، شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی، شاہ رؤف احمد نقشبندی وغیرہ مشہور ہیں۔

۷ / شوال ۱۲۳۹ھ کو دہلی میں وصال فرمایا، ترکمان دروازہ کے باہر قبرستان مہندیاں میں اپنے والد ماجد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ [۱]

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ

حضرت شاہ ولی اللہ بن شاہ عبد الرحیم عمری دہلوی، ۴ / شوال ۱۱۱۴ھ کو قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر (یوپی،، بھارت) میں پیدا ہوئے، سات سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کیا اور پندرہ سال کی عمر میں جملہ علوم متداولہ اور فنون متعارفہ سے فراغت حاصل ہوئی، سترھویں سال آپ کے والد ماجد کا انتقال ہوا، والد ماجد کی وفات کے بعد تقریباً بارہ سال تدریس وتعلیم میں مشغول رہے، ۱۱۴۳ھ میں حرمین شریفین حاضر ہوئے، وہاں ایک سال قیام فرما کر شیخ ابو طاہر مدنی وغیرہ مشائخ سے حدیث کی روایت کی اور وہاں کے علماء وفضلاء کی صحبت سے

[۱] احوال وآثار شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، خلیل احمد رانا، مطبوعہ ادارہ معارف نعمانیہ لاہور ۱۴۱۸ھ

مستفیض ہوئے، ۱۱۴۵ھ میں دوسرا حج ادا کرکے واپس دہلی آئے، آپ کی تصانیف مشہور ہیں، بعض لوگوں نے جعلی تصانیف بھی آپ کی طرف منسوب کر دیں، مثلاً "قرۃ العین فی ابطال شہادت الحسین، جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ، بلاغ المبین، تحفۃ الموا حدین، اشارہ مستمرہ، اور قول سدید۔ حال ہی میں آپ کے صحیح حالات وافکار پر مبنی کتاب "القول الجلی فی ذکر آثار الولی" (مخطوطہ) مؤلفہ شاہ محمد عاشق پھلتی، کاکوری ضلع لکھنو (بھارت) میں دستیاب ہوا ہے، شاہ محمد عاشق پھلتی علیہ الرحمہ، شاہ ولی اللہ کے قریبی عزیز اور شاگرد ہیں، اور یہ کتاب انہوں نے شاہ ولی اللہ کی حیات ہی میں لکھ کر ان سے تصدیق کروائی، اس کتاب کا ذکر پرانی کتابوں میں آتا رہا، لیکن دستیاب نہیں تھی، اب اس کتاب کے مخطوطے کا عکس ۱۹۸۹ء میں دہلی سے شائع ہوگیا ہے اور ۱۹۹۷ء میں کاکوری ضلع لکھنو سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوگیا ہے، پاکستان میں اس کا یہی اردو ترجمہ "مسلم کتابوی" دربار مارکیٹ لاہور سے شائع ہو چکا ہے، اس کتاب کے شائع ہونے سے حضرت شاہ ولی اللہ کے عقائد کو غلط طور پر متعارف کرانے والوں کا بھانڈا عین چوراہے میں پھوٹ گیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء میں دہلی میں انتقال فرمایا۔ [1]

شیخ ابو طاہر محدث گردی مدنی قدس سرہ

شیخ ابو طاہر جمال الدین محمد عبد السمیع بن ابراہیم الکردی المدنی الشافعی، ۲۱ر رجب ۱۰۸۱ھ کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے، اپنے والد ماجد اور دیگر ارباب کمال سے علوم عقلیہ ونقلیہ کی تحصیل کی نیز محدث محمد بن عبد الرسول برزنجی، حسن بن علی عجیمی، عبد اللہ بن سالم بصری وغیرہ سے حدیث کا سماع کیا، حرم نبوی شریف میں درس دیتے تھے۔ دُور دُور سے طلباء نے آکر اکتساب علم کیا، رمضان المبارک ۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۲ء میں مدینہ منورہ میں وصال فرمایا،

---

[1] شاہ ولی اللہ اور اُن کا خاندان، حکیم محمود احمد برکاتی، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۴ء
القول الجلی کی بازیافت، شاہ ابو الحسن زید فاروقی دہلوی، مطبوعہ لاہور ۱۹۹۱ء

بقیع میں دفن ہوئے۔[۱]

شیخ ابراہیم محدث کُردی قدس سرہٗ

شیخ العرفان برہان الدین ابراہیم بن حسن الشہر زوری الکردی الکورانی الشافعی ۱۰۲۵ھ میں پیدا ہوئے، والد بزرگوار کے علاوہ دیگر نامور علماء سے علوم دینیہ کی تحصیل کی پھر بغداد میں دو برس قیام کر کے اکابر علما، ومشائخ سے استفادہ کیا، پھر چار سال شام میں گزار کر مصر ہوتے ہوئے حرمین آئے، یہاں شیخ قشاشی سے فیض یاب ہوئے، اُنہوں نے آپ کو تمام مرویات کی اجازت دے کر خرقہ خلافت پہنایا اور اپنی دختر کا نکاح ان سے کر دیا، آپ حرم میں درس دیتے تھے، ۱۸ ربیع الاول ۱۱۰۱ھ کو وصال فرمایا اور بقیع میں دفن ہوئے۔[۲]

شیخ احمد محدث قشاشی مدنی قدس سرہٗ

شیخ صفی الدین احمد بن محمد البدری القشاشی المدنی المالکی ۹۹۱ھ میں پیدا ہوئے، تعلیم وتربیت والد ماجد شیخ محمد مدنی سے پائی، ۱۰۱۱ھ میں والد ماجد کے ساتھ یمن کا سفر کیا، وہاں مشائخ یمن سے استفادہ کیا، پھر مکہ معظمہ آگئے، ایک عرصہ تک یہیں مقیم رہے، پھر مدینہ منورہ آکر مشائخ مدینہ اور شیخ احمد بن علی شناوی کی صحبت اختیار کی، ان کے جانشین ہوئے، تمام عمر حرم نبوی میں حدیث کا درس دیتے رہے، ۱۰۷۱ھ/ ۱۶۶۱ء میں وصال ہوا اور جنت البقیع میں قبہ حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کے شرقی گوشہ میں دفن ہوئے۔[۳]

۱۔ سلک الدرر، ج ۲، ص ۷، ۲، انسان العین فی مشائخ الحرمین، مطبع احمدی دہلی ص ۱۳، ۱۴، الیانع الجنی فی اسانید شیخ عبد الغنی طبع دہلی ۱۳۴۹ھ ص ۲۰

۲۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین، الاقتباہ فی سلاسل اولیاء، سلک الدرر، ج ۱، ص ۵، ۶، الرحلۃ العیاشیہ، ج ۱، ص ۳۲۰، البدر الطالع، ج ۱، ص ۱۱، ۱۲، معجم المصنفین، ج ۳، ص ۱۰۴ تا ۱۰۷، ہدیۃ العارفین، ج ۱، ص ۳۵

۳۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین، الاقتباہ فی سلاسل اولیاء، الرحلۃ العیاشیہ، ج ۱، ص ۳۰۷ تا ۳۲۹، خلاصۃ الاثر، ج ۱، ص ۳۴۳ تا ۳۴۶، الفہرس الفہارس، ج ۲، ص ۳۲۰، ہدیۃ العارفین، ج ۱، ص ۱۶۱

شیخ احمد محدث الشناوی المصری قدس سرہ

شیخ ابو المواہب احمد بن علی الشناوی المصری المدنی الشہیر بالحنائی ۹۷۵ھ میں مصر کے مشہور محلہ روح میں پیدا ہوئے، علوم ظاہری کی تکمیل مصر کے مشہور محدث شیخ شمس الدین رملی اور دوسرے علماء سے کی، پھر مدینہ منورہ آکر طریقت کی تعلیم سید صبغۃ اللہ سندھی سے لی، ان ہی سے خرقہ خلافت ملا، ۸ رذی الحجہ ۱۰۲۸ھ کو مدینہ منورہ میں وصال ہوا اور بقیع میں دفن ہوئے۔[1]

شیخ محمد بن احمد محدث رملی قدس سرہ

شیخ شمس الدین محمد بن احمد الرملی المنوفی الانصاری الشافعی المصری، جمادی الاول ۹۱۹ھ میں منوفہ (مصر) میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں قرآن مجید حفظ کیا پھر تمام دینی تعلیم اپنے والد بزرگوار شیخ احمد رملی سے حاصل کی، حدیث کی سند شیخ الاسلام زکریا انصاری اور شیخ برہان الدین ابی شریف سے حاصل کی، تفسیر، حدیث، فقہ کا درس دیتے تھے، آپ کا شمار مجددین میں ہوتا ہے، ۱۳ رجمادی الاول ۱۰۰۴ھ کو مصر میں وصال ہوا۔[2]

شیخ الاسلام زکریا بن محمد انصاری محدث مصری قدس سرہ

شیخ الاسلام ابویحییٰ زین الدین زکریا محمد الانصاری الخزرجی السنیکی ثم القاہری الشافعی ۸۲۳ھ میں سنیکہ (مصر) میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اور حفظ قرآن یہیں مکمل کیا، پھر قاہرہ آئے اور جامعہ ازہر میں علوم اسلامیہ کی تکمیل کی، علامہ ابن حجر عسقلانی کے علاوہ سینکڑوں شیوخ سے استفادہ کیا اور افتاء، تدریس کی اجازت لی، آپ کی عمر سو سال سے زیادہ

---

[1] انسان العین فی مشائخ الحرمین، الانتباہ فی سلاسل اولیاء، خلاصۃ الاثر، ج ۱، ص ۲۴۳ تا ۲۴۶، ہدیۃ العارفین، ج ۱، ص ۱۵۴

[2] خلاصۃ الاثر، ج ۳، ص ۳۴۲ تا ۳۴۸، المجددون فی الاسلام، ص ۳۷۴ تا ۳۷۶، تاج العروس مادہ، رمل

تھی، بڑھاپے میں کھڑے ہو کر نفل ادا کرتے تھے، ۳؍ذی قعدہ ۹۲۶ھ کو وصال ہوا۔[1]

شیخ ابن حجر محدث عسقلانی قدس سرہ

شیخ ابوالفضل شہاب الدین احمد بن علی عسقلانی المعروف ابن حجر المصری القاہری الشافعی، شعبان ۷۷۳ھ میں پیدا ہوئے، بچپن میں والدین کا سایہ اٹھ گیا، یتیمی کی حالت میں پرورش پائی، پانچ برس کی عمر سے تعلیم کا آغاز کیا، نو برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا، پھر حج پر چلے گئے، وہاں تعلیم حاصل کی، شیخ زین الدین ابراہیم محدث تنوخی سے سند حدیث لی، اس کے علاوہ بہت سے شیوخ حدیث سے بھی اجازت ہے، جن میں مصر، شام، قطیہ، غزہ، رملہ اور قدس شریف کے شیوخ ہیں، پھر قاہرہ آگئے، آپ کی ذات جامع کمالات تھی، ۲۸؍ذی الحجہ ۸۵۲ھ کو وصال ہوا۔[2]

شیخ زین العابدین ابراہیم بن احمد محدث تنوخی قدس سرہ

شیخ ابوالاسحاق زین الدین ابراہیم بن احمد التنوخی البعلی ثم الشامی، ۷۰۹ھ میں پیدا ہوئے، دمشق میں تعلیم و تربیت پائی، علم فقہ مصر میں پڑھا، جن شیوخ سے روایت حدیث کی اجازت ہے ان کی تعداد چار سو ہے، علم حدیث میں بڑا کمال حاصل تھا، ۸۰۰ھ میں وصال ہوا۔[3]

---

[1] الکواکب السائرۃ، ج۱، ص۱۹۶ تا ۲۰۷، النور السافر، ص۱۳۰ تا ۱۳۵، شذرات الذہب، ج۸، ص۱۳۴ تا ۱۳۶، البدر الطالع، ج۲، ص۲۵۲، ۲۵۳، فہرس الفہارس، ج۱، ص۳۳۲، ۳۳۵، ہدیۃ العارفین، ج۱، ص۳۷۴

[2] شذرات الذہب، ج۷، ص۲۷۰، ۲۷۳، البدر الطالع، ج۱، ص۸۷ تا ۹۲، فہرس الفہارس، ج۱، ص۲۳۶ تا ۲۵۰، ہدیۃ العارفین، ج۱، ک۱۵۴، بستان المحدثین، ص۱۲۶ تا ۱۲۹، اتحاف النبلاء، ص۱۹۳ تا ۱۹۷

[3] الدرر الکامنۃ، ج۱، ص۱۱، فہرس الفہارس، ج۱، ص۱۵۷

شیخ ابوالعباس احمد بن ابی طالب محدث حجار قدس سرہ

شیخ ابوالعباس شہاب الدین احمد بن ابی طالب حجار الصالحی ۶۲۴ھ سے قبل پیدا ہوئے، ۶۳۰ھ میں دمشق میں محدث زبیدی سے صحیح بخاری کا سماع کیا اور اپنے عہد کے نامور محدثین سے حدیثیں سنیں، پھر حدیث کا درس دینا شروع کیا، بہت طویل عمر پائی، ۲۵/ صفر ۷۳۰ھ کو عصر کے وقت وصال ہوا۔[1]

شیخ سراج الدین حسین بن مبارک محدث زبیدی قدس سرہ

شیخ ابوعبداللہ سراج الدین حسین بن مبارک زبیدی بغدادی حنفی ۵۴۶ھ میں پیدا ہوئے، قرآن مجید مختلف قرأت سے پڑھ کر علوم وفنون کی تکمیل کی، اپنے دادا شیخ ابوالوقت سے فقہ وحدیث پڑھی، وزیر ابوالمظفر بن ہبیرہ کے مدرسہ میں درس حدیث دیتے تھے، نہایت نیک اطوار، متواضع اور بااخلاق تھے، ۲۳/ صفر ۶۳۱ھ میں وصال فرمایا، جامع منصور بغداد میں دفن ہوئے۔[2]

شیخ عبدالاول بن عیسیٰ السجزی محدث ہروی قدس سرہ

شیخ ابوالوقت عبداللہ بن عیسیٰ السجزی ۴۵۸ھ میں پیدا ہوئے، ہرات میں تعلیم وتربیت پائی، ۵۰۲ھ میں بغداد میں شیخ عبدالرحمن بن محمد بن مظفر داؤدی اور دوسرے مشائخ سے حدیث کا سماع کیا، علم حدیث میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے، ۶/ ذی قعدہ ۵۵۲ھ کو وصال ہوا اور شونیزیہ بغداد میں دفن ہوئے۔[3]

---

[1] البدایہ والنہایہ، ج ۱۴، ص ۱۵۰، الدرر الکامنہ، ج ۱، ص ۱۴۳، فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث، ص ۳۱۰، شذرات الذہب، ج ۶، ص ۹۳، فہرس الفہارس، ج ۱، ص ۲۵۲

[2] الجواہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ، ج ۱، ص ۲۱۶، ذیل تذکرۃ الحفاظ، از محمد زاہد کوثری، ص ۲۵۹، شذرات الذہب، ج ۵، ص ۱۴۳، تاج العروس، (مادہ ز ب د

[3] وفیات الاعیان، ج ۱، ص ۳۳۱، النجوم الزاہرہ، ج ۵، ص ۳۲۸، ۳۲۹، شذرات الذہب، ج ۴، ص ۱۶۶، اتحاف النبلاء، ص ۳۰۲

شیخ عبد الرحمن بن محمد بن مظفر محدث داؤدی قدس سرہٗ

شیخ ابو الحسن جمال الاسلام عبد الرحمن بن محمد بن مظفر داؤدی، ۳۷۴ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کے بعد نیشا پور میں فقہ کی تعلیم حاصل کی، ابو علی دقاق اور ابو عبد الرحمن سلمی سے تصوف کی تحصیل کی، محدث ابو الحسن بن الصلت سے بغداد میں، ابو عبد اللہ الحافظ سے نیشا پور میں اور ابو محمد ابن ابی شریح وغیرہ سے بوشنج میں حدیثوں کا سماع کیا، پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، بخاری شریف کا سماع ابو محمد عبد اللہ سرخسی سے بچپن میں ۳۸۱ھ میں ہوا، شوال ۴۶۷ھ میں وصال ہوا اور بوشنج میں دفن ہوئے۔ [1]

شیخ ابو محمد عبد اللہ بن احمد محدث سرخسی قدس سرہٗ

شیخ ابو محمد عبد اللہ بن احمد سرخسی، ۲۹۳ھ میں پیدا ہوئے، اپنے زمانے کے اکابر محدثین سے حدیث کا سماع کیا، شیخ محمد بن یوسف فربری کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے، راوی صحیح بخاری کے الفاظ سے مشہور تھے، ماہ ذی الحجہ ۳۷۳ھ میں وصال ہوا۔ [2]

شیخ ابو عبد اللہ محمد بن یوسف محدث فربری قدس سرہٗ

شیخ ابو عبد اللہ محمد بن یوسف بن مطر بن صالح بن بشر الفربری الشافعی ۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے، علوم دینیہ کی تکمیل کے بعد اہل علم سے حدیثیں سنیں، فربر میں علی بن خشرم سے حدیثیں سنیں، امام بخاری سے دو مرتبہ صحیح بخاری کا سماع کیا، پہلی مرتبہ اپنے وطن فربر میں ۲۴۸ھ میں اور دوسری مرتبہ مصنف کے وطن بخارا میں ۲۵۲ھ میں، ۳؍ شوال ۳۲۰ھ کو وصال ہوا، فربر بخارا سے متصل دریائے جیحوں کے کنارے چھوٹا قصبہ ہے۔ [3]

---

[1] کتاب المنتظم، ج ۸، ص ۲۹۶، کتاب العبر، ج ۳، ص ۲۶۵، طبقات الشافعیہ الکبریٰ، ج ۳، ص ۲۲۸، ۲۲۹، فوات الوفیات، ج ۱، ص ۲۶۲، ۲۶۳، شذرات الذہب، ج ۳، ص ۳۲۷

[2] کتاب العبر، ج ۳، ص ۱۱۷، النجوم الزاہرہ، ج ۴، ص ۱۶۱، شذرات الذہب، ج ۳، ص ۱۰۰

[3] کتاب العبر، ج ۲، ص ۱۸۴، تاج العروس (مادہ فرر) اتحاف النبلاء، ص ۳۸۵، وفات الاعیان، ج ۳، ص ۳۱۷

امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل شافعی محدث بخاری قدس سرہٗ

امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل شافعی بخاری، ۱۳؍شوال ۱۹۴ھ کو پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم علامہ داخلی سے حاصل کی، سولہ سال کی عمر میں عبداللہ بن مبارک اور امام وکیع کی کتابوں کو یاد کرلیا تھا، پھر علم حدیث کے لئے مکہ کا سفر کیا، اس کے علاوہ اور بھی دور دراز کے سفر کئے، بے مثال قوت حافظہ کے مالک تھے، سماعِ حدیث میں اساتذہ کی فہرست طویل ہے، زہد وتقویٰ اور عبادت وریاضت میں بڑا مقام تھا، تقریباً بائیس کتابیں تصنیف کیں، یکم شوال ۲۵۶ھ کو باسٹھ سال کی عمر میں وصال ہوا، عید کے دن ظہر کے بعد دفن ہوئے۔ [۱]

حضرت ابو کلیم محمد صدیق فانی خوش نویس رحمۃ اللہ علیہ نے ''اربعین سعیدی'' کا مسودہ راقم کے سپرد کیا کہ اس پر نظر ثانی اور اس کی تخریج وحوالہ جات مکمل کریں، زندگی کا کوئی اعتبار نہیں، جب بھی مکمل ہوجائے تو اسے شائع ضرور کرانا۔

عربی، فارسی اور اردو میں اربعین لکھنے کا سلسلہ اسلاف سے چلا آرہا ہے، حال ہی میں مشہور محقق الحاج محمد عالم مختار حق (متوفی ۶؍مارچ ۲۰۱۴ء لاہور) کی تحقیقی کتاب ''اردو میں اربعینات'' کا پہلا اڈیشن ۲۰۰۹ء اور ۲۰۱۵ء میں لاہور سے شائع ہوا ہے، اس میں انہوں نے سات سو چوبیس (۷۲۴) اربعینات کا تعارف کرایا ہے، اربعین سعیدی بھی ان اربعینات کی فہرست میں اضافہ ہے۔

حضرت محمد صدیق ابن حاجی مراد علی قادری ۱۹۴۲ء میں بٹالہ ضلع گورداسپور (مشرقی پنجاب، ہندوستان) میں پیدا ہوئے، قیام پاکستان کے بعد خانیوال میں رہائش اختیار کی، ابتدائی تعلیم خانیوال ہی میں حاصل کی اور ۱۹۵۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا،

---

[۱] بستان المحدثین، تہذیب الاسماء واللغات، وفیات الاعیان، تذکرۃ الحفاظ، طبقات الشافعیہ، البدایہ والنہایہ، مرآۃ الجنان، تہذیب التہذیب، ہدیۃ العارفین اتحاف النبلاء وغیرہ

حضرت امام بخش نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ (جڑانوالہ فیصل آباد) سے بیعت تھی، امام احمد رضا قادری بریلوی علیہ الرحمہ، حضرت شیخ الحدیث مولانا سردار احمد صاحب علیہ الرحمہ (فیصل آباد) اور غزالی زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی علیہ الرحمہ (ملتان) سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ ذریعہ معاش کے طور پر کتابت اور خوش نویسی کے پیشہ کو اختیار کیا، صوم وصلوٰۃ کے پابند اور تلاوت قرآن سے قلبی لگاؤ تھا، جمعہ کے روز سورۃ الکہف کی تلاوت کرتے، ایک مرتبہ راقم سے فرمایا کہ اس سورۃ کی تلاوت کی برکت سے فقیر کو اصحاب کہف کی زیارت نصیب ہوئی، انتہائی منکسر المزاج اور شرم وحیا کے پیکر تھے، ۱۹۷۳ء میں خشکی کے راستے بغداد شریف کی زیارت کے بعد حج کیا، ۲۵ر نومبر ۲۰۰۶ء کو وصال ہوا، آپ کی وصیت کے مطابق وہ قمیض جسے پہنے ہوئے آپ کو حضور نبی کریم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی تھی اور امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کے مزار مبارک کی چادر آپ کے کفن میں رکھی گئی، بعد نماز عشاء جامعہ عنایتیہ خانیوال کے قریب پارک میں آپ کی نماز جنازہ جگر گوشہ غزالی زماں پروفیسر مظہر سعید کاظمی مدظلہ العالی نے پڑھائی، راقم الحروف بھی نماز جنازہ میں شامل تھا، راقم کے سامنے حضرت پروفیسر قبلہ مظہر سعید کاظمی مدظلہ نے نماز جنازہ سے پہلے آپ کے چہرہ کی زیارت کی، دیکھتے ہی فرمایا ''ارے یہ تو جنتی ہیں''۔

الحمد للہ راقم نے حضرت فانی صاحب علیہ الرحمہ سے ''اربعین سعیدی'' کی تکمیل کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا ہوگیا، اللہ کریم جل جلالہ اس کوشش کے وسیلہ سے راقم الحروف اور اس کے والدین اور تمام مومنین ومومنات کی بخشش فرمائے۔ اللھم آمین

احقر فقیر

خلیل احمد عفی عنہ

اربعین سعیدی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فضیلت حفظِ حدیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث یاد کرنے کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے۔
بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من حفظ علی امتی اربعین حدیثا فی امر دینھا بعثہ اللہ فقیھا وکنت لہ شافعا یوم القیامۃ وشھیدا۔[1]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ میں اس حدیث کا ترجمہ کرتے ہوئے فرمایا:

"کسے کہ یاد گیر دو برساند امت مرا چہل حدیث از کار دین ایشاں... بر انگیزد اورا خدائے تعالیٰ روز قیامت در زمرہ فقہاء... و باشم من مر اورا روز قیامت شفاعت کنندہ مر گناہاں او را و گواہی دہندہ بر طاعت او"۔[2]

[1] شعب الایمان (عربی)، جلد ۲، ص ۲۷۰، مطبوعہ مکتبۃ الرشد، ریاض
[2] اشعۃ اللمعات، جلد اول، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۸۹۴ء، ص ۱۸۶

یعنی جو شخص یاد کرے اور پہنچائے میری اُمت کو چالیس احادیث جو ان کے امر دین سے ہوں، اُٹھائے گا اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن فقہاء کے زمرہ میں اور میں اس کے لئے اس کے گناہوں کی شفاعت کرنے والا اور اس کی طاعت پر گواہی دینے والا ہوں گا۔

ابن عدی نے الکامل میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مرفوعاً روایت کی، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

من حفظ علی اُمتی اربعین حدیثا من السنۃ کنت لہ شفیعاً وشہیداً یوم القیمۃ، نیز ابن نجار نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا من حفظ علی اُمتی اربعین حدیثا من سنتی ادخلتہ یوم القیمۃ فی شفاعتی۔[1]

بیہقی کی روایت کے متعلق امام احمد (بن حنبل) رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "ھذا متن مشھور فیما بین الناس ولیس لہ اسناد صحیح" اور امام نووی نے اپنی اربعین میں کہا کہ حدیث ضعیف ہے لیکن اس کے طرق متعددہ ہیں جس کی وجہ سے اس حدیث میں قوت پیدا ہوگئی۔[2]

روایت ابن عباس کو امام سیوطی نے ضعیف قرار دیا اور حدیث ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصحیح فرمائی۔ (جامع الصغیر، جلد دوم)

اس میں شک نہیں کہ آئمہ کبار نے ان احادیث کو تلقی بالقبول کے ساتھ اور ان پر عمل کر کے ان کے مقبول اور حجت ہونے کو تسلیم کر لیا ہے، کیونکہ علماء کبار سلف وخلف نے

۱۔ فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت ۱۹۷۲ء، ص ۱۱۹، ج ۱

۱۔ جامع الصغیر لسیوطی، ج ۲، ص ۱۳۹، الفتح الکبیر، مطبوعہ دار الفکر بیروت، حدیث ۱۱۷۰۳، ۱۱۷۰۵، ۱۱۷۲۹

۲۔ اشعۃ اللمعات، جلد اول، مطبوعہ نول کشور ۱۸۹۳ء، ص ۱۸۷

اربعین تصنیف کی ہیں، اور وہ حضور اکرم ﷺ کی شفاعت اور اپنی مغفرت کے لئے حضور ﷺ کی شہادت کے اُمیدوار ہوئے۔

قطع نظر اس سے کہ ضعاف فضائل اعمال میں مقبول ہیں، اس امر میں کسی شک وشبہ کے لئے گنجائش باقی نہیں کہ احادیث مذکورہ قابل قبول حجت شرعیہ ہیں کیونکہ تینوں احادیث ایک دوسرے کے لئے شاہد ہیں، اور حدیث ابوسعید خدری کے صحیح ہونے کی تصریح تو خود امام جلال الدین سیوطی نے فرمادی ہے۔

خلاصہ یہ کہ احادیث رسول ﷺ کو یاد کرنا اور انہیں مسلمانوں تک پہنچانا ایسی فضیلت اور اجروثواب کا موجب ہے کہ ایسا شخص قیامت کے دن فقہاء کے گروہ میں اٹھایا جائے گا، اور رسول اللہ ﷺ اس کے لئے شفیع اور شہید ہوں گے، بشرطیکہ ایمان اور اخلاص کامل کے ساتھ بہ عمل ہو، اور مرتے دم تک کوئی ایسا گناہ سرزد نہ ہو جس سے یہ نیکی ضائع ہوجائے، کیونکہ خود حضور ﷺ کا ارشاد ہے انما الاعمال بالخواتیم (مشکوۃ، باب الایمان)، اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان، اخلاص اور حسن خاتمہ نصیب فرمائے، آمین

حدیث نمبر (۱)

اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے

عمر بن خطاب رضي الله تعالیٰ عنه قال سمعت رسول الله ﷺ يقول : انما الاعمال بالنيات وانما لكل امريء ما نوي فمن كانت هجرته الي دنيا يصيبها او الي امرأة ينكحها فهجرته الي ماهاجر اليه۔ [۱]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اعمال صرف نیتوں سے ہے اور انسان کے لئے وہی کچھ ہے جو اس نے نیت کی، تو جس کی ہجرت دنیا کی طرف ہو کہ اس کو پہنچے یا کسی عورت کی طرف ہو کہ اس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے۔ جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔

محدثین کرام اپنی تالیفات میں عموماً اس حدیث کو پہلے لکھتے ہیں، اس سے ان کی مراد اخلاص، قصد اور تصحیح نیت اور اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی ہوتی ہے۔

ابوداؤد کا قول ہے کہ وہ آٹھ سو حدیثیں ہیں جن میں مسائل دینیہ کی تفصیل ہے، انسان کو اپنے دین کے لئے ان میں سے چار حدیثیں کافی ہیں۔

۱۔ الاعمال بالنیات (عمل صرف نیت میں)

۲۔ احلال بین والحرام بین الخ (حلال ظاہر ہے اور حرام ظاہر)

۳۔ من حسن اسلام المرئ ترکه مالا یعنیه۔ (آدمی کے حسن اسلام یہ بات کہ وہ اس چیز کو چھوڑ دے جو اسے نفع نہ دے)

۴۔ لایؤ من احد کم حتی یحب لاخیه مایحب لنفسه۔ (اس وقت تک مومن

---

[۱] بخاری شریف، کتاب بدء الوحی، حدیث ۱، مطبوعہ مکتبہ الرشد، ریاض ۲۰۰۶ء ص ۵

نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے مومن بھائی کے لئے اس چیز کو پسند نہ کرے جسے اپنے لئے پسند کرتا ہے)۔

معلوم ہوا کہ حدیث الاعمال بالنیات ایک ہزار حدیثوں کے برابر ہے۔

قاضی عیاض نے کہا! آئمہ فرماتے ہیں کہ حدیث ثلث اسلام، دین کا تہائی حصہ ہے۔ [1]

آئمہ ثلاثہ امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک تقدیر حدیث اس طرح ہے (صحۃ الاعمال بالنیات) اعمال کی صحت نیتوں سے ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں "ثواب الاعمال لا یکون الا بالنیۃ" عملوں کا ثواب بغیر نیت کے نہیں ہوتا۔

جن کاموں سے ثواب متعلق ہوتا ہے وہ دو قسم ہیں، عبادات مقصودہ، جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، وغیرہ اور عبادات غیر مقصودہ، جیسے وضو، غسل، طہارت وغیرہ، عبادات غیر مقصودہ کی وہ حقیقت جو شرعاً معتبر ہے صرف ثواب ہے، اگر ثواب کو ان عبادتوں سے الگ کرلیا جائے تو ان کی حقیقت ہی باقی نہ رہے اور عبادات غیر مقصودہ کی حقیقت ثواب نہیں ہوتی وہ کسی عبادت مقصودہ کے لئے آلہ ہوتی ہیں، اگر ثواب کو ان سے علیحدہ کرلیا جائے تو وہ عبادات مقصودہ کے لئے آلہ رہیں گی۔

امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہر عمل کا ثواب نیت سے ہے، نیت ہوگی تو ثواب ہوگا ورنہ نہیں۔

اگر عبادات مقصودہ میں نیت نہ کی تو ان کا ثواب نہیں ہوگا، اور چونکہ ان کی حقیقت ثواب ہی تھی لہٰذا اس کے نہ ہونے سے ان کی حقیقت باطل ہوجائے گی اور شرعاً عبادتیں صحیح نہ ہوں گی، جیسے نماز روزہ وغیرہ میں اگر نیت نہ کی جائے تو نماز روزہ صحیح نہ ہوگا، اور اگر عبادات

[1] مرقاۃ شرح مشکوٰۃ (عربی) طبع ملتان ص ۲۸

غیر مقصودہ میں نیت نہ کی جائے تو ثواب نہ ہوگا، لیکن ان عبادتوں کی حقیقت چونکہ عین ثواب نہیں اس لئے باوجود ثواب نہ ہونے کے یہ کام شرعاً صحیح قرار پائیں گے، مثلاً غسل ووضو وغیرہ بغیر نیت کے صحیح ہیں نماز کا آلہ ہونے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں اگرچہ نیت نہ ہونے کی وجہ سے ثواب سے خالی ہیں۔

اگر اس مقام پر یہ شبہ پیدا کیا جائے کہ تیمم بھی عبادت غیر مقصودہ ہے اور وہ بھی بغیر نیت کے صحیح نہیں ہوتا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ تیمم میں جو نیت فرض ہے وہ حصول ثواب کے لئے نہیں بلکہ تیمم کو وضو کے قائم مقام کرنے کے لئے ہے، حصول ثواب کے لئے نیت ثواب بالکل علیحدہ ہے، اگر وہ نیت ہوگی تو ثواب ہوگا، ورنہ تیمم ہو جائے گا ثواب نہ ملے گا۔

ایک اعتراض کا جواب

"انما الاعمال بالنیات" یعنی عملوں کا دارومدار نیتوں پر ہے لہذا علماء دیوبند کی عبارتوں میں اگرچہ کلمات توہین پائے جاتے ہیں مگر ان کی نیت توہین اور تنقیص کی نہیں اس لئے ان پر حکم کفر عائد نہیں ہو سکتا۔

اس کے جواب میں گذارش ہے کہ حدیث کا مفاد صرف اتنا ہے کہ کسی نیک عمل کا ثواب نیت ثواب کے بغیر نہیں ملتا، یہ مطلب نہیں کہ ہر عمل میں نیت معتبر ہے، اگر ایسا ہو تو کفر والحاد اور توہین وتنقیص نبوت کا دروازہ کھل جائے گا، ہر دریدہ دہن بے باک جو چاہے گا کہتا پھرے گا، جب گرفت ہوگی تو صاف کہہ دے گا کہ میری نیت توہین کی نہ تھی، واضح رہے کہ لفظ صریح میں جیسے تاویل نہیں ہو سکتی، ایسے ہی نیت کا عذر بھی اس میں قابل قبول نہیں ہوتا، اکفار الملحدین ص ۳۷ پر مولوی انور شاہ صاحب کشمیری دیوبندی لکھتے ہیں:

"المدار في الحکمبالکفر علي الظواهر ولانظر للمقصود والنيات ولانظر لقرائن حاله۔" [1]

الحکم بالکفر

انور شاہ کشمیری

۱/ اکفار الملحدین، مطبوعہ المجلس العلمی کراچی، طبع ثالث ۲۰۰۰ء، ص ۹۱

ترجمہ: کفر کے حکم کا دارومدار ظاہر پر ہے قصد و نیت اور قرائن حال پر نہیں۔

نیز اسی اکفار الملحدین کے ص ۸۶ پر ہے :

" وقد ذكر العلماء ان التهور في عرض الانبياء وان لم يقصد السب كفر " ~~ا~~

ترجمہ: علماء نے فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی شان میں جرأت و دلیری کفر ہے، اگرچہ توہین مقصود نہ ہو۔

(توہین کا تعلق عرف عام اور محاورات اہل زبان سے ہوتا ہے)

بعض لوگ کلمات کے معنی میں قسم قسم کی تاویلیں کرتے اور یہ نہیں سمجھتے کہ اگر کسی تاویل سے معنی مستقیم بھی ہو جائیں اور اس کے باوجود عرف عام و محاورات اہل زبان میں اس کلمہ سے توہین کے معنی مفہوم ہوتے ہوں تو وہ سب تاویلات بے کار ہوں گی، مثلاً ایک شخص اپنے والد یا استاد کو کہتا ہے کہ آپ بڑے ولد الحرام ہیں، اور تاویل یہ کرتا ہے کہ لفظ حرام کے معنی فعل حرام نہیں بلکہ محترم کے ہیں، جیسے المسجد الحرام اور بیت اللہ الحرام، لہذا ولد الحرام سے مراد ولد محترم ہے، اور معنی یہ ہیں کہ آپ بڑے ولد محترم ہیں، تو یقیناً کوئی اہل انصاف کسی بزرگ کے حق میں اس تاویل کی رو سے لفظ ولد الحرام بولنے کو قطعاً جائز نہیں رکھے گا، اور ان کلمات کو بربنائے عرف و محاوراتِ اہل زبان کلمات توہین ہی قرار دے گا۔

لہذا ہم ناظرین کرام سے درخواست کریں گے کہ وہ علمائے دیوبند کی توہین آمیز عبارات پڑھتے وقت اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ دیکھیں کہ عرف و محاورہ کے اعتبار سے اس عبارت میں توہین ہے یا نہیں ؟

ف انور شاہ کشمیری، اکفار الملحدین، ادارۃ المجلس العلمی کراچی، طبع ثالث، ۱۴۰۴ھ، ص ۱۰۸

(توہین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں قائل کی نیت کا اعتبار نہیں ہوتا)

ناظرین کرام کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ توہینی عبارات پڑھتے ہوئے یہ خیال بھی دل میں نہ لائیں کہ قائل کی نیت توہین کی ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں توہین آمیز الفاظ بولتے وقت نیت کا اعتبار نہیں ہوتا۔ اور کلمہ توہین بہر صورت توہین ہی قرار پاتا ہے، بشرطیکہ قائل کو یہ علم ہو جائے کہ یہ کلمہ کلمہ توہین ہے۔ یا یہ کلمہ توہین کا سبب ہو سکتا ہے، تو ایسی صورت میں بغیر نیت توہین کے بھی اس کلمے کا بولنا یقیناً موجب توہین ہوگا، دیکھئے صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہ نیت تعظیم راعنا کہہ کر خطاب کیا کرتے تھے، لیکن یہودی چونکہ اس کلمہ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں بہ نیت توہین استعمال کرتے تھے، یا ادنیٰ تصرف سے اس کو کلمہ توہین بنا لیتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو راعنا کہنے سے منع کر دیا۔ اور اس حکم کے بعد اس کلمہ کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں بولنا توہین اور موجب عذاب الیم قرار دے دیا، معلوم ہوا کہ ابنائے زمانہ کی رکیک تاویلوں سے ساحت نبوت بہت بلند و بالا ہے، اور مؤولین (تاویل کرنے والے) کی من گھڑت تاویلات ان کو توہین کے جرم عظیم سے بچا نہیں سکتیں، جیسا کہ ہم اس سے پہلے مولوی انور شاہ صاحب کشمیری دیوبندی کی تصریحات اسی اعتراض کے جواب میں نقل کر چکے ہیں۔

توہین کا دارومدار واقعیت پر نہیں ہوتا

بعض لوگ توہین کو واقعیت پر موقوف سمجھتے ہیں، حالانکہ توہین و تنقیص کا تعلق الفاظ و عبارات سے ہوتا ہے، بسا اوقات کسی واقعہ کو اجمال کے ساتھ کہنا موجب توہین نہیں ہوتا، لیکن اسی امر واقعہ میں بعض تفصیلات کا آجانا توہین کا سبب ہو جاتا ہے، اگرچہ ان تفصیلات کا بیان واقعہ کے مطابق بھی کیوں نہ ہو، ملاحظہ فرمائیے۔ شرح فقہ اکبر، مطبوعہ مجتبائی، ص ۶۴، بار سوم ۱۹۰۷ء میں ہے۔

”عالم میں کوئی شے ایسی نہیں جس کے ساتھ ارادۂ الٰہیہ متعلق نہ ہو، اور اس بناء پر اگر یہ کہہ دیا جائے کہ تمام کائنات اللہ تعالیٰ کی مراد (یعنی ارادہ کی ہوئی) ہے تو اس میں کوئی توہین نہیں، لیکن اگر اسی واقعہ کو اس تفصیل سے کہا جائے کہ ظلم، چوری، شراب خوری اللہ تعالیٰ کی مراد ہے، تو اگرچہ یہ کلام واقعہ کے مطابق ہے، لیکن ظلم فسق وغیرہ کی تفصیلات آجانے کے باعث خلاف ادب اور توہین آمیز ہو گیا، اسی طرح بدلیل آیہ قرآنیہ اللہ خالق کل شئ یہ کہنا بالکل جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئے کا خالق ہے، لیکن اللہ خالق القاذورات وغیرہا (اللہ تعالیٰ گندگیوں اور دوسری بری چیزوں کو پیدا کرنے والا ہے) کہنا جائز نہیں، کہ ذلیل اور رذیل اشیاء کی تفصیل ایہام کفر کی وجہ سے یقیناً موجب توہین ہے“۔ (ملخصاً)

مولوی اشرف علی صاحب تھانوی نے اپنی آخری تصنیف ”بوادر النوادر“ میں بھی یہی لکھا ہے کہ ”اسی لئے حق تعالیٰ کو خالق کل شئ کہنا درست ہے، اور خالق الکلاب والخنازیر (کتوں اور سوروں کا خالق) کہنا بے ادبی ہے“۔ بوادر النوادر، ص ۲۰۹ [1]

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان کی روشنی میں ہمارے ناظرین کرام پر مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کی عبارت حفظ الایمان کا توہین ہونا بخوبی واضح ہو گیا ہوگا، اور تھانوی صاحب نے اپنی عبارت کی تائید کے لئے ”شرح مواقف“ کی عبارت سے استدلال کیا ہے، اس کا بے سود ہونا بھی اہل علم نے اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ بعض علم غیب حیوانات و بہائم اور پاگلوں کو ہوتا ہے، تب بھی مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کی طرح یہ کہنا کہ اگر حضور ﷺ کے لئے بعض علم غیب مانا جائے تو ایسا علم غیب تو ہر زید و عمرو اور ہر صبی و مجنون بلکہ جمیع حیوانات و بہائم کے لئے بھی حاصل ہے، یقیناً حضور ﷺ کے حق میں موجب توہین ہوگا، کیونکہ اس عبارت میں بچوں، پاگلوں، حیوانات اور بہائم کے الفاظ ایسے ہیں جن کی تصریح ہر اہل فہم کے نزدیک

[1] اشرف علی تھانوی، بوادر النوادر، ... ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۲۰۹

اس کلام میں ایسی صریح توہین پیدا کر رہی ہے، جس کا انکار بجز معاند متعسف کے کوئی شخص نہیں کر سکتا، بخلاف عبارت شرح مواقف کے کہ اس میں بچوں، پاگلوں، جانوروں اور حیوانوں کی قطعاً کوئی تفصیل مذکور نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ علماء دیوبند کی اکثر عبارات اسی نوعیت کی ہیں کہ ان میں کہیں چوہڑے چمار کی تفصیل مذکور ہے، کہیں شیطان لعین کی، اس لئے ہمارے منقولہ بالا بیان کی روشنی میں علماء دیوبند کی ایسی عبارات کا توہین آمیز ہونا روز روشن کی طرح ظاہر ہے، اور ان میں جو تاویلات کی جاتی ہیں، ان سب کا لغو و بے کار ہونا اظہر من الشمس ہے۔[۱]

[۱] مقالات کاظمی، حصہ سوم، مطبوعہ ساہیوال ۱۹۸۷، ص ۸۷۔۲ الحق المبین، مطبوعہ لاہور ۲۰۰۳، ص ۱۹

حدیث نمبر (۲)

پنجتن پاک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''محمد بن المثني قال ثنا بكر بن يحيى بن زبان العنزي قال ثنا مندل عن الاعمش عن عطية عن ابي سعيد الخدري قال قال رسول الله ﷺ نزلت هذه الآية في خمسة في وفي علي رضي الله عنه وحسن رضي الله عنه وحسين رضي الله عنه وفاطمه رضي الله عنها انما يريد الله ليذهب عنكم الرجس اهل البيت ويطهركم تطهيرا''[1]

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ آیت ''پنجتن'' کی شان میں نازل ہوئی ہے، میری شان میں اور علی رضی اللہ عنہ کی اور حسن اور حسین رضی اللہ عنہما اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شان میں کہ جز ایں نیست اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے اے اہل بیت کہ تم سے ناپاکی دور کردے اور تمہیں پاک کردے خوب پاک کردے۔

پنجتن کے معنی ہیں پانچ افراد، اور ان سے مراد حضرت محمد رسول اللہ ﷺ، حسنین کریمین، سیدہ فاطمہ زہرا، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین ہیں، اور آیت تطہیر ان پانچوں مقدسین کے بارے میں نازل ہوئی، جس میں ویطہرکم تطہیرا موجود ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں پاک کردے پاک کرنا، جو اس بات کی روشن دلیل ہے کہ یہ پنجتن واقعی پاک ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے جب خود اپنی زبان مبارک سے ''خمسۃ'' کا لفظ فرمادیا اور خمسہ سے

۱۹۸۸ء/۱۴۰۵ھ دار الفکر

[1] علامہ ابی جعفر محمد بن جریر الطبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن، مطبوعہ بیروت (لبنان) ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء
ج ۱۲ ص ۵-۶

اپنی مراد کو ظاہر فرمانے کے لئے تفصیل ارشاد فرمادی اور صاف صاف ارشاد فرمادیا کہ آیہ تطہیر کی شان نزول یہ پانچ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے پاک قرار دیا تو اب اس کے بعد کسی شقی القلب کا یہ کہنا کہ معاذ اللہ پنجتن کو پاک کہنا جائز نہیں اور پنجتن آیہ تطہیر میں داخل نہیں، بارگاہ رسالت سے بغاوت اور اور اللہ کے رسول کی تکذیب نہیں تو اور کیا ہے؟ نعوذ باللہ من ذلک اس کا مقصد یہ نہیں کہ معاذ اللہ ان پانچ کے سوا ہم کسی کو پاک نہیں مانتے، ہمارے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات بھی آیہ تطہیر میں شامل ہیں، اسی لئے ہم ان کے ساتھ مطہرات کا لفظ لازمی طور پر استعمال کرتے ہیں اور ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے بے شمار مقدس محبوب بندے اور بندیاں یقیناً پاک ہیں اور ہم ان کی پاکی کا اعتقاد رکھتے ہیں، لیکن پنجتن پاک بولنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ حدیث منقولہ بالا میں خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے خمسہ کا کلمہ مقدسہ ادا ہوا، پھر ان کی تفصیل بھی خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمائی اور ان کی شان میں آیہ تطہیر کے نزول کا ذکر فرمایا۔ اگر پنجتن پاک کے لفظ کا یہ مفہوم لیا جائے کہ معتقدین پنجتن کے نزدیک ان پنجتن کے سوا کوئی پاک ہی نہیں تو معاذ اللہ یہ الزام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مقدسہ پر بھی عائد ہوگا، کیونکہ خمسہ کا لفظ زبان رسالت کا ارشاد ہے، معلوم ہوا کہ پنجتن کو پاک کہنے والے سب سے پہلے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور اس کلمہ کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ پاکی انہیں پانچ میں منحصر ہے اور معاذ اللہ ان پانچ کے سوا کوئی اور پاک نہیں، بلکہ یہ بھی پاک ہیں اور ان کے سوا وہ سب پاک ہیں جن کی پاکی پر کتاب وسنت سے دلیل قائم ہے۔[1]

---

[1] ماہنامہ السعید ملتان شمارہ اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۲۲ ۔ ۲۳

حدیث نمبر (۳)

حدیث قسطنطنیہ

اوّل جیش من اُمتی یغزون مدینۃ قیصر مغفورٌ لهم۔[1]

ترجمہ: میری اُمت میں سے جس نے مدینہ قیصر پر پہلے چڑھائی کی ان کے لئے بخشش ہے۔

بعض لوگ اس حدیث سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ "مغفورٌ لهم" میں یزید بن معاویہ داخل ہے، کیوں کہ اس نے مدینہ قیصر پر پہلے چڑھائی کی اور وہ اس لشکر میں شامل تھا۔ مستدلین مدینہ قیصر سے قسطنطنیہ مراد لیتے ہیں اور یزید کو "مغفور لهم" میں شامل کرتے ہیں۔ تو عرض ہے کہ جس وقت نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا، اُس وقت قسطنطنیہ (ترکی) مدینہ قیصر نہیں تھا، بلکہ اُس وقت حمص (شام) مدینہ قیصر تھا، اور حمص پر یزید بن معاویہ نے چڑھائی نہیں کی، بلکہ حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی وفات سے چھ ماہ پہلے حمص پر لشکر بھیجا تھا، چھ ماہ یہ لشکر جنگ کرتا رہا، فتح حاصل نہ ہوئی، ۲۲/جمادی الثانی ۱۳ھ میں حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وصال فرمایا، لشکر وہیں رہا، جب حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے تو مزید کمک بھیجی، پھر حمص فتح ہوا، جہاد کی ابتداء دورِ صدیقی میں ہوئی اور انتہا دورِ فاروقی میں ہوئی۔

لہٰذا اس حدیث سے استدلال کرنا ہی غلط ہے، کیونکہ مدینہ قیصر اس وقت حمص تھا اور اس پر یزید نے چڑھائی نہیں کی۔ اگر میں علی السبیل التنزل مان لوں کہ مدینہ قیصر اس وقت قسطنطنیہ تھا تو پھر میں کہوں گا کہ اول تو یزید اول جیش میں داخل ہی نہیں اور اول جیش کا مصداق یزید نہیں ہو سکتا، اگر جیش میں داخل ہو تو یہ ایک ایسا لفظ ہے جو جماعت پر بولا جاتا

[1] بخاری شریف، جلد اول طبع کراچی ص ۴۱۰ کتاب الجهاد والسیر، مطبوعة دار الفكر، الریاض ۱۹/۰۱/۱۹۹۸ء ص ۹۱ حدیث ۲۹۲۴

ہے، ایک کو جیش نہیں کہتے۔ لفظ جیش ''عام'' ہے اور تمام افراد کو شامل ہے۔

قرآن کریم میں ہے: ''والمطلقت یتربصن بانفسھن ثلثۃ قروء (سورۃ بقرہ، آیت ۲۲۸)'' اور طلاق والیاں اپنی جانوں کو روکے رہیں تین حیض تک''۔

اس آیت میں ''المطلقت'' عام ہے اور تمام افراد کو شامل ہے، جس طرح حاملہ عورت ''المطلقت'' میں شامل ہے اسی طرح یزید بھی جیش میں شامل ہے مگر ''مغفور لھم'' کا حکم اس پر نہیں لگے گا، کیونکہ دلیل خاص سے اس کا استثناء ثابت ہے اور جس چیز کا استثناء، دلیل خاص سے ثابت ہو جائے وہ چیز حکم عام میں داخل نہیں ہوتی، جیسے لفظ ''مطلقت'' بغیر الف لام کے، اس کا معنی ہے تین کا مجموعہ، یعنی اس میں ''جمعیت'' ہے، جب اس پر ''الف لام'' داخل کیا گیا، جیسے ''المطلقت'' تو جمعیت ختم ہوگئی، اب ایک سے لے کر لا تعداد کی تعداد اس میں داخل ہے، ''مطلقت'' کہیں گے تو اس میں تین طلاق والی شامل ہوں گی اور ''المطلقت'' کہا تو اس میں ہر طلاق والی شامل ہے، کیونکہ ''المطلقت'' عام ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں حکم عام مذکور ہے کہ طلاق والیاں تین حیض گزاریں، لیکن دوسری جگہ دلیل خاص مذکور ہے کہ جو عورتیں حاملہ ہیں ان کی مدت عدت وضع حمل ہے۔

قرآن کریم میں ہے: '' واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن (سورۃ الطلاق، آیت ۴)'' اور حمل والیوں کی معیاد یہ ہے کہ وہ اپنا حمل جن لیں''۔

''واولات الاحمال'' دلیل خاص ہے اور '' یتربصن بانفسھن'' دلیل عام ہے، اب ''اولات الاحمال'' اس میں شامل نہیں رہیں گی، کیونکہ جس چیز کا استثناء دلیل خاص سے ہو، وہ عام میں داخل نہیں ہوتی۔

یزید کا دلیل خاص سے استثناء اس طرح ہے، دلیل خاص حدیث شریف ہے:

''جو شخص کہ اہل مدینہ سے بدی کا ارادہ کرے گا اور ان کو ایذا پہنچانے کی غرض سے کسی

مقام پر کھڑا ہو گا، وہ شہنشاہ جبار کے عذاب میں گرفتار ہو گا اور آگ میں مانند رانگ کے اور نمک کے پانی میں پگھل جائے گا"۔ [1]

دوسری حدیث :

"اے اللہ جو شخص میرے اور میرے اہل شہر کے ساتھ برائی کا خیال کرے اس کو جلد ہلاک کر"۔ [2]

تیسری حدیث :

"من اخاف اهل المدينة ظالماً اخافه الله وكانت عليه لعنة الله والملٰئكة والناس اجمعين"

"جو شخص اہل مدینہ کو ڈرائے اس کو اللہ تعالیٰ ظلماً ڈراتا ہے اور اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے"۔ [3]

اللہ تعالیٰ کی لعنت، فرشتوں کی اور جمیع مؤمنین کی لعنت، اسی طرح نمک کی طرح پانی میں پگھلنا، مغفرت میں مطابقت نہیں رکھتا، ثابت ہوا کہ ان احادیث نے یزید کو جیش سے مذکورہ قاعدہ کے تحت نکال دیا، یہاں اتنی بات ضرور یاد رکھیں کہ حدیث میں اگر تعدد طرق کی بنا پر تفاوت ہو جائے تو صحت حدیث میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

اب کون نہیں جانتا کہ یزید نے مدینہ منورہ والوں پر ظلم نہیں کیا، سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ (متوفی ۹۳ھ) جو کبار تابعین میں ہیں، مسلم بن عقبہ کے پاس لائے گئے اور کہا یزید کی بیعت کرو، سعید بن مسیب نے فرمایا کہ میں نے ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہم کی سیرت پر بیعت کی، مسلم بن عقبہ نے کہا کہ میں ان کی گردن مارنے کا حکم دیتا ہوں، ایک آدمی نے کھڑے

[1] جذب القلوب الی دیار المحبوب، از شیخ عبدالحق محدث دہلوی، (اردو ترجمہ) طبع کراچی، ص ۳۱

[2] جذب القلوب، ص ۳۱ [3] ~~جذب القلوب ص ۳۱~~

ہو کر گواہی دی کہ یہ مجنون ہے تو مسلم بن عقبہ نے ان کے جرم سے درگزر کیا۔ [1]

یزید اگر جیش میں داخل ہے تو دلیل میں یہ جو احادیث ہیں انہوں نے یزید کو خارج کر دیا، قاعدہ یاد رکھیں کہ "کل" کا لفظ جہاں بھی آئے تو قرآن پاک میں یا حدیث پاک میں، اس سے وہ تمام احوال جن کی دلیل خاص سے تخصیص ہوگئی ہو، مستثنیٰ ہوں گے، اس سے ثابت ہوا کہ تخصیص کی ایک صورت قرآن کی قرآن سے اور حدیث کی حدیث سے ہے۔ [2]

1۔ جذب القلوب ص ۴۰

2۔ ہفت روزہ "احوال" کراچی، شمارہ ۲۵ / اپریل تا یکم مئی ۱۹۹۱ء۔ "نوائے انجمن" کاظمی نمبر، شمارہ مارچ، اپریل ۱۹۹۳ء

حدیث نمبر (۴)

وسیلہ

عن انس بن مالك ان عمر بن الخطاب كان اذا قحطوا استسقي بالعباس بن عبد المطلب فقال اللّهم انا كنا نتوسل اليك بنبينا صلي الله عليه وسلم فتسقينا وانا نتوسل اليك بعم نبينا فاسقنا قال فيسقون۔ رواه البخاري[1]

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب لوگ قحط میں مبتلا ہوتے تو حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وسیلہ سے باران رحمت طلب کرتے، اور کہتے کہ اے اللہ ہم تیری بارگاہ میں (بلا واسطہ) تیرے نبی علیہ السلام کا وسیلہ پیش کیا کرتے تھے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا تو ہمیں سیراب فرما دیا کرتا تھا، اے مولا! ہم (اب) تیری بارگاہ قدس میں تیرے پیارے نبی علیہ السلام کے چچا کا وسیلہ لے کر حاضر ہوئے ہیں، ہمیں سیراب فرمادے (اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ) وہ سیراب کردیے جاتے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا۔

اس حدیث مبارک سے ثابت ہوا کہ طلب حاجات میں اللہ کے نیک بندوں کا وسیلہ پکڑنا جائز ہے، منکرین وسیلہ کی طرف سے اگر یہ کہا جائے کہ اس حدیث سے زندوں کا وسیلہ پکڑنا جائز ثابت ہوتا ہے، مردوں کا نہیں، اسلئے کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ زندہ تھے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو اسی حدیث سے فوت شدہ بزرگوں کے توسل کی نفی ہوتی ہے، کیونکہ حدیث میں مذکور ہے، کہ اے اللہ ہم تیرے نبی ﷺ کا وسیلہ پکڑا کرتے تھے، اب تیرے نبی ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وسیلہ پکڑتے ہیں۔ صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وسیلہ پکڑتے تھے، اگر کسی بزرگ کے فوت ہوجانے کے بعد اس

---

[1] صحیح البخاری، (نور محمد کراچی) جلد اول، صفحہ ۱۳۷

کا وسیلہ جائز ہوتا تو صحابہ کرام حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد بھی حضور ہی سے توسل کرتے، حضور کی بجائے حضرت عباس سے توسل کرنا اس بات کی دلیل ہے، کہ کسی بزرگ کے فوت ہوجانے کے بعد اس سے توسل جائز نہیں۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ حدیث مبارک میں نہایت واضح اور غیر مبہم الفاظ میں توسل مذکور ہے، جس میں زندہ اور مردہ کا کوئی تفاوت نہیں، اور نہ حدیث کا کوئی لفظ فوت شدہ بزرگوں سے توسل کی نفی پر دلالت کرتا ہے، رہا یہ امر کہ صحابہ کرام حضور سید عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضور کا توسل نہیں کرتے تھے، قطعاً غلط ہے، نہ اس حدیث میں حضور ﷺ سے وسیلہ نہ کرنا مذکور ہے اور نہ کسی اور حدیث میں اس کی نفی ہے، بلکہ بکثرت احادیث سے روز روشن کی طرح ثابت ہے کہ صحابہ کرام حضور سید عالم ﷺ کے وصال کے بعد بھی سرکار سے توسل کو جائز سمجھتے تھے، اس بات میں حدیث اعرابی رفع شبہات کے لئے کافی ہے۔ [1] جس میں مذکور ہے کہ صحابہ کرام کی موجودگی میں وہ اعرابی سید عالم ﷺ کے مزار مقدس پر حاضر ہوا، اور سرکار دو عالم ﷺ سے توسل کیا، وہ اعرابی اپنے گناہوں کی مغفرت کی حاجت لے کر مزار پر انوار پر حاضر ہوا تھا، سرکار ابد قرار کے توسل کی برکت سے اس کی حاجت پوری ہوئی اور قبر انور سے آواز آئی "ان اللہ قد غفر لك" بے شک اللہ تعالیٰ نے تیرے گناہوں کو معاف کر دیا۔

نیز مشکوٰۃ شریف باب الکرامات (مطبوعہ کراچی ص ۵۴۵) میں ہے:

"حدثنا ابو الجوزاء اوس بن عبداللہ قال: قحط اهل المدينة قحطاً شديداً فشكوا الى عائشة فقالت: انظروا قبر النبي ﷺ فاجعلوا منه كوا الى السماء حتى لا يكون بينه وبين السماء سقف۔ قال: ففعلوا، فمطرنا مطراً حتى نبت العشب، وسمنت الابل حتى تفتقت من الشحم،

---

[1] تفسیر احکام القرآن للقرطبی، ج ۵، ص ۲۶۵، مطبوعہ مکہ مکرمہ۔ تفسیر ابن کثیر، مطبوعہ مکتبہ اولاد الشیخ للتراث، قاہرہ ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء، ج ۴، ص ۱۴۰

فـــمي عام الفتن (رواه الدارمي)۔[۱]

''حضرت ابوالجوزاء سے روایت ہے کہ ایک سال اہل مدینہ سخت قحط میں مبتلا ہوئے تو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس شکایت لائے، انہوں نے فرمایا حضور ﷺ کے مزار اقدس کو دیکھو اور مزار اقدس سے ایک روشن دان آسمان کی طرف کھول دو، یہاں تک کہ مزار انور اور آسمان کے درمیان چھت نہ ہو، اہل مدینہ نے ایسا ہی کیا تو خوب بارش ہوئی، حتیٰ کہ جانوروں کا چارہ بھی بکثرت پیدا ہوا اور اونٹ چربی سے خوب موٹے ہو گئے، اور معلوم ہوتا تھا کہ چربی سے پھٹے جاتے ہیں تو اس سال کا نام عام الفتق رکھ دیا گیا۔(اس حدیث کو دارمی نے روایت کیا ہے)

حضرت ملا علی قاری 'مرقاۃ شرح مشکوٰۃ'' میں فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام حضور انور ﷺ کی حیات ظاہری میں بھی قحط سالی اور خشک سالی میں حضور ﷺ سے توسل کیا کرتے تھے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے وصال اقدس کے بعد بھی مزار انور سے توسل کیا اور حضور ﷺ سے توسل کیا، اور حضور ﷺ کے توسل کی برکت سے خلق اللہ اسی طرح خوشحال ہوئی جس طرح پہلے ہوتی تھی، اس مبارک حدیث سے آفتاب عالمتاب سے زیادہ روشن اور واضح ہو گیا کہ صحابہ کرام حضور انور ﷺ کے وصال مبارک کے بعد بھی حضور سے توسل کرتے تھے اور دونوں توسلوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ دیکھئے سرکار ﷺ کی ظاہری حیات میں بھی بارانِ رحمت کی طلب اور قحط سالی دور ہونے کے لئے توسل کیا گیا، اور وصال کے بعد بھی قبر انور سے خشک سالی دور ہونے اور باران نازل ہونے کے لئے توسل کیا گیا، اب معترض کا یہ کہنا کہ فوت شدہ بزرگوں سے توسل نہ کرتے تھے کیونکر درست ہو سکتا ہے۔

البتہ یہاں ایک شبہ باقی رہ جاتا ہے، وہ یہ کہ جب زندہ اور فوت شدہ دونوں قسم کے بزرگوں کا وسیلہ پکڑنا جائز ہے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خاص موقع پر رسول اللہ ﷺ کی بجائے حضرت عباس سے توسل کیوں کیا؟

---

[۱] سنن دارمی، دار المغنی للنشر والتوزیع، ریاض، سعودی عرب ۱۴۲۰ھ، ج ۱، ص ۲۲۷ ، باب ما اکرم اللہ تعالیٰ نبیہ بعد موتہ ، حدیث ۹۳

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر غور کیا جائے تو اچھی طرح واضح ہو جائے گا کہ یہاں حضرت عباس کی ذات سے توسل نہیں، یہ توسل بھی حضور سید عالم ﷺ ہی سے ہے، کیونکہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں "انا نتوسل الیك بعم نبینا" اے اللہ ہم تیرے نبی کے چچا کا وسیلہ اختیار کرتے ہیں، عم مضاف ہے نبی کی طرف یعنی حضرت عباس سے جو توسل کیا جارہا ہے، وہ نسبت اور اضافت کی بنا پر ہے، جو انہیں حضور سید عالم ﷺ کے ساتھ ہے، اس نسبت سے قطع نظر کرکے توسل نہیں، جب توسل کا دارومدار اس نسبت واضافت پر ہوا، تو ثابت ہوا کہ یہ توسل حضرت عباس سے نہیں، بلکہ حضور ﷺ سے ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ قبل الوصال حضور ﷺ سے بلا واسطہ توسل ہوتا تھا، اور یہ توسل بالواسطہ ہے۔

اور بالواسطہ توسل میں حکمت یہ ہے کہ اگر صحابہ کرام ہمیشہ بلا واسطہ توسل کرتے، اور حضور سید عالم ﷺ کی ذات گرامی کا بغیر واسطہ کے وسیلہ اختیار کرتے رہتے، نیز سرکار مدینہ ﷺ کے کسی غلام کے واسطہ سے کبھی توسل نہ کرتے، تو منکرین وسیلہ کہہ دیتے کہ حضور ﷺ کے سوا کسی سے توسل جائز ہی نہیں، یہ اگر جائز ہوتا تو صحابہ کرام کبھی تو کسی غیر نبی کا وسیلہ پکڑتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے توسل کرکے اس دعویٰ پر دلیل قائم کردی کہ جس طرح حضور ﷺ سے بلا واسطہ توسل جائز ہے، اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے غلاموں کے واسطہ سے بھی بلا شبہ توسل جائز اور صحیح ہے، اب قیامت تک ہر ولی اور بزرگ کے واسطہ کے ساتھ وسیلہ پکڑنے کا جواز ظاہر ہوگیا۔

مختصر یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے توسل فرما کر توسل کو آگے بڑھایا، اور وسیلہ کو عام کیا، اور اس امر پر نص فرمادی کہ یہ توسل حضور ﷺ کے ساتھ نسبت اور اضافت پر مبنی ہے، لہٰذا قیامت تک اللہ تعالیٰ کا جو نیک بندہ بھی اس نسبت اور اضافت کے شرف سے مشرف ہو، اس کے ساتھ وسیلہ اختیار کرنا شرعاً جائز اور درست ہے۔ [1]

---

[1] ماہنامہ "القائد" ملتان، شمارہ رمضان المبارک ۱۳۶۹ھ / جولائی ۱۹۵۰ء

حدیث نمبر (۵)

علم ''ما کان وما یکون''

عن عمر رضي الله تعالٰی عنه قال قام فینا رسول الله صلي الله علیه وسلم مقاما فاخبرنا عن بدء الخلق حتي دخل اهل الجنة منازلهم واهل النار منازلهم حفظ ذالك من حفظه ونسیه من نسیه رواه البخاري۔[1]

ترجمہ: سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالٰی عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان ایک مقام پر کھڑے ہوئے تو سرکار دو عالم ﷺ نے ہمیں ابتداء پیدائش عالم سے خبر دینی شروع کی یہاں تک کہ جنتی اپنی جگہوں میں داخل ہو گئے اور دوزخی اپنی جگہوں میں داخل ہو گئے، اس بیان مبارک کو جس نے (جتنا) یاد رکھا، یاد رکھا، اور جو بھول گیا وہ بھول گیا۔

تشریح

حدیث مبارک کا مطلب یہ ہے کہ حضور سید عالم ﷺ نے ابتداء عالم سے انتہا تک کائنات کا حال بیان فرما دیا، اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت عمرو بن اخطب انصاری رضی اللہ تعالٰی عنہ سے مسلم شریف میں بایں الفاظ مروی ہے: '' عن عمرو بن اخطب الانصاري رضي الله عنه قال صلّي بنا رسول الله ﷺ یوماً الفجر وصعد علي المنبر فخطبنا حتي حضرت الظهر فنزل فصلي ثم صعد المنبر فخطبنا حتي حضرت العصر ثم نزل فصلي ثم صعد المنبر فخطبنا حتي

[1] بخاری، ج ۲، پ ۱۳، کتاب بدء الخلق، مشکوۃ، جلد ۳

حدیث ۳۱۹۲، مکتبہ الرشد ریاض، سعودیہ ۲۰۰۶ ۱۴۲۶

غربت الشمس فاخبرنا بما ہو کائن الی یوم القیمۃ قال فاعلمنا احفظنا[1]

''حضرت عمرو بن اخطب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی اور منبر پر تشریف فرما ہو کر ہمیں خطبہ سنایا یہاں تک کہ ظہر کا وقت آگیا، پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام منبر سے اترے اور نماز پڑھنے کے بعد پھر منبر پر رونق افروز ہو گئے اور خطبہ فرمایا حتیٰ کہ عصر کا وقت آگیا، حضور ﷺ نے منبر سے اتر کر عصر کی نماز ادا فرمائی اس کے بعد پھر منبر پر تشریف لے گئے اور خطبہ فرمایا، یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا، اس دوران میں (فجر سے مغرب تک) حضور سید عالم ﷺ نے ہمیں ان تمام چیزوں کی خبر دی جو ہو گئیں اور جو ہونے والی ہیں، ہم میں جو سب سے زیادہ علم والا تھا وہ ہم سب سے زیادہ حضور ﷺ کی بیان فرمودہ چیزوں کو یاد رکھنے والا تھا''۔

بخاری و مسلم کی ان دونوں حدیثوں سے حضور سید عالم جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے تمام ما کان و ما یکون کا علم روز روشن کی طرح ثابت ہوا، منکرین صاحبان ان دونوں حدیثوں کے متعلق کہتے ہیں کہ ان حدیثوں کا یہ مطلب نہیں کہ حضور ﷺ نے ابتداء سے انتہا تک تمام مخلوق کے حالات بیان فرما دیئے، بلکہ قرب قیامت کے فتنے مراد ہیں، اور مطلب یہ ہے کہ قیامت کے قریب جو فتنے پیدا ہونے والے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ان فتنوں کو فجر سے مغرب تک بیان فرمایا۔

منکرین کے اس جواب سے یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہو جاتی ہے کہ ان کے دل آقائے نامدار تاجدار مدنی جناب احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کی عداوت سے لبریز ہیں، وہ ایک آن کے لئے بھی اس بات کو گوارہ نہیں کر سکتے کہ حضور ﷺ کے لئے کوئی کمال ثابت ہو، دونوں حدیثوں کے الفاظ پر غور فرمائیے، پہلی حدیث جو بخاری کی روایت ہے، اس میں

---

[1] مسلم شریف، جلد ثانی ص ۳۹۰

صاف موجود ہے '' فَاَخْبَرَنَا عَنْ بَدَاءِ الْخَلْقِ '' حضور ﷺ نے ابتداء خلق سے ہمیں خبر دی، یہاں تک کہ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہو گئے، دوسری حدیث جو مسلم نے روایت کی ہے، اس میں یہ جملہ صراحۃً موجود ہے '' فَاَخْبَرَنَا بِمَا كَانَ وَ بِمَا هُوَ كَائِنٌ '' رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ان تمام چیزوں کی خبر دی جو ہو چکیں اور جو ہونے والی ہیں۔

قارئین کرام انصاف فرمائیں گے کہ دونوں میں سے ایک حدیث میں بھی فتنوں کا ذکر نہیں، بلکہ ابتداء سے انتہا تک تمام مخلوقات کے حالات کی خبر دینا مذکور ہے، اور تمام گذشتہ اور آئندہ چیزوں سے اخبار وارد ہے، ایسی صورت میں حدیثوں کو فتنوں کی خبر میں منحصر کرنا فتنۂ شدیدہ میں مبتلا ہونا نہیں تو اور کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ منکر ہمارے آقا و مولا ﷺ کے علم اقدس کی وسعتوں کا ذکر نہیں سن سکتا، اس کی دلی عداوت اسے مجبور کرتی ہے کہ باوجود اقامتہ دلیل کے حبیب خدا ﷺ کی وسعت علمی کو سمیٹ کر کسی نہ کسی طرح تنگی اور اختصار کے دائرہ میں محصور و مقصور کیا جائے۔

اب دیکھئے محدثین اور شارحین حدیث ان دونوں حدیثوں کا کیا مطلب بیان کرتے ہیں:

علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ شارح بخاری حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے تحت ارقام فرماتے ہیں "والغرض انه اخبر عن المبداء والمعاش والمعاد جميعاً" (اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مبداء اور معاش اور معاد سب کی خبر دی)، اس کے بعد فرماتے ہیں "و فيه دلالة على انه اخبر فى المجلس الواحد بجميع احوال المخلوقات من ابتدائها الى انتهائها وفى ايراد ذالك كله فى مجلس واحد امر عظيم من خوارق العادة و كيف وقد اعطى جوامع الكلم مع ذالك"

(اور اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ حضور ﷺ نے ابتداء سے انتہا تک ایک ہی مجلس میں مخلوقات کے تمام احوال کی خبر دی اور اس سب کا ایک ہی مجلس میں وارد فرمانا خوارق عادۃ سے اعظم (یعنی عظیم الشان معجزہ) ہے، اور اس کا انکار کس طرح کیا جاسکتا ہے، حالانکہ عظیم الشان معجزہ کے باوجود حضور ﷺ کو جوامع الکلم (بے شمار معانی کثیرہ کو جمع کرنے والے) بھی عطا فرمائے ہیں)۔[1]

علامہ عینی کی اس ایمان افروز عبارت نے منکرین کی عیاری کا پردہ چاک کر دیا اور واضح طور پر بتادیا کہ سید عالم ﷺ نے صرف فتنوں ہی کا بیان نہیں فرمایا بلکہ ابتداء سے انتہا تک مخلوقات کے تمام احوال کو بیان فرمادیا، حضور اکرم سید عالم ﷺ کے اس بیان مبارک پر منکرین ہی کو شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ صبح سے شام تک ایک دن میں مخلوقات کے تمام احوال ابتداء سے انتہا تک کس طرح بیان فرمادیئے، مومن کے دل میں تو اس شبہ کی قطعاً گنجائش نہیں، کیونکہ وہ اپنے آقا و مولا ﷺ کے معجزات عظیمہ پر ایمان رکھتا ہے، وہ جانتا ہے جس ذات مقدسہ کو یہ طاقت حاصل ہے کہ زمین پر کھڑے ہوکر آسمان پر چاند کے دو ٹکڑے فرماسکتے ہیں اور ڈوبے ہوئے سورج کو واپس لا سکتے ہیں بلکہ اپنے رب کریم کے حکم سے رات کے قلیل ترین حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ اور وہاں سے ساتوں آسمانوں اور عرش و کرسی تک جا کر واپس آسکتے ہیں، اُن کے لئے یہ کیا دشوار ہے کہ صبح سے شام تک ایک دن میں ابتداء عالم سے انتہا تک ذرہ ذرہ کے تمام احوال کو بیان فرمادیں۔ والحمد للہ علی امانہ۔[2]

---

[1] عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری: جلد سابع، ص ۲۱۴_۲۱۵

[2] ماہنامہ "قائد" ملتان، شمارہ ذی قعدہ ۱۳۶۹ھ/ستمبر ۱۹۵۰ء، ص ۳۰_۳۱

حدیث نمبر (٦)

ایمان دار کون؟

''عن انس رضي الله تعالیٰ عنه قال قال رسول الله ﷺ لا یومن احدکم حتي اکون احب الیه من والده وولده والناس اجمعین۔ (متفق علیه)''[۱]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایمان دار نہ ہوگا کوئی فرد تمہارا، یہاں تک کہ میں اس کے نزدیک باپ اور اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہو جاؤں (یہ حدیث بخاری اور مسلم کی متفق علیہ ہے)۔

رسول اللہ ﷺ کا مومن کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہونا بایں معنیٰ ہے کہ اس کے اعتقاد میں رضائے رسول اللہ ﷺ ہر شخص کی رضا پر مقدم ہو، اور اس کا عقیدہ ہو کہ رضائے رسول کے خلاف کسی کی رضا قابل اعتناء نہیں، باپ ہو یا بیٹا، یا دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا آدمی کیوں نہ ہو، جس کی رضا رضائے رسول کے خلاف ہو وہ یقیناً واجب الردّ ہے، اور رسول اللہ ﷺ کی رضا جوئی فرض و واجب اور لازم و ضروری ہے، اس اعتقاد کا مفاد یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس کے نزدیک باپ، بیٹا اور بیٹی اور تمام جہان کے لوگوں سے زیادہ محبوب ہیں، کیونکہ تقدیم رضا جوئی احبیت کی دلیل ہے، محبت کے معنیٰ ہی یہ ہیں کہ محب کے اعتقاد میں محبوب کی رضا سب پر مقدم ہو، اگر بتقاضائے بشریت عملاً اس سے کوئی فروگذاشت ہو جائے اور وہ رضائے رسول کے خلاف ورزی کا گناہ کر بیٹھے، جیسے کوئی شخص احکام خداوندی پر ایمان رکھتے ہوئے حکم عدولی کرے، لیکن اس کا اعتقاد اس وقت بھی یہی ہو کہ جو کچھ میں نے کیا ہے، وہ معصیت ہے، میرے لئے ضروری تھا کہ حکم خداوندی اور رضائے رسول کو اپنی ہوائے نفس

---

[۱] صحیح بخاری شریف، کتاب الایمان، حدیث ۱۵، مطبوعہ دار ابن کثیر دمشق بیروت ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء، ص ۱۴

پر مقدم رکھتا، بایں معنی رسول اللہ ﷺ ہر مومن کے نزدیک اس کے ماں باپ اولاد اور تمام جہان کے لوگوں سے یقیناً زیادہ محبوب ہیں، دنیا میں کوئی ایسا مسلمان نہیں جو رضائے رسول کو ہر شخص کی رضا پر مقدم نہ سمجھتا ہو اور یہ اعتقاد نہ رکھتا ہو، اس اعتقاد کے ساتھ اس کی حکم عدولی اور خلاف ورزی فسق و فجور ضرور ہے، لیکن اس کو دائرۂ ایمان سے خارج نہیں کرتی، ہاں اگر عمل بھی اس اعتقاد کے موافق ہو جائے تو یہ مومن مناسبات ایمان اور مقتضیات اسلام کا حامل ہو کر صالحیت کے درجاتِ عالیہ پر بھی فائز ہو سکتا ہے۔

حدیث مذکور اس مفہوم میں بالکل صریح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی محبت کے بغیر ایمان نہیں ہوتا، نہ صرف محبت بلکہ سارے جہان سے زیادہ حضور ﷺ کی محبت جب تک نہ ہوگی، مومن ہونا متصور نہ ہوگا۔

اگر اس مقام پر یہ کہہ دیا جائے تو بعید از صواب نہ ہوگا کہ جس کی محبت سب سے زیادہ ہوتی ہے، محب کے دل میں اسی کی صورت نقش ہو جاتی ہے، اسی لئے وہ کسی وقت محبوب کو نہیں بھولتا۔ میت کو جب قبر میں رسول اللہ ﷺ کا جمال مبارک اور صورت زیبا نظر آئے گی اور اس وقت فرشتے اس سے سوال کریں گے ما تقول فی ھذا الرجل؟ بتا اس ذات مقدسہ کے متعلق کیا کہتا ہے؟ انہیں پہچانتا ہے یا نہیں؟ اس وقت مومن، جس کے دل میں حضور ﷺ کی محبت سب سے زیادہ ہوگی، فوراً حضور ﷺ کو پہچان لے گا اور کہے گا کہ یہ ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

اور کافر، جو حضور ﷺ کی محبت سے قطعاً محروم رہنے کے باعث اپنے دل میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صورت جمیلہ کا نقشِ جمیل نہیں رکھتا، وہ قطعاً نہیں پہچانے گا اور انتہائی پریشانی کی حالت میں کہے گا "ھاہ ھاہ لا ادری ھاہ ھاہ لا ادری" ہائے ہائے میں نہیں جانتا، ہائے ہائے میں نہیں جانتا۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی محبت کا سب سے زیادہ ہونا ہی ایمان اور موجب حصول نجات ہے۔

علامت محبت

اس مقام پر یہ بات بہت ہی قابل غور ہے کہ تمام اسلامی فرقے حضور ﷺ کی محبت کے مدعی ہیں، محبت ایسی چیز نہیں ہے جو ظاہر ہو، اس کا تعلق دل سے ہے، اور ظاہر ہے کہ دلوں کا حال ہمیں معلوم نہیں ہو سکتا، ایسی صورت میں ہم کس گروہ کو حضور ﷺ کا محب قرار دے کر اسے مومن سمجھیں اور کس فرقہ کے دعوائے محبت کو غلط جان کر اسے ناری قرار دیں۔

اس الجھن کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم دین متین اور عقل سلیم کی روشنی میں محبت کا ایسا معیار تلاش کریں جس کے ذریعہ حقیقت واقعیہ منکشف ہو جائے اور ہم بخوبی جان لیں کہ اصلی محبت کا حامل کون ہے؟

اس سلسلہ میں بعض حضرات کا مسلک یہ ہے کہ محبت کا معیار محبوب کی اتباع اور اس کی پیروی ہے، قاعدہ ہے ان الحب لمن یحب مطیع ''محب محبوب کا مطیع اور طابع فرمان ہوتا ہے''۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا: " قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله " ''میرے حبیب ﷺ آپ فرما دیجئے کہ اے لوگو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں محبوب بنا لے گا''۔

آیۂ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ محبت کی شرط اتباع و اطاعت ہے، لہذا جو گروہ متبع سنت اور پابند شریعت ہے وہی رسول اللہ ﷺ کا محب اور صحیح معنی میں مومن ہے۔

اس کے متعلق گذارش ہے کہ اتباع و اطاعت جسے معیار محبت قرار دیا گیا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ کیا حضور ﷺ کے اقوالِ مبارکہ و اعمالِ مقدسہ کے مطابق مطلقاً عمل کرنے کا نام اتباع و اطاعت ہے، یا اس میں کوئی قید بھی ملحوظ ہے؟

اگر ''مطلق عمل''، یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ان اعمال مقدسہ کی صرف نقل کو اتباع و اطاعت قرار دیا جائے، جن کی موافقت شرعاً مطلوب ہے تو تمام منافقین اور اعداء دین حضور ﷺ کے متبع اور اللہ تعالیٰ کے محبوب قرار پائیں گے، جو باوجود منافق ہونے

اور اپنے دل میں سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت رکھنے کے نماز روزہ اور دیگر اعمال حسنہ کرتے تھے، قرآن وحدیث سے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ منافقین کلمۂ شہادت پڑھتے تھے، نمازیں ادا کرتے اور مسجد میں بھی تعمیر کراتے تھے، جہاد میں بھی شریک ہوتے تھے، صحاح کی حدیثوں میں یہاں تک وارد ہوا کہ ایک بے دین وگمراہ قوم آخر زمانہ میں پیدا ہوگی، وہ قرآن پڑھے گی مگر قرآن ان کے گلوں سے نیچے نہیں اترے گا، سچے اور خاص مسلمان ان کی نمازوں کے مقابلہ میں اپنی نمازوں کو حقیر جانیں گے۔ ایسی صورت میں اس ظاہری اتباع واطاعت اور سنن کریمہ کی نقل کو کیونکر معیار محبت اور دلیل ایمان قرار دیا جاسکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن کریمہ اور آپ کے اقوال واعمال مقدسہ کی نقل محض اتباع واطاعت نہیں، نہ یہ نقل خاص معیار محبت اور دلیل ایمان ہے، یہ توری نقالی ہے جو کسی حال میں محمود ومستحسن نہیں ہوسکتی، بلکہ اگر ایسی نقالی کو تضحیک وتمسخر پر محمول کیا جائے تو بعید از عقل نہ ہوگا، اس لئے ضروری ہے کہ اتباع واطاعت کے معنی پر غور کیا جائے اور صحیح معیار محبت تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔

اتباع واطاعت

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فاتبعونی یحببکم اللہ فرما کر ہمیں بتادیا کہ اتباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کی محبوبیت ہے، محبوب کا دشمن کبھی محبوب نہیں ہوسکتا، پھر خدا کے محبوب کا دشمن خدائے قدوس کا محبوب کیونکر ہوسکتا ہے؟ ثابت ہوا کہ اس آیت کریمہ میں اتباع کے معنی بغیر محبت رسول کے ان کے سنن کریمہ کو نقل کرنا نہیں، بلکہ فاتبعونی کے معنی یہ ہیں کہ حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے نشہ میں مخمور اور ان کے جذباتِ الفت سے مجبور ہوکر بتقاضائے الفت ومحبت ان کی اداؤں کے سانچہ میں ڈھل جاؤ، یہ اتباع قطعاً حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کی دلیل ہے، مگر بات جہاں تھی وہیں رہی، سوال یہ ہے کہ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ

فلاں گروہ یا فلاں شخص حضور سید عالم ﷺ کی الفت ومحبت کے ساتھ ان کی سنن کریمہ پر عمل کر رہا ہے، اور فلاں آدمی بغیر محبت کے محض نقالی میں مصروف ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ محبت کا صحیح معیار نہ ملنے کی وجہ سے ہم اس اشکال کو حل کرنے سے عاجز رہے، آئیے دین متین کی روشنی میں محبت کا صحیح معیار تلاش کریں۔

حضور سید عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: عن ابی الدرداء عن النبی ﷺ قال حبك الشئ یعمی ویصم[1] "کہ انسان کو جب کسی سے محبت ہوجاتی ہے تو وہ محبت اس کو (محبوب کا عیب دیکھنے سے) اندھا اور (محبوب کا عیب سننے سے) بہرا کر دیتی ہے۔

اس حدیث مبارکہ سے روز روشن کی طرح ثابت ہوگیا کہ محبت کی ناقابل تردید دلیل اور صحیح معیار یہ ہے کہ مدعی محبوب کی آنکھ اور کان، محبوب کا عیب دیکھنے اور سننے سے پاک ہو، عقل سلیم کے نزدیک بھی محبت کا صحیح معیار یہی ہے، کیونکہ محبت کا مرکز حسن وجمال ہے، یہ ممکن ہی نہیں کہ محبت والی آنکھ کو محبوب کی ذات میں کوئی عیب نظر آئے، اور اگر کسی کو محبوب میں عیوب اور نقائص نظر آتے ہیں تو وہ اپنے دعوائے محبت میں جھوٹا ہے۔

اسی معیار پر موجودہ اسلامی فرقوں کو پرکھ لیجیے، کوئی گروہ خلفاء راشدین اور محبوبین رسول اللہ ﷺ کو کافر ومنافق کہہ کر ذات پاک مصطفیٰ ﷺ پر کفر ونفاق کی محبت کا عیب لگا رہا ہے، کوئی آل اطہار کی شان میں گستاخی کرکے سرور عالم کی شان گھٹا رہا ہے، کسی نے آقائے نامدار ﷺ کے کمال خاتمیت کا انکار کرکے تنقیص شان نبوت پر کمر باندھی ہوئی ہے، کوئی جماعت تاجدار مدنی ﷺ کی مقدس حدیثوں کی حجت کا انکار کرکے سرکار کی توہین میں مصروف ہے، کسی نے آقائے دو عالم ﷺ کے کمالاتِ علمیہ وعملیہ کا انکار کرکے تنقیص رسالت کی، کوئی کہتا ہے (نعوذ باللہ) وہ مر کر مٹی میں مل گئے، وہ ہمارے جیسے بشر اور بڑے بھائی کے برابر ہیں (نعوذ باللہ) ان کا علم شیطان اور ملک الموت سے بھی کم ہے، کوئی علی الاعلان کہہ رہا ہے کہ ان سے بے شمار غلطیاں ہوئیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان پر عتاب کیا۔

[1] سنن ابی داؤد، مطبوعہ مکتبۃ العصریہ بیروت، ج ۴، ص ۳۳۴، حدیث: ۵۱۳۰، کتاب الادب، باب فی الھوی

معمولی سمجھ رکھنے والا انسان بھی اس حقیقت کو نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ عقل وشرع سے جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اہل محبت کو محبوب میں کوئی عیب نظر نہیں آتا، نہ ان کا کان محبوب کا عیب سن سکتا ہے تو جس قوم کا شب و روز یہی وطیرہ ہو کہ قرآن وحدیث اور دلائل عقلیہ ونقلیہ سے آقائے نامدار ﷺ کی ذاتِ اقدس میں عیوب ونقائص ثابت کرنے کے درپے ہو، وہ کیونکر سرکار کی محبت کے دعویٰ میں صادق ہوسکتی ہے؟ محبت والی آنکھ کو محبوب کا واقعی عیب نظر نہیں آتا، حضور ﷺ تو بے عیب ہیں، جسے بے عیب میں عیب نظر آئے اس کا دعوائے محبت کہاں تک درست ہوگا۔

چشم بد اندیش کہ بر کندہ باش
عیب نماید ہنرش در نظر[1]

[1] ماہنامہ السعید ملتان شمارہ مارچ ۱۹۶۳ء ص ۸ تا ۱۰

حدیث نمبر (۷)

کمال عبدیت

لاتطروني كما اطرت النصاري ابن مريم فانما انا عبده فقولوا عبدالله ورسوله (بخاري۔ مسلم) ۱

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مجھے نہ بڑھاؤ جیسے نصاری نے عیسیٰ ابن مریم کو بڑھایا، میں اللہ کا صرف عبد ہوں، لہذا تم مجھے عبد اللہ ورسولہ کہو۔

"یہ حدیث صحیحین (بخاری ومسلم) کی متفق علیہ ہے، رسول اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے اس حدیث شریف میں ارشاد فرمایا کہ مجھے الوہیت اور معبودیت کے درجہ تک نہ بڑھاؤ ,جیسا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالی کا بیٹا کہہ کر انہیں الہ اور معبود بنایا اور مقام عبدیت ورسالت سے بڑھا کر معبودیت اور الوہیت تک پہنچادیا۔

جو لوگ اس حدیث کو پڑھ کر رسول اکرم سید عالم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کی شان رسالت اور کمال عبدیت بیان کرنے سے روکتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ شان رسالت اور کمال عبدیت کے مقام پر اور مرتبہ میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے حق میں مبالغہ ممکن نہیں، اس لئے کہ عبدیت ورسالت کا کوئی کمال ایسا نہیں جو اللہ تعالی نے اپنے حبیب سید عالم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کو عطا نہ فرمادیا ہو، نیز یہ کہ اس مقام عبدیت ورسالت میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے لئے کوئی حد نہیں نہ اس میں زیادتی اور مبالغہ متصور ہے، البتہ الوہیت اور معبودیت کی صفت اگر کوئی شخص معاذ اللہ رسول اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے لئے ثابت کرے تو یقیناً اس نے مبالغہ کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حد سے بڑھایا، لیکن کسی مسلمان کے حق میں یہ گمان کرنا کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کو الوہیت

۱ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، مطبوعہ مکتبۃ الرشد الریاض ۲۰۰۶/۱۴۲۷
حدیث نمبر ۳۴۴۵ ص ۵۷۱

اور معبودیت کے درجہ تک پہنچایا ہے، بڑا جرم اور گناہ عظیم ہے، کوئی مسلمان جو لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ اپنی زبان سے پڑھتا ہو اور دل سے اس کا یقین رکھتا ہو اس کے حق میں ان کا گمان شدید قسم کی سوء ظنی ہے، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ان بعض الظن اثم" یعنی بعض ظن گناہ ہوتے ہیں، مختصر یہ کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان اقدس بیان کرنے میں مبالغہ ممکن نہیں بجز اس کے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے الوہیت ثابت کی جائے اور اس حدیث میں خود اس کی تصریح موجود ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "لا تطرونی کما اطرت النصاری (الحدیث) یعنی مجھے ایسا نہ بڑھاؤ جیسا نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو بڑھایا۔

ظاہر ہے کہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو الٰہ مانا تھا جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" واذقال اللہ یعیسیٰ أانت قلت للناس اتخذونی وامی الٰهین من دونِ اللہ"۔ ثابت ہوا کہ حدیث مبارک میں حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو الٰہ ماننے کی نہی وارد ہے، یہ نہیں کہ ماسوائے الوہیت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان تسلیم کرنے سے منع کیا گیا ہو، حاشاوکلا ایسا ہرگز نہیں، بلکہ ہر وہ خوبی اور کمال جو الوہیت کے ماسویٰ ہے وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ثابت و متحقق ہے، حضرت شیخ محقق شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ (۹۵۸۔۱۰۵۲ھ/ ۱۵۵۱۔۱۶۴۲ء) اسی حدیث کی شرح کرتے ہوئے اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں!

(فارسی سے ترجمہ) "پس مجھے خدا کا بندہ اور اس کا رسول کہو، مقام عبدیت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مقام خاص اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صفت مخصوصہ ہے، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے عبد حقیقی ہیں اور اس وصف عبدیت میں سب سے زیادہ اتم واکمل ہیں اور آنحضرت ﷺ کی کمال مدح اور علو مقام اسی صفت عبدیت کی طرف اسناد کرنے میں ہے، حد سے بڑھانا اور مبالغہ کرنا حضور ﷺ کی مدح شریف میں راہ نہیں پاتا،

جس صفت کمال کا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے اثبات کریں اور جس کمال وخوبی کے ساتھ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف کریں وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرتبہ سے قاصر ہے، بجز اثبات صفت الوہیت کے کہ وہ درست نہیں۔

(شعر کا ترجمہ) "یعنی امر شرع اور دین کو محفوظ رکھنے کے لئے انہیں خدا نہ کہو، اس کے علاوہ جو صفت چاہو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں بیان کرو۔"

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ان کی حقیقت جانتا ہے نہ ان کی تعریف کرسکتا ہے، اس لئے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم حقیقت میں جیسے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، جیسا کہ خدا تعالیٰ کو ان کی طرح کوئی نہیں پہچانتا۔"[1]

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کے اس بیان سے واضح ہوگیا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں جو کمالات اور خوبیاں بیان کی جائیں وہ سب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مرتبہ سے قاصر ہیں اور کسی قسم کے اطراء ومبالغہ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعریف میں راہ نہیں ملتی، بجز اثبات الوہیت کے، اور یہ امر ظاہر ہے کہ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو روحانی طور پر حاضر ناظر سمجھنا، ابتداء آفرینش خلق سے دخول جنت ونار تک جمیع ماکان ومایکون کے علم کا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عالم ماننا، نیز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نور کہنا، اسی طرح خزائن الٰہیہ کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے دست کرم میں بعطاء الٰہی تسلیم کرنا، علیٰ ہذا القیاس جس قدر صفات وکمالات تاجدار مدینہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اہل سنت قرآن وحدیث کی روشنی میں ثابت مانتے ہیں، ان میں سے کوئی وصف بھی صفت الوہیت نہیں، لہٰذا کمالات مذکورہ کے ساتھ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی مدح وثنا کو معاذ اللہ اطراء اور مبالغہ کہنا دروغ بے فروغ ہے، امام شرف الدین بوصیری رحمتہ اللہ علیہ (۶۱۰۔۶۹۶ھ / ۱۲۱۳۔۱۲۶۹ء) نے قصیدہ بردہ میں کیا خوب فرمایا!

---

[1] اشعۃ اللمعات، ج ۴، ص ~~۹۳~~

دَعْ مَا ادَّ عته النصاري في نبيهم

واحكم بما شئت مدحاً فيه و احتكم

ترجمہ: چھوڑ دے اس چیز کو (یعنی الوہیت کو) جس کا دعویٰ کیا تھا نصاریٰ نے اپنے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اور حکم کر ہر اس چیز کے ساتھ جو تو چاہے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی مدح وثنا میں اور اس پر اچھی طرح پختہ اور مضبوط رہ۔[1]

[1] ماہنامہ السعید ملتان، ستمبر ۱۹۶۲ء، ص ۸۔۹

حدیث نمبر (۸)

کیا نبی کا ہر قول وحی ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عن عبداللہ بن عمرو قال کنت اکتب کل شئي اسمعه من رسول اللہ ﷺ ارید حفظه فنهتني قریش وقالوا اتکتب کل شئي تسمعه ورسول اللہ ﷺ بشر یتکلم في الغضب والرضاء فامسکت عن الکتابه فذکرت ذلك الی رسول اللہ ﷺ فاوماء باصبعه الی فیه فقال اکتب فوالذي نفسي بیده ما یخرج منه الا الحق۔[1]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں، میں رسول اللہ ﷺ سے ہر سنی ہوئی حدیث کو یاد کرنے کے لئے لکھ لیا کرتا تھا، قریش کے چند لوگوں نے مجھے روکا اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے ہر سنی ہوئی بات کو لکھ لیتے ہو، حالانکہ رسول اللہ ﷺ بشر ہیں وہ غضب اور رضا دونوں حالتوں میں کلام فرماتے ہیں، (قریش کی یہ بات سن کر) میں کتابت حدیث سے رک گیا اور میں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا سب کچھ لکھ لیا کرو، اور اپنی مبارک انگلی سے اپنے دہن اقدس کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جس ذات پاک کے قبضۂ قدرت میں میری جان مقدس ہے، میں اس کی قسم کھا کر فرماتا ہوں کہ اس دہن مبارک سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔[2]

---

[1] سنن ابوداؤد: ج ۳: ص ۱۰۱، ۱۰۲

[2] مجموعہ احادیث، از علامہ سید احمد سعید کاظمی، مطبوعہ بہاول پور ۱۳۸۳ھ، ص ۱۶،۱۵

ایک سوال:

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے "تحفہ اثنا عشریہ" میں مطاعن فاروق اعظم کے تحت لکھا ہے کہ نبی کا ہر قول وحی الٰہی نہیں، اپنے اس دعوے کی دلیل میں انہوں نے چند آیات پیش کی ہیں، مثلاً:

ا۔"عفا الله عنك لم اذنت لهم "(سورۃ توبہ)، یہاں رب نے عتاب فرمایا۔

۲۔"لولا كتاب من الله سبق لمسكم فيما اخذتم عذاب عظيم" سورۃ الانفعال)، بدر کے قیدیوں سے فدیہ قبول کرنے پر اس قدر سختی کیوں وقوع میں آئی۔

حالانکہ ہم اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ نبی کا ہر قول وحی ہے، جیسے کہ ابوداؤد شریف کی حدیث ہے: "فوالذی نفسی بیده ما یخرج منه الاحق"۔[1]

جواب:

اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ نبی کا ہر قول من حیث النبوۃ والرسالت وحی ہے، قرآن وحدیث میں واضح طور پر فرمادیا گیا ہے کہ نبی کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔

(۱) نبوت اور رسالت

(۲) بشریت

نبی کریم رؤف رحیم ﷺ کا ہر قول وحی منزل من اللہ ہونا پہلی جہت کے ساتھ مختص ہے، نبی کریم ﷺ کے ایسے قول کو قبول نہ کرنا کفر ہے جو نبوت ورسالت کی جہت سے صادر ہوا ہو، بخلاف اس قول کے جس کا صدور من حیث البشریت ہو کہ اسے تسلیم نہ کرنا ہرگز کفر نہیں۔

---

[1] یہ سوال غالباً مولانا محمد شفیع اوکاڑوی علیہ الرحمہ (کراچی) نے کیا تھا۔ فانی

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ تحفہ اثنا عشریہ میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات مقدسہ سے اس طعن کو دفع فرمارہے ہیں کہ انہوں نے حکم نبوی "ایتونی بقرطاس" حسبنا کتاب اللہ کہہ کر رد کر دیا، طعن کا خلاصہ یہ ہے کہ پیغمبر کا ہر قول وحی منزل من اللہ ہے اور وحی منزل من اللہ کا رد کفر ہے، لہذا حضرت عمر (معاذ اللہ) کافر ہو گئے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ہر حکم وحی نہیں، شاہ صاحب کا مقصد یہ ہے کہ وحی منزل من اللہ حضور ﷺ کا وہی حکم ہے جو من حیث الرسالت ہو اور اسی کا رد کرنا کفر ہے، لیکن جو حکم من حیث البشریت ہو وہ وحی منزل من اللہ نہیں ہو سکتا نہ اس کا انکار کفر قرار پا سکتا ہے، لہذا جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ یہ حکم من حیث الرسالت ہے، اس وقت تک اس کے انکار کو کفر قرار دینا ہرگز صحیح نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم "ایتونی بقرطاس من جهت الرسالت" نہ تھا کیونکہ اس کے مقتضیٰ پر کسی نے عمل نہیں کیا، اگر اس حکم کو من جهت الرسالت کہا جائے تو حضور نبی کریم ﷺ کی ذات مقدسہ پر بھی حکم خداوندی فاستقم کما اُمِرت کے خلاف ورزی کا الزام عائد ہوگا جو باطل محض ہے، لہذا واضح ہو گیا کہ یہ امر من جہت الرسالت نہ تھا پھر اسے تسلیم نہ کرنے کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر طعن کرنا اور ان پر کفر کا الزام لگانا کیونکر درست ہو سکتا ہے۔

یہ امر آخر ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ہر وہ قول جو من حیث البشریت ہو وحی منزل من اللہ نہ ہونے کے باوجود بھی حق ہے، کیونکہ حق ہونے کے لئے وحی ہونا ضروری نہیں، ان دونوں میں عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے، ہر وحی کا حق ہونا ضروری ہے اور ہر حق کا وحی ہونا ضروری نہیں، (ابوداؤد شریف) کی حدیث میں مایخرج منہ الا حق وارد ہے الا وحی نہیں، حضرت شاہ صاحب نے بھی حضور اکرم ﷺ کے ہر قول کے وحی ہونے کی نفی کی ہے، حق

ہونے کی نفی نہیں کی۔

رہا یہ امر کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کریمہ: "وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی" کو قرآن مجید کے ساتھ مخصوص قرار دیا تو یہ مثال نزول کے اعتبار سے ہے اور اس کی تخصیص کا مقصد صرف یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو جو نطق من حیث الرسالت نہ ہو اس آیت کریمہ سے اسے وحی منزل من اللہ ثابت کرنا اور اس پر طعن کی بنیاد رکھنا بنا الفاسد علی الفاسد ہے، یہ مقصد ہرگز نہیں کہ قرآن مجید سے سوا حضور ﷺ کا کوئی نطق بھی وحی الٰہی نہیں ہے خواہ وہ من جہت الرسالت ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ اس تقریر پر علی الاطلاق تمام احادیث نبویہ کے وحی ہونے کا انکار لازم آئے گا جو کفر خالص ہے، جن آیات کو حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دعویٰ کی دلیل میں پیش فرمایا، ان کے مطالب میں ادنیٰ تامل کے بعد یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ جن اقوال وافعال مبارکہ پر اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی طرف عتاب نازل فرمایا وہ فی الواقع من حیث الرسالت حضور اکرم ﷺ سے سرزد نہ ہوئے تھے، اسی لئے وہ وحی الٰہی بھی نہیں ہوسکتے لیکن ان کے وحی نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ معصیت یا حق کے خلاف تھے، کیونکہ حضور ﷺ اس سے معصوم ہیں کہ آپ سے کوئی معصیت یا خلاف حق قول یا فعل صادر ہو، البتہ یہ ممکن ہے کہ من حیث البشریت حضور ﷺ سے کوئی ایسا قول یا فعل سرزد ہو جائے جو خلاف حق تو نہ ہو مگر کسی اعتبار سے خلاف اولیٰ ہو اور واقعہ یہ ہے کہ ایسے ہی امور منشاء عتاب ہیں۔

یہاں اس امر کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ عتاب میں خواہ شہرت بھی کیوں نہ ہو وہ محض صورۃً عتاب ہے، حقیقتاً مبنی بر حکمت ہونے کی وجہ سے وہ خطاب محبت ہے، اس اجمال کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہم نے دیگر مضامین میں مدلل طور پر سے بیان کر دیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ نبی کریم ﷺ کا نطق مبارک مطلقاً ہوس سے پاک ہے اور وہ دو حال سے خالی نہیں یا من جہت الرسالت ہوگا یا من جہت البشریت، پہلی صورت میں وحی الٰہی ہے،

عام اس سے کہ وحی متلو ہو یا غیر متلو اور دوسری صورت میں حق ہے عام اس سے کہ کسی اعتبار خاص سے وہ خلاف اولیٰ (یعنی افضل کو چھوڑ کر فاضل کرنا، احسن کو چھوڑ کر حسن کرنا، اصوب کو چھوڑ کر صواب کرنا۔ از علامہ منظور احمد فیضی، مقام رسول، ص ۵۰۵) ہو یا نہ ہو، جن علماء اہل سنت نے رسول اللہ ﷺ سے جمیع اقوال و افعال اور جملہ احوال شریفہ کو وحی قرار دیا، ان کے پیش نظر صرف جہت رسالت ہے اور جن حضرات نے حضور ﷺ کے جمیع اقوال و افعال و احوال کے وحی ہونے کا انکار کیا ان کے پیش نظر جہت بشریت بھی ہے، ان حضرات نے صرف انہی قوال و افعال کو وحی قرار دیا جو جہت رسالت سے ہوں، اور جن کا صدور جہت بشریت سے ہو ان کے وحی منزل من اللہ ہونے کی انہوں نے نفی فرمائی، اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ دونوں میں کوئی تعارض نہیں، لیکن کسی اہل سنت عالم دین نے حضور نبی کریم ﷺ کے کسی قول یا فعل یا حال کو خلاف حق قرار نہیں دیا حتیٰ کہ بعثت مقدسہ سے قبل بھی حضور ﷺ کو خلاف حق امور سے پاک مانا، مضمون کی حد تک فقیر نے وضاحت کر دی ہے اور یہ وضاحت ایسی ہے کہ اس کی روشنی میں اہل علم پر اس کے دلائل واضح ہوتے چلے جائیں گے اگر اب بھی کوئی شبہہ باقی رہ گیا ہو تو تحریر کیجئے ان شاء اللہ پھر جواب دیا جائے گا اور اگر آپ مطمئن ہو جائیں تو بذریعہ خط فقیر کو اطلاع ضرور دیں تا کہ تردد نہ رہے۔ [1]

---

[1] ماہنامہ ترجمان اہل سنت، کراچی، شمارہ اگست ۱۹۷۱ء

حدیث نمبر (۹)

عبداللہ بن ابی منافق کی نماز جنازہ

'' حدثنا مُسددٌ قال حدثنا يحيى بن سعيد عن عبيد الله قال حدثني نافع عن ابن عمر رضي الله عنهما ان عبدالله بن ابي لما توفي جاء ابنه الي النبي صلي الله عليه وسلم فقال يارسول الله اعطي قميصك اكفنه فيه، وصل عليه واستغفر له ۔ فاعطاه النبي صلي الله عليه وسلم قميصه فقال: آذني أُصلي عليه ۔ فآذنه ۔ فلما اراد اَن يصلي عليه جذبه عمر رضي الله عنه فقال: اليس الله قد نهاك ان تصلي علي المنافقين؟ فقال: انا بين خيرتين، قال (استغفر لهم اَو لا تستغفر لهم إن تستغفر لهم سبعين مرة فلن يغفر الله لهم) فصلي عليه ۔ فنزلت (ولا تصل علي احد منهم مات ابداً ولا تقم علي قبره) '' [1]

'' حدثنا مالك بن اسمٰعيل قال حدثنا ابن عيينة عن عمرو سمع جابرا قال اتي النبي صلي الله عليه وسلم عبدالله بن ابي بعد ما دفن فاخرجه فنفث فيه من ريقه و آلبسه قميصه ۔ '' [2]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روائت ہے کہ عبداللہ بن اُبی (منافق) مر گیا تو اس کا بیٹا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا یارسول اللہ! مجھے اپنا کرتہ دیں اس کو اس میں کفن دوں، اور آپ اس نماز پڑھیں اور اس کے لئے مغفرت کی دعا کریں،

---

[1] صحیح بخاری: حدیث ۱۲۶۹ (دار ابن کثیر دمشق ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء، ص ۳۰۷)

[2] بخاری، کتاب الجنائز، حدیث ۱۲۷۰

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کرتہ اسے دیا اور فرمایا مجھے اطلاع کرنا میں اس پر نماز پڑھوں گا، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس پر نماز پڑھنے کا ارادہ فرمایا تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ کا دامن کھینچا اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو منافقوں پر نماز پڑھنے سے منع نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا مجھے دونوں باتوں کا اختیار دیا گیا ہے (یعنی ان کے لئے دعا کروں یا نہ کروں)، اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ان کے مغفرت کی دعا کریں یا نہ کریں، اگر ان کے لئے ستر بار مغفرت کی دعا کریں اللہ ان کو ہرگز نہ بخشے گا" پس آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی تو آیت کریمہ نازل ہوئی "اور ان (منافقوں) میں سے جو مر جائے اس کی نماز جنازہ ہرگز نہ پڑھیں اور نہ ان کی قبر پر کھڑے ہوں"۔

ترجمہ: سفیان بن عیینہ نے عمرو سے روایت کی انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے سنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن اُبی کے پاس تشریف لے گئے جب کہ اُسے دفن کر دیا تھا، اُسے نکالا گیا تو آپ نے اُس کے منہ میں اپنا لعاب دہن ڈالا اور اُسے اپنی قمیص پہنائی۔

شبہات

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن اُبی منافق کی نماز جنازہ پڑھائی، اس کے لئے استغفار فرمایا، اپنی قمیص مبارک اور لعاب دہن اقدس اسے عطا فرمایا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی چیز کا فائدہ متحقق نہ ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا: اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۔[1]

''آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں، اگر ستر مرتبہ بھی آپ ان کے لئے استغفار کریں تو اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا''۔

اس واقعہ سے حسب ذیل شکوک پیدا ہوئے:

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر اس بات کا علم ہوتا کہ عبداللہ بن ابی کی مغفرت نہ ہوگی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لئے ہرگز استغفار نہ فرماتے، نہ اس کی نماز جنازہ پڑھتے۔

۲۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار ہوتا تو اپنی دعا اور استغفار کو نیز قمیص مبارک اور لعاب دہن اقدس کو بے فائدہ ہونے سے بچا لیتے اور عبداللہ بن ابی کو فائدہ پہنچا دیتے۔ جب ایسا نہ ہو سکا تو معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح علم نہ تھا ایسے ہی اختیار بھی نہ تھا۔

واقعہ عبداللہ بن اُبی منافق

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول، بنو حبلی کا سردار اور یثرب کا ذی اثر آدمی تھا، لوگوں کا خیال تھا کہ اسے اپنا سردار مان لیں لیکن جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے، پھر وہ اس حیثیت میں نہ رہا کہ لوگ اسے اپنا سردار مان لیں، یہ ایسا صدمہ تھا جو اس کے لئے نفاق کا مرض بن گیا، جب اس نے

---

[1] سورۃ التوبہ آیت ۸۰

دیکھا کہ اسلام دن بدن پھیلتا جا رہا ہے تو اس نے مجبور ہو کر بظاہر مسلمان ہونے کا اعلان کیا، لیکن اس کے دل میں عداوت تھی اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو بڑا اعناد تھا، درپردہ سازشوں سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے درپئے آزار رہتا تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی موقع ملے تو میں نقصان پہنچاؤں، بہر حال اس نے کسر نہ چھوڑی، جہاں جہاں اس کو موقع ملا اس نے نقصان پہنچانے کی پوری کوشش کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو ذلیل کیا۔

۱۰ ہجری میں شوال کے آخر میں بیس دن بیمار رہ کر وہ مر گیا، اس کا بیٹا (حباب) جس کا نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ رکھا، جو مخلص صالح مومن تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی حضور! میرا والد فوت ہو گیا ہے، آپ اپنا کرتہ شریف عنایت فرمائیں تاکہ اس کو اس میں کفن دوں اور آپ اس کی نماز جنازہ بھی پڑھائیں اور اس کی مغفرت کی دعا بھی فرمائیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس استدعا کو قبول فرما لیا، کیونکہ مومن کا دل خوش کرنا بھی عبادت اور بڑی نیکی ہے۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی نماز جنازہ پڑھانے کے لئے تشریف لے گئے، جب آپ نے اس پر نماز پڑھنے کا ارادہ فرمایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو منافقین پر نماز پڑھنے سے منع نہیں کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے دونوں باتوں کا اختیار دیا گیا ہے (کہ مغفرت طلب کروں یا نہ کروں)، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بھی عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے آپ ان کے لئے مغفرت طلب کریں یا نہ کریں اگر آپ ستر مرتبہ بھی ان کی مغفرت طلب کریں تو اللہ ان کو نہ بخشے گا، اور ایک روایت یہ بھی ہے:

"عن عمر بن الخطاب رضي الله عنه انه قال لما مات عبدالله بن ابي سلول دُعي له رسول الله ﷺ ليصلي عليه

فلما قام رسول الله ﷺ وثبت اليه فقلت يا رسول الله اتصلي علي ابن ابي وقد قال يوم كذا وكذا، كذا وكذا أُعدد عليه قوله۔ فتبسم رسول الله ﷺ وقال اخر عني يا عمر فلما اكثرت عليه قال: اني خيرت فاخترت۔ لو اعلم اني ان زدت علي سبعين يغفر له لزدت عليها۔ قال فصلي عليه رسول الله ﷺ، ثم انصرف فلم يمكث الا يسيرا حتي نزلت الآيتان من براءة (ولا تصل علي احد منهم مات ابدا۔ الي۔ وهم فاسقون) قال: فعجبت بعد من جرأتي علي رسول الله ﷺ يومئذ، والله ورسوله اعلم[1]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ عبداللہ بن ابی پر نماز پڑھتے ہیں حالانکہ اس نے فلاں فلاں روز ایسا کہا تھا اور اس کی باتیں شمار کیں، تو حضور نبی کریم ﷺ نے مسکرا کر فرمایا اے عمر مجھ سے پرے ہٹ جاؤ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زیادہ عرض کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا میں اختیار دیا گیا ہوں (کہ مغفرت طلب کروں یا چھوڑ دوں) اگر میں جانتا ہوتا کہ ستر مرتبہ سے زیادہ مغفرت طلب کرنے سے اس کی بخشش ہوگی تو میں ضرور کرتا، پس آپ نے نماز جنازہ پڑھی یہاں تک سورہ توبہ کی دو آیتیں نازل ہوئیں "وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ فَاسِقُونَ" (سورۃ التوبہ، آیت ۸۴)

''اور آپ ان میں سے کسی کی میت پر کبھی نماز نہ پڑھیں اور نہ (کبھی) ان میں سے کسی کی قبر پر کھڑے ہوں بے شک انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور وہ نافرمان ہونے کی حالت میں مرگئے''۔

کتاب الجنائز، باب ما یکرہ من الصلاۃ علی المنافقین، مطبوعہ دار ابن کثیر دمشق ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء

[1] صحیح بخاری، حدیث ۱۳۶۶

حدیث ۱۳۶۶، ص ۳۲۳

یہ سب کچھ میرے آقا حضور نبی کریم ﷺ نے اپنی اس رحمت کی بنا پر کیا جو دوست اور دشمن سب کے لئے عام تھی، یہی وجہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس بدترین دشمن کے حق میں دعائے مغفرت کرنے میں تامل نہ کیا، جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ممانعت میں آیت نازل ہوئی تو پھر اس کے بعد آپ نے کبھی بھی کسی منافق کی نماز نہیں پڑھائی۔

حضور نبی کریم ﷺ پر شفقت کا ایسا غلبہ تھا کہ اس غلبہ حالِ رحمت میں جو نبی کریم ﷺ کی شفقت تھی وہ بے اختیار عام ہوگئی اور اس عموم شفقت غلبہ حال کا جو طاری ہونا تھا وہ حضور ﷺ کے رحمۃ اللعالمین ہونے کا مظہر تھا، جب کریم پر رحمت اور سخاوت کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ رحمت کا حق دار ہے یا نہیں، جب بارانِ رحمت ہوتی ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ شور والی زمین پر بارش نہ ہو اور اچھی زمین پر ہو، بلکہ جب رحمت کی بارش برستی ہے تو ہر جگہ برستی ہے، یہ رحمت عام ہے، اس وقت حضور ﷺ کے لئے یہ حکم نہیں تھا کہ مغفرت طلب نہ کریں بلکہ یہ فرمایا کہ ان کے لئے مغفرت طلب کریں یا نہ کریں، اگر ستر مرتبہ بھی ان کی مغفرت طلب فرمائیں تو ان کی مغفرت نہ ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو کوئی ایسا حکم نہیں دیا تھا کہ آپ ان کے حق میں استغفار نہ فرمائیں جو معصیت قرار پائے، اگر اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی ہوتی تو معصیت ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ نے کوئی حکم نہیں دیا، کیونکہ اس سے پہلے ممانعت مشرکین کے حق میں تھی اور یہ منافقین کا معاملہ تھا "مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَن يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ" [1]

نبی اور ایمان والوں کی شان کے لائق نہیں کہ وہ مشرکوں کے لئے مغفرت طلب کریں۔ تو یہاں مغفرت طلب کرنے سے تو اللہ تعالیٰ نے منع نہیں فرمایا بلکہ فرمایا اگر آپ اللہ تعالیٰ سے ستر مرتبہ بھی ان کی مغفرت طلب فرمائیں تو اللہ تعالیٰ ان کو معاف نہیں کرے گا۔

---

[1] سورۃ التوبہ: آیت ۱۱۳

شاید کوئی یہ سوچے کہ پھر تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول نہ ہوئی تو یہ بات نہیں ہے، یہ غلط ہے، کیونکہ حدیث شریف میں ہے "لکل نبی دعوۃ مستجابۃ" (بخاری: حدیث ۶۳۰۴) یعنی ہر نبی مستجاب الدعوات ہے، اور حدیث میں ہے کہ ہر نبی کے لئے ایک دعا ہے جو ضرور قبول کی جائے گی، اس سے معلوم ہوا کہ بعض دعائیں قبول نہیں کی جاتیں، یہ غلط ہے، اس کا مفہوم یہ نہیں ہے، اس پر ایک اصولی بات کہہ دوں وہ ذہن میں رکھئے، ہمارا ایمان ہے کہ مومن کی دعا بھی اگر شرائط دعا کے ساتھ متصف ہو تو رد نہیں ہوتی اور نبی کی دعا کے متعلق یہ مومن کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا کہ وہ رد ہو جائے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وقال ربکم ادعونی استجب لکم" میرے بندو مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا، عام بندوں کے لئے ہے کہ تم دعا کرو میں قبول کروں گا تو نبی کے لئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم دعا کرو میں قبول نہیں کروں گا، شاید کوئی یہ سوچے کہ نبی غلط دعا مانگے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا رب ارنی حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدسہ کا جمال بشری آنکھوں کے ساتھ نہیں ہو سکتا، تو میں کہتا ہوں کہ جو غلط دعا مانگے وہ نبی ہو ہی نہیں سکتا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو کہا کہ رب ارنی حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدسہ کا جمال بشری آنکھوں کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔

یہ نہ ہو سکنا محال عادی ہے، محال عقلی نہیں ہے اور یہ محال ہوتا حقیقتاً تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کبھی ان لفظوں میں دعا نہ فرماتے۔ اُن کا دعا فرمانا دلیل ہے کہ یہ ممکن ہے نفسہٖ، کیونکہ امر غیر ممکن کی دعا نبی کے لئے جائز نہیں، مقام نبوت بہت بلند ہے، غیر ممکن دعا نبی کر ہی نہیں سکتا اور اجابت دعا تو حق ہے یہ ممکن نہیں کہ اجابت نہ ہو لیکن اجابت کی انواع ہیں۔

اجابت کی پہلی قسم یہ ہے کہ مانگنے والے نے جو چیز مانگی وہی چیز بعینہٖ عطا کر دی جائے۔ انبیاء علیہم السلام کی دعائیں کلیۃً اسی نوعیت کی ہوتی ہیں، الا ماشاء اللہ، لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نبی کی دعا تو قبول فرمائے لیکن بعینہٖ قبول کرنے کی

بجائے اس کی مثل عطا فرمادے، اور یہ کیوں؟ اس لئے نہیں کہ جو چیز نبی نے مانگی وہ اللہ تعالیٰ دے نہیں سکتا یا جو چیز نبی نے مانگی وہی مل جانی چاہئے تھی یہ بات نہیں، بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کے دامن میں نبی کی اُمت کو رکھتا ہے، تو اُمت کی بعض ایسی دعائیں ہوں گی جو بعطائے مثل کے ماتحت اجابت ہوں گی، اگر نبی کی کوئی دعا اس نوعیت کے ساتھ مستجاب نہ ہو تو پھر ان کی اُمت کی ان دعاؤں کو کس کے دامن میں پناہ ملے گی، اس حکمت کے لئے انبیاء علیہم السلام کی بعض دعائیں ایسی ہوتی ہیں جو مستجاب تو یقیناً ہوتی ہیں لیکن کبھی بعطائے مثل کے تحت ان کی اجابت ہوتی ہے۔

میں اس مسئلہ کی وضاحت کر دوں کیونکہ عربی کے الفاظ علماء تو سمجھ سکیں گے لیکن جو عربی نہیں جانتے ان کے لئے عرض کرتا ہوں کہ ایک آدمی نے دُعا کی کہ اے اللہ مجھے ایک ہزار روپے عطا فرمادے، اب سجدے سے سر اٹھایا تو ایک ہزار روپیہ مل گیا، یعنی جو مانگا وہی مل گیا، یہ اجابت کی پہلی قسم ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہزار روپیہ کی دُعا کی، وہ ہزار روپیہ تو نہیں ملا مگر اس رقم کے برابر وہی چیز عطا فرمادی، اس میں حکمت تھی کہ اس کو وہی چیز درکار تھی اور اگر یہ ہزار روپے خرچ کرتا تو وہی چیز مل نہیں سکتی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے وہی چیز عطا فرمادی جو اس کے لئے مناسب تھی۔

تیسری قسم اجابت کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ اے اللہ مجھے ایک ہزار روپے عطا فرمادے، اب نہ تو ہزار روپے ملے اور نہ اس کی مثل کوئی چیز ملی، اب آپ کہیں گے کہ دُعا قبول نہ ہوئی، تو ایسا نہیں، آپ پر کوئی مصیبت آنے والی تھی وہ اس ہزار روپیہ سے بھی رفع نہ ہوتی، وہ مصیبت ٹال دی، اس مصیبت کا ٹلنا اس دُعا پر تھا کہ یہ بندہ دُعا کرے اور میں اس مصیبت کو ٹال دوں۔

چوتھی قسم یہ ہے کہ بندے نے دُعا کی اے اللہ مجھے ایک ہزار روپیہ عطا فرمادے،

اب نہ تو ہزار روپیہ ملا، نہ اس کی مثل کوئی چیز ملی اور نہ ہی کوئی مصیبت ٹلی، اب کوئی بات بھی نہ ہوئی، تو عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی دُعا کو آخرت کا ذخیرہ بنا دیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی اجابت کو فانی دنیا کے لئے پورا نہ کیا بلکہ باقی رہنے والی اجابت کی صورت میں پورا کیا، تو ذخیرہ آخرت کسی دُعا کا بن جانا یہ بھی اجابت ہے۔

اَب گذارش ہے کہ حضور ﷺ کا عبداللہ بن ابی کے حق میں استغفار اور اس کی نماز جنازہ وعلیٰ ھذا القیاس قمیص مبارک ولعاب دہن اقدس کا اعطاء عبداللہ بن ابی کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے نہ تھا بلکہ کسی دوسرے مقصد کے لئے نبی کریم ﷺ نے یہ سب کچھ کیا اور وہ یہ تھا کہ اس کی قوم کے ایک ہزار آدمی اسلام لے آئیں چنانچہ ایسا ہی ہوا، پھر یہ کہ نبی اکرم ﷺ کا ایسے موذی منافق کو انتہائی کرم سے نوازنا عظیم ترین مکارم اخلاق کا ثبوت ہے، اور قمیص مبارک کا مقصد بھی اس کو نفع پہنچانا نہ تھا بلکہ مکافاۃ مقصود تھی، کیونکہ عبداللہ بن ابی نے عم رسول ﷺ حضرت عباس بن عبدالمطلب کو بدر کے موقع پر اپنی قمیص پہنائی تھی، رسول اللہ ﷺ کی غیرت نے اس بات کا تقاضا نہ فرمایا کہ اس کے اس فعل کو مکافاۃ اور بدلے کے بغیر چھوڑ دیا جائے، دیکھئے تفسیر خازن میں ہے :

''وقال الشيخ محي الدين النووي انما أعطاه قميصه ليكفنه فيه طيب القلب ابنه عبدالله : فانه كان صحابيه صالحا وقد سأل ذلك فاجابه اليه وقيل بل أعطاه مكافاة لعبدالله بن ابي المنافق الميت لانه ألبس العباس حين أسر يوم بدر قميصا وفي الحديث بيان مكارم أخلاق النبي صلى الله عليه وسلم فقد علم ماكان من هذا المنافق من الايذاء له وقابله بالحسنى وألبسه قميصه كفنا وصلى عليه واستغفر له قال الله سبحانه وتعالى وانك لعلى خلق عظيم: وقال البغوي سفيان بن عينه كانت له يد عند

رسول الله صلي الله عليه وسلم فاحب ان يكافئه بها ويروي ان النبي صلي الله عليه وسلم كلم فيما فعل بعبد الله بن ابي فقال صلي الله عليه وسلم وما يغني عنه قميصي وصلاتي من الله والله اني كنت ارجوا أن يسلم به الف من قومه. فيروي أنه أسلم ألف من قومه لما رأوه يتبرك بقميص النبي صلي الله عليه وسلم''۔[1]

ترجمہ:''اور کہا شیخ محی الدین نووی نے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کو اپنی قمیص مبارک اس کے کفن کے لئے صرف اس لئے دی کہ اس کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا دل خوش ہو جائے کیونکہ وہ نہایت صالح صحابی تھے اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا جن کی استدعا حضور نے مان لی تھی، اور ایک قول یہ بھی ہے کہ حضور نے اپنی وہ قمیص مبارک عبداللہ بن ابی کو محض اس کا بدلہ اُتارنے کے لئے دی تھی کیونکہ بدر کے موقع پر عبداللہ بن ابی نے آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اپنی قمیص پہنائی تھی، اور اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم الشان مکارم اخلاق کا بیان ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن ابی کی تمام ایذا رسانیوں کو جانتے تھے، اس کے باوجود بھی ایسی نیکیوں کے ساتھ اُس کو نوازا، اور اپنی قمیص مبارک اس کو کفن کے لئے دی اور اس پر نماز پڑھی اور اس کے لئے استغفار فرمایا، یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال خلق عظیم ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا انک لعلی خلق عظیم، اور بغوی نے کہا سفیان بن عیینہ نے فرمایا کہ عبداللہ بن ابی کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بظاہر احسان تھا، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ اپنی قمیص مبارک کے ذریعے اس کا احسان اُتار دیں، اور مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے منافق کے ساتھ یہ برتاؤ

---

[1] تفسیر خازن، ج ۳، ص ~~۲۲۲~~ سورۃ التوبہ آیت ۸۴ ... ص ۱۶۸ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۵ء

کیونکر کیا، تو حضور ﷺ نے فرمایا میری قمیص اور نماز اللہ تعالیٰ کے عذاب کو اس سے بالکل دفع نہ کرے گی، خدا کی قسم مجھے اُمید تھی کہ اس کی قوم کے ایک ہزار آدمی اسلام لائیں گے، چنانچہ مروی ہے کہ اس کی قوم کے ایک ہزار آدمی اسلام لے آئے، جب اس کی قوم نے اسے دیکھا کہ حضور ﷺ کی قمیص مبارک سے تبرک کر رہا ہے"۔

البخس

تفسیر سراج المنیر، جلد ۱ص ~~۱۳۸۲~~ ۶۱۲ پر الفاظ یہ ہیں:

"فقال عمر رضي الله عنه لم تعط قميصك للرجس النجـ فقال ﷺ ان قميصي لا يغني عنه من الله شيئاً واني أومل من الله ان يدخل في الاسلام كثير بهذا السبب فيروي انه اسلم الف من الخزرج لما رأوه طلب الاستشفاء بثوب رسول الله ﷺ" انتهي [1]

کتب تفاسیر و احادیث کے ان حوالہ جات اور روایات سے روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا یقینی علم تھا کہ عبداللہ بن ابی کو حضور ﷺ کی نماز اور قمیص مبارک سے قطعاً کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔

رہا یہ امر کہ حضور ﷺ کا اختیار منفی ہوتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اختیار کی نفی اس وقت ہوتی جب حضور ﷺ کا ارادہ نفع پہنچانے کا ہوتا، لیکن حضور ﷺ کے الفاظ مبارک "ان

[1] شیخ محمد الشربینی الخطیب، تفسیر السراج المنیر، جلد ۱، طبع بولاق مصر ۱۲۹۹ھ، ص ۶۱۲

یہی روایت تفسیر ابن جریر طبری، طبع قاہرہ، ج ۱۱، ص ۶۱۴، تفسیر الجامع لاحکام القرآن قرطبی، طبع موسسۃ الرسالۃ، ج ۱۰، ص ۳۲۳، تفسیر کبیر رازی، طبع دار الفکر، بیروت، ج ۱۶، ص ۱۵۵، تفسیر روح المعانی، طبع ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، بیروت، ج ۱۰، ص ۱۵۴، تفسیر کشاف، طبع مکتبۃ الاعبیکۃ قاہرہ، ج ۳، ص ۷۹، تفسیر بیضاوی، طبع مکتبہ الشیخ، کراچی، ج ۲، ص ۴۴۵، تفسیر درمنثور، طبع قاہرہ، ج ۷، ص ۴۷۹، تفسیر ابن ابی عطیہ، مطبع دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ج ۳، ص ۶۷، تفسیر نسفی، موافق المکتبہ طبع دار النفائس، بیروت، ج ۳، سورہ التوبہ، تفسیر نیشاپوری، طبع دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ج ۳، ص ۵۱۳، فتح الباری شرح صحیح بخاری، طبع سعودیہ، ج ۸، ص ۱۹۴ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

صلوٰتی و قمیصی لا ینفعہ " اور " ولا یغنی عنہ شیئاً " پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ حضور ﷺ کا یہ ارادہ ہرگز نہ تھا، کیونکہ علم کے خلاف ارادہ نہیں ہوسکتا اور جب ارادہ ثابت نہ ہوا تو قدرت اور اختیار کی نفی کیسے ثابت ہوسکتی ہے، بلکہ ہماری منقولہ بالا روایات سے حضور ﷺ کے علم کے ساتھ حضور ﷺ کی قدرت اور اختیار کا بھی ثبوت ملتا ہے، اس لئے کہ حضور ﷺ کی وہ صلوٰۃ جس کا موجب راحت و سکون ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے، عبداللہ بن ابی کے حق میں غیر مفید رہی، اس لئے کہ حضور ﷺ نے پہلے فرمادیا تھا کہ لا ینفعہ یہ اس کو نفع نہ دے گی، اسی طرح حضور ﷺ کے لباس مبارک اور لعاب دہن اقدس کا مفید ہونا بھی دلائل شرعیہ اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، مسلم شریف میں حضرت اسماء کی یہ حدیث موجود ہے کہ ہم حضور ﷺ کے جبہ مبارک سے اپنے مریضوں کے لئے شفا طلب کیا کرتے اور لعاب دہن مبارک سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو شدید ترین امراض و تکالیف میں صحت و شفاء کا حصول بھی بے شمار احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، بلکہ دلائل شرعیہ کی روشنی میں میرا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آگ میں جلانے کا اثر جس قدر یقینی ہے اس سے زیادہ حضور ﷺ کے لباس مبارک اور لعاب دہن اقدس کا مفید ہونا یقینی ہے، اس کے باوجود اس منافق کے حق میں قمیص مبارک اور لعاب دہن اقدس کا مفید نہ ہونا اسی طرح قدرت و اختیار نبوی کی دلیل ہے، جیسے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے حق میں نار نمرود کا ٹھنڈا ہونا اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی چمکتی ہوئی دلیل ہے، یعنی نار نمرود باوجود محرق ہونے کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تکلیف نہ پہنچا سکی، اس لئے کہ ارادہ الٰہیہ ایذاء خلیل کا مقتضی نہ تھا، بس سمجھ لیجیے کہ دعائے حبیب اور قمیص پاک و لعاب شریف باوجود نافع اور مفید ہونے کے اس منافق عدو اللہ کو نفع اور راحت نہ پہنچا سکے، محض اس لئے کہ ارادہ حبیب راحت و مغفرتِ خبیث کا مقتضی نہ تھا، جس کی دلیل وہی حدیث ہے جسے ہم تفاسیر جلیلہ اور احادیث عظیمہ سے نقل کرچکے ہیں۔

ہماری پیش کردہ اس حدیث کا آخری حصہ " فیروی انہ اسلم الف من

قومہ۔ کو غور سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت آفتاب سے زیادہ روشن ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن ابی کے اس واقعہ میں اپنی طرف سے جو کچھ بھی کیا یعنی نماز، استغفار، اعطاء قمیص مبارک اور لعاب دہن اقدس ان سب چیزوں کا معرض ظہور میں آنا صرف اس لئے تھا کہ عبداللہ بن ابی کی قوم کے ایک ہزار آدمی اسلام لے آئیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور حضور ﷺ کے ان کاموں کے بعد اس کی قوم کے ایک ہزار آدمی فوراً ہی مسلمان ہو گئے اور جو کچھ حضور ﷺ کا ارادہ تھا وہ پورا ہو گیا، اس کے بعد حضور ﷺ کی لاعلمی اور عدم اختیار کا تصور ہی قائم نہیں ہو سکتا۔ (علامہ کاظمی علیہ الرحمہ کی تشریح یہاں ختم ہوئی) ۔[1]

احقر خلیل احمد رانا عرض کرتا ہے کہ انٹرنیٹ پر ٹورنٹو (کینیڈا) سے ایک اسلامی بھائی نے مذکورہ مضمون پر چند سوالات کئے تھے، احقر نے ان کو جواب دیا تو انہوں نے کہا کہ اب مسئلہ میری سمجھ میں آگیا ہے، الحمدللہ

پہلا سوال انہوں نے یہ کیا کہ عبداللہ بن ابی منافق کے بیٹے کی زیادہ دل جوئی تو اس وقت ہوتی کہ اس کے باپ کی مغفرت ہو جاتی؟

جواب: عرض ہے کہ جو کچھ قرآن مجید کی تفاسیر اور احادیث میں لکھا ہے وہ میں آپ کو بھیج چکا ہوں، اگر حضور ﷺ عبداللہ بن ابی منافق کے بیٹے سے فرما دیتے کہ اس کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا لہذا میں نماز جنازہ نہیں پڑھاؤں گا تو پھر اس کی دل شکنی ہوتی، یہاں تک کہ آپ ﷺ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے روکنے سے بھی نہ رکے، اس کے بیٹے کے تو سارے مطالبے آپ ﷺ نے پورے کئے، حضور ﷺ نے تو کوئی کمی نہ چھوڑی، یہ دل جوئی نہیں تو اور کیا ہے؟ عبداللہ بن ابی منافق کے بیٹے کو یہ تو پتا تھا کہ میرا باپ دشمن رسول ہے، پھر کیسے بخشش ہو سکتی تھی، اللہ کا حکم حضرت عمر کو پتا تھا تو عبداللہ بن ابی منافق کے بیٹے کو بھی علم تھا، اور پھر

---

[1] ماہنامہ السعید ملتان، شمارہ جون ۱۹۶۲ء۔ مختلف تقاریر علامہ کاظمی، آڈیو کیسٹس مملوکہ حاجی محمد شفیع سعیدی زرگر مرحوم نزد ریلوے پھاٹک ممتاز آباد ملتان

صاف حکم آگیا کہ ان پر نماز نہ پڑھیں، پھر وہ کیسے رنجیدہ ہوسکتا تھا، وہ مخلص صحابی تھا وہ اللہ ورسول کا حکم مانتا تھا۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ بارانِ رحمت تو اچھی بری دونوں جگہ پر ہوتی ہے، پھر اس کی مغفرت کیوں نہ ہوئی؟

جواب: بارش جب برستی ہے تو وہ اچھے برے کی تمیز نہیں کرتی۔ اس سے یہی مراد ہے کہ آپ نے غلبہ رحمت کی بنا پر یہ نہ دیکھا کہ یہ دشمن ہے بلکہ اس کی بھی مغفرت طلب کی۔

تیسرا سوال یہ تھا کہ حضور ﷺ کا کام تو شفاعت کرنا ہے مغفرت کرنا نہیں، کیا اس سے اختیارات کی نفی نہیں ہوتی؟ مختارِ کل تو جسے چاہے معاف کرسکتا ہے۔

جواب: میرے خیال میں آپ کا مرکزی سوال یہ ہے کہ پھر آپ ﷺ کا مختارِ کل ہونا کہاں گیا؟

اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مختار ہونے میں کسی کا محتاج نہیں، اللہ تعالیٰ کو اختیار کسی سے عطا نہیں ہوا، بلکہ ذاتی ہے، بندہ مختار ہونے میں محتاج ہے۔

مشرکین کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان بتوں کو الوہیت دے دی ہے، لہٰذا اب اللہ تعالیٰ کوئی کام نہ کرے اور یہ کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں، کیونکہ اللہ نے اب ان کو اپنے حکم میں نہیں رکھا اور استقلال کی صفت ان کو دے دی کہ میرا حکم نہ بھی ہو تو تم کام کرسکتے ہو، یہ تھا ان جاہلوں کا اعتقاد، حالانکہ جو چیز مخلوق ہے وہ مستقل نہیں ہوسکتی۔

اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ آپ ﷺ باذن اللہ مختارِ کل ہیں، اللہ تعالیٰ کے اذن اور مشیت کے تحت مختارِ کل ہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا "ما تشاء ون الا ان یشاء اللہ" (سورۃ الدہر، آیت ۳۰) "اور تم نہیں چاہ سکتے جب تک اللہ نہ چاہے" یعنی آپ وہ چاہتے ہی نہیں جو اللہ نہ چاہے۔ تو پھر آپ ﷺ کیسے اللہ تعالیٰ کے اذن اور مشیت کے خلاف اس کو بخشوا سکتے تھے۔ حضور ﷺ کا ہر کام اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت ہے۔ حضور ﷺ

سے اختیارات کی نفی جن دلائل سے لوگ ثابت کرنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ان سب کا مفاد صرف یہ ہے کہ حکم خداوندی کے خلاف اور مشیت الٰہیہ کے منافی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قطعاً کوئی حکم یا اختیار حاصل نہیں ہے، عطاء الٰہی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اختیارات ماننا درست عقیدہ ہے۔

مخالفین اہل سنت لفظ مختار کل میں ''کل'' سے غلط مراد لیتے ہیں، کہتے ہیں کہ اگر آپ مختار کل ہیں تو فلاں کام کیوں نہ کیا یعنی وہ مشرکین والا عقیدہ مراد لیتے ہیں کہ جب آپ مختار کل ہیں تو اللہ کے اذن اور مشیت کی کیا ضرورت ہے، آپ اپنی مرضی سے ہر کام کر سکتے ہیں۔

اہل سنت کے نزدیک مختار کل سے مراد یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے نائب ہونے کی حیثیت سے ہر ایک پر با اختیار''۔ نائب ہونے میں اذن و مشیت دونوں آگئے۔

ناکارہ

خلیل احمد رانا

حدیث نمبر (۱۰)

حدیث حوض

"عن سهل بن سعد، قال: قال رسول الله ﷺ: اني فرطكم علي حوض، من مر علي شرب، ومن شرب لم يظمأ ابدا، ليردن علي اقوام اعرفهم ويعرفوني، ثم يحال بيني وبينهم، فاقول: انهم مني، فيقال: انك لا تدري ما أحدثوا بعدك؟ فأقول: سحقاً سحقاً لمن غير بعدي، متفق عليه"[1]

حضرت سھل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں حوض پر تمہارا پیش رو ہوں گا، جو میرے پاس سے گزرے وہ پیے گا اور جس نے پیا اُسے کبھی پیاس نہیں لگے گی، میرے پاس سے کچھ لوگ گزریں گے جن کو میں پہچانتا ہوں اور وہ مجھے جانتے ہیں، پھر میرے اور اُن کے درمیان پردہ حائل کر دیا جائے گا، میں کہوں گا کہ یہ تو مجھ سے ہیں، کہا جائے گا کہ آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا نئی باتیں گھڑی کی ہیں، پس میں کہوں گا: دوری دوری، جس نے میرے بعد تبدیلی کر دی (متفق علیہ)۔

اعتراض:

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قیامت کے دن بھی بعض باتوں کا علم نہ ہوگا۔

جواب:

یہ ایک عجیب شبہ ہے، جو دلیل مثبت علم ہو اس کو نفی میں پیش کیا جا رہا ہے، غور فرمائیے یہ واقعہ قیامت کے دن ہوگا، لیکن حضور ﷺ اس کو پہلے بیان فرما رہے ہیں، علم نہ تھا

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، الباب، حدیث ۵۵۰۱ ~~(عربی) باب الحوض والشفاعۃ~~ ۵۳۴۱ مطبوعہ فرید بک سٹال لاہور، ص ۹۹۶

تو بیان کیسے فرمادیا؟

رہی یہ بات کہ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ کہا جائے گا کہ آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مسلم شریف میں منکرین کی یہی حدیث بایں الفاظ میں موجود ہے " فیقال اما شعرت ما عملوا بعدك " یعنی حضور ﷺ سے کہا جائے گا کہ آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کام کئے؟۔

"ما شعرت" جملہ منفیہ پر ہمزہ استفہام انکاری داخل ہوا ہے، نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے، لہذا حدیث مبارک سے مرتدین کے اعمال کا علم حضور ﷺ کے لئے ثابت ہوا، چونکہ واقعہ ایک ہے، صرف اس کی روایتوں میں تعدد ہے، اس لئے جب ایک روایت میں ہمزہ استفہام مذکور ہوگیا تو ہر روایت میں اس کے معنی ملحوظ رہیں گے اور جس روایت میں وہ مذکور نہیں وہاں محذوف ماننا پڑے گا، مثلاً "انك لا تدری" والی حدیث میں ہمزہ مذکور نہیں تو یہاں محذوف مانیں گے اور اصل عبارت یوں ہوگی کہ " أانك لا تدری کیا آپ نہیں جانتے ؟

ورنہ حدیثوں میں تعارض ہوگا کیونکہ ہمزہ استفہام کا محذوف ہونا تو صحیح ہے جیسا کہ قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں محذوف ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقولہ "ھذا ربی" (سورۃ الانعام) مفسرین نے " أھذا ربی " فرمایا ہے یعنی کیا یہ میرا رب ہے؟ لیکن اس کا زائد ہونا صحیح نہیں۔ (تفسیر معالم التنزیل بغوی۔ تفسیر خازن)

اگر "انك لا تدری" والی روایت میں ہمزہ استفہام محذوف نہ مانیں تو "اما شعرت" والی روایت میں ہمزہ کو زائد ماننا پڑے گا جو کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا، خصوصاً جب کہ حضور ﷺ کے کمال علم کی نفی ہوتی ہو۔

پھر یہ کہ احادیث میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو اپنی اُمت کے تمام اچھے اور برے اعمال کا علم ہے، مشکوٰۃ شریف میں حدیث وارد ہے: "عرضت علی اعمال اُمتی حسنها وسیئها" الخ (مشکوٰۃ) یعنی میری اُمت کے تمام اچھے اور

برے اعمال مجھ پر پیش کیے گئے۔

اَب غور فرمایئے کہ مرتدین بھی حضور ﷺ کی اُمت میں داخل تھے، ان کا مرتد ہونا عمل قبیح ہے (اعاذنا اللہ تعالیٰ منہ) جب اُمت کے تمام اعمال حسنہ اور اعمال قبیحہ حضور ﷺ کے سامنے پیش کیے گئے تو ان کا ارتداد جو عمل قبیح ہے وہ بھی ضرور پیش ہوا، پھر حضور ﷺ کو ان کے عملوں کا علم نہ ہونا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے، معلوم ہوا کہ حدیث مذکور کے یہی معنی صحیح ہیں کہ ''اے حبیب ﷺ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے کیا عمل کئے؟'' آپ کو معلوم تو ہے پھر بھی آپ غلبہ رحمت کے حال میں ان کو اپنی طرف لے رہے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ جب کریم کو سخاوت کے لئے بٹھا دیا جائے تو اس وقت اس کے دریائے سخا میں ایسا جوش ہوتا ہے کہ دشمن کی دشمنی کی طرف اس کی توجہ نہیں رہتی اور وہ بے اختیار اپنے کرم کا دامن اس کی طرف پھیلا دیتا ہے، جب اسے توجہ دلائی جائے تو اس وقت متوجہ ہوتا ہے۔

ساقی کوثر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ حوض کوثر پر رونق افروز ہوں گے، اپنے غلاموں کو چھلکتے ہوئے جام پلا رہے ہیں، مرتدین کی جماعت اِدھر سے گزرتی ہے، حضور کو ان کے عملوں کا پورا پورا علم ہے مگر اس وقت دریائے جود وسخا موجزن اور شانِ رحمت کا ظہور اتم ہے، اس لئے ان کی بداعمالیوں کی طرف خیال مبارک جاتا ہی نہیں اور اپنے لطفِ عمیم اور کرم جسیم کے غلبہ حال میں بے اختیار فرما دیتے ہیں: اصیحابی! اصیحابی، لیکن جب توجہ دلائی جاتی ہے کہ ''اما شعرت ما احدثوا بعدک'' پیارے کیا آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا؟ پس فوراً توجہ مبارک ان کی بداعمالیوں کی طرف مبذول ہوجاتی ہے اور ارشاد فرماتے ہیں: ''سحقاً سحقاً'' انہیں دُور لے جاؤ! دُور لے جاؤ۔

طالب حق کے لئے اس حدیث کا صحیح مطلب سمجھنے کے لئے یہ بیان کافی ہے۔

صحابی کی اصطلاح: ہمارے نزدیک وہ شخص صحابی ہے جس نے بحالتِ ایمان نبی

پاک ﷺ سے ملاقات کی اور اسی حالتِ ایمان پر فوت ہوا۔...... احادیث حوض میں بدعت کفریہ میں مبتلا ہو کر مرتد ہو جانے والے افراد مراد ہیں جو خود کو صحابی بھی کہتے تھے۔ (انہوں نے آپ کے بعد کیا احداث کیا؟) بخاری: ۴۶۲۵، ۶۵۲۶، ۶۵۸۶ میں ہے کہ ان کے احداث سے مراد ان کا مرتد ہونا تھا۔ ہماری اصطلاح میں وہ صحابی ہی نہیں ہیں کیونکہ ہم اسے صحابی مانتے ہیں جو (اسی حالت ایمان پر فوت ہوا)۔ احادیث حوض والے نام نہاد صحابہ کے بارے میں قرآن میں ہے کہ: اے ایمان والو! تم میں سے جو اپنے دین سے مرتد ہو جائے تو "فسوف یاتی الله بقوم یحبهم ویحبونه اذلة علی المؤمنین اعزة علی الکافرین یجاهدون فی سبیل الله" تو اللہ اپنے محبوں اور محبوبوں کی قوم جو آپس میں نرم اور کافروں پر سخت ہوگی لائے گا جو اللہ کی راہ میں (ان مرتدوں سے) جہاد کریں گے۔ جو کلمہ گو مرتد ہوئے اور منکرین زکوٰۃ یا حامیان مسیلمہ کذاب بنے ان سے حضرت ابوبکر اور آپ کے ساتھیوں نے جہاد کیا۔ پیش کردہ حدیث میں جو مرتد "صحابہ" مذکور ہیں ان پر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تلوار چلی ہے اور بخاری، کتاب الانبیاء، باب واذکر فی الکتاب مریم، رقم: ۳۴۴۷ میں حدیث حوض کے آخر میں ہے کہ ان مرتدوں سے جہاد ابوبکرؓ نے کیا ہے۔ ہماری اصطلاح میں مرتد ہو جانے والا صحابی نہیں۔ ان مرتدوں سے جہاد صحابہؓ نے کیا اور تابعینؒ نے کیا۔ رہ گیا سرکار ﷺ کا ان مرتدوں کو صحابی کہنا تو وہ یا تو عدم توجہ سے اور غلبہ رحمت سے ہوا، یا پھر زجر و توبیخ کے لئے ان کے دعوے کے مطابق فرمایا جیسے اللہ کافروں کو فرمائے گا: ذُقۡ انک انت العزیز الکریم۔ (چکھ ہاں ہاں تُو ہی معزز اور عزت دار ہے)۔ [1]

---

[1] سورۃ الدخان ۴۴:۴۹ تقریر منیر، از علامہ کاظمی علیہ الرحمہ، مطبوعہ ملتان۔ دیگر تقاریر آڈیو کیسٹس

حدیث نمبر (۱۱)

نگہبان امت بعد از وصال

'' عن ابن عباس قال : قام فینا النبی ﷺ یخطب فقال : انکم محشورون حفاۃ عراۃ غرلاً (کما بدأنا اول خلق نعیدہٗ) الآیۃ۔ وان اول الخلائق یُکسیٰ یوم القیامۃ ابراھیم الخلیل. وانہ سیجائ برجال من اُمتی فیؤخذبھم ذات الشمال. فأقول : یارب اصیحابی. فیقول : انک لا تدری ما أحدثوا بعدک. فأقول کما قال العبد الصالح (وکنت علیھم شھیداً مادمت فیھم۔ الیٰ قولہ۔ الحکیم) قال فیقال: انھم لم یزالوا مرتدین علی اقابھم۔''[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم بروز حشر بارگاہ خداوندی میں اکٹھے کرلے جاؤ گے، اس وقت کچھ لوگوں کو جہنم کی طرف ہانکا جارہا ہوگا تو میں وہی کہوں گا جو اللہ کے بندے (حضرت عیسیٰ) نے کہا کہ "اور میں ان پر مطلع تھا جب تک ان میں رہا، جب تو نے مجھے اٹھالیا تو تو ہی ان پر نگاہ رکھتا تھا، اور ہر چیز تیرے سامنے حاضر ہے۔

(خلاصہ) حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میری اُمت کے بارے میں جب اللہ تعالیٰ مجھ سے سوال کرے گا تو میں اسی طرح کہوں گا جیسے اللہ تعالیٰ کے عبد صالح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: "وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (سورۃ المائدہ:

[1] صحیح بخاری: رقم ۶۵۲۶ کتاب الرقاق باب کیف الحشر مطبوعہ بیت الافکار ریاض ص ۱۲۵۰ ۱۹۹۸ء

آیت ۱۱۷)۔ یعنی جب تک میں ان میں رہا ان کے حال کو جانتا تھا، جب تو نے مجھے وفات دے دی تو تُو ہی ان کے حال کو جاننے والا ہوگیا۔

شبہ:

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ لفظ تَوَفّی کے معنی وفات ہیں، "رَفَعَ اِلَی السَّمَاءِ" نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات نہیں ہوئی اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرح حضور ﷺ بھی آسمانوں پر اٹھائے گئے، دوسرے یہ کہ وفات کے بعد رسول اللہ ﷺ کو اُمت کے حال کا کوئی علم نہیں۔

تشریح:

اس شبہ کے جواب میں سب سے پہلے عرض ہے کہ یہ لفظ "توفی" قرآن مجید میں کئی جگہ مستعمل ہوا ہے اور تفسیر قرآن کے لئے اس امر کو ذہن نشین کر لینا بھی ضروری ہے کہ ایک کلمہ کا استعمال ہر جگہ یکساں نہیں ہوتا۔ کیونکہ کلام اور گفتگو کے مواقع مختلف ہوتے ہیں، اس لئے ضروری نہیں کہ ایک لفظ کے جو معنی ایک موقع پر مراد ہیں، ہر جگہ اور ہر موقع پر وہی معنی مراد لئے جائیں (تفصیل کے لئے دیکھئے مفردات القرآن، از امام راغب اصفہانی، متوفی ۵۰۲ھ)، بعض مقامات پر ایک لفظ بطور حقیقت بولا جاتا ہے اور بعض مواقع میں وہی لفظ بطور مجاز استعمال ہوتا ہے۔

رہی یہ بات کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میری اُمت کے بارے میں جب اللہ تعالیٰ مجھ سے سوال کرے گا تو میں اسی طرح کہوں گا جیسے اللہ تعالیٰ کے عبد صالح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: "وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي

كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ"[1]

غرض ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا بعد الوفات اپنی اُمت کے حال کا عالم ہونا ضروری ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: "فکیف اذا جئنا من کل اُمة بشهید وجئنا بك علیٰ هؤلاء شهیدا" (سورۃ النساء: آیت ۴۱) "کیسے ہوگا جب ہم ہر اُمت سے (اس کے نبی کو) گواہ لائیں گے اور آپ کو اے محبوب ﷺ ہم ان لوگوں پر گواہ بنا کر لائیں گے"۔

ظاہر ہے کہ علم کے بغیر گواہی ناممکن ہے، جب ہر نبی کی گواہی اس کی ساری اُمت کے حق میں ثابت ہوگئی تو تمام اُمت کے اعمال واحوال کا علم بھی ثابت ہوگیا، وللہ الحمد

(حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں حضور ﷺ پر ہر صبح وشام حضور کی امت پیش کی جاتی ہے، حضور ﷺ اپنے ہر اُمتی کا چہرہ اور اس کے اعمال پہچانتے ہیں، اسی علم کامل کے باعث حضور ﷺ قیامت کے روز سب کے گواہ ہوں گے۔ تفسیر قرطبی، جز سادس، ص ۳۲۶)

ایک اعتراض اور اس کا جواب

قرآن مجید میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نبیوں سے اُن کی اُمت کے بارے میں سوال فرمائے گا تو وہ کہیں گے لا علم لنا ہمیں کوئی علم نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام اُمتوں کے حال سے لاعلم ہوتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نفی علم الٰہی کے مقابلہ میں ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے، ہماری اُمتوں کا حال بھی وہ خوب جانتا ہے، لہٰذا از راہ ادب لا علم لنا کہہ دیا، یعنی تیرے علم کے مقابلہ میں ہمارا علم نہ ہونے کے برابر ہے، یہ مطلب نہیں کہ

---

[1] سورۃ المائدہ: آیت ۱۱۷

فی الحقیقت ہم بے خبر ہیں، کیونکہ جو شخص کسی واقع سے بے خبر ہو وہ اس پر شہادت نہیں دے سکتا اور ہم قرآن مجید سے ثابت کر چکے ہیں کہ یہ نبی اپنی امت پر گواہ ہیں اور حضور ﷺ بھی اپنی امت پر قیامت کے دن رب تعالیٰ کے حضور گواہی دیں گے لہذا لا علمی کا قول باطل ہوا۔

ایک پرانے شبہ کا ازالہ

"فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي" کی آیت میں بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام قرب قیامت میں نازل ہوں گے تو اس وقت وہ ضرور رقیب ہوں گے پھر ان کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہوگا کہ جب تو نے مجھے پورا پورا لے لیا تو پھر تو ہی ان پر نگہبان ہوگیا۔

اس کا ازالہ یہ ہے کہ مَا دُمتُ فِیھِم قبل الرفع اور بعد النزول دونوں زمانوں کو شامل ہے اور اسی طرح لفظ تَوَفَّيْتَنِي بھی ہر دو توفی رفع الی السماء اور وفات بعد النزول کو عام ہے کیونکہ اَخذُ الشئی وَافِیاً رفع اور وفات دونوں کو عام ہے لہذا آیت کریمہ کا واضح اور روشن مفہوم یہ ہے کہ آسمان پر جانے سے پہلے اور نازل ہونے کے بعد جب تک میں ان میں رہا ان کی نگہبانی اور روک ٹوک کرتا رہا اور جب تو نے مجھے آسمان پر اٹھا کر اور نزول کے بعد وفات دے کر پورا پورا لے لیا تو ان دونوں زمانوں میں صرف تو ہی ان پر نگہبان رہا، آیت کریمہ کا یہ مفہوم ایسا روشن اور واضح ہے کہ جس میں کسی تاویل کی حاجت نہیں ہوتی۔

مرادی معنی کے تفاوت کی دوسری صورت یہ ہے کہ کسی لفظ منسوب الیہ کے بدل جانے سے اس کے مرادی معنی بدل جاتے ہیں مثلاً "لیغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر" اس آیت کریمہ میں دو لفظ "غفر" اور "ذنب" ایسے استعمال ہوئے ہیں جو قرآن مجید میں بکثرت مستعمل ہیں لیکن اس آیت میں ان دونوں کے وہ معنی مراد نہیں جو دوسری آیات میں مراد ہیں، کتب تفاسیر اور لغت قرآن وحدیث مثلاً بیضاوی، کشاف،

مفردات امام راغب اصفہانی، مجمع بحار الانوار وغیرہ میں "ذنب" بمعنی اثم اور گناہ مرقوم ہیں، غیر معصوم کے لئے جب یہ لفظ ذنب مستعمل ہوگا تو اس کے معنی گناہ ہی ہوں گے، لیکن معصوم کے لئے جب یہ لفظ استعمال کیا جائے گا تو اس کی شان کے لائق معنی مراد ہوں گے، تاکہ دیگر دلائل شرعیہ کے خلاف لازم نہ آئے، لہذا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں لفظ ذنب کے معنی خلاف اولیٰ کام کے ہوں گے اور اس کا خلاف اولیٰ ہونا بھی محض ظاہری صورت کے اعتبار سے ہوگا، ورنہ حقیقت میں وہ کام دوسروں کے فرائض وواجبات سے کہیں افضل ہوگا۔

نبی اُمت کے لئے مطاع اور متبوع ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ ہم نبیوں کو اس لئے بھیجتے ہیں کہ ان کے قول وفعل میں ان کی اطاعت کی جائے اور ان کی امت ان کے قدم بقدم چلتی رہے اور ان کی اتباع اور پیروی اپنے لئے باعث نجات سمجھے، ظاہر ہے کہ نبی کے قول وفعل میں اگر معصیت پائی جائے تو وہ متبوع اور مطاع کیسے رہ سکتا ہے، اور اس کو متبوع اور مطاع ہوتا ضروری ہے ورنہ اس کی نبوت بے معنی ہو کر رہ جائے گی، لہذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبی ہر گناہ اور معصیت سے معصوم ہے، ایسی صورت میں حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ذنب اور غفر کے وہ معنی کیونکر درست ہو سکتے ہیں جو گنہگاروں کے حق میں مراد ہیں، بلکہ مندرجہ ذیل توجیہات میں سے کوئی توجیہہ اختیار کرنی پڑے گی۔

۱۔ قرآن کریم میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذنب سے مراد آدم وحوا علیہما السلام کا دانہ گندم کھانا ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے آپ کے ماں باپ آدم وحوا علیہما السلام کے اس فعل (خلاف اولیٰ) کو آپ کے لئے بخش دیا۔ (الشفاء، قاضی عیاض)

۲۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اُمت کے گناہ مراد ہیں اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ

تعالیٰ آپ کی اُمت کے گناہوں کو آپ کے طفیل بخش دے۔[۱]

۳۔ ذنب سے مراد گناہ نہیں بلکہ حضور ﷺ کے وہ مبارک کام ہیں جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تکمیل دین کی خاطر بیان جواز کے لئے کئے تھے اور وہ کام ظاہری صورت کے اعتبار سے خلاف اولیٰ تھے (اشعۃ اللمعات، جلد اوّل) لیکن درحقیقت ہمارے لئے فرائض وواجبات سے بھی افضل واعلیٰ اور برتر وبالا تھے۔

۴۔ ذنب سے مراد گناہ نہیں بلکہ الزام ہے اور آیت کریمہ کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے مکہ معظمہ اور کعبہ مطہرہ کو آپ کے لئے اس لئے فتح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ اگلے پچھلے الزامات کو آپ سے دور کر دے، کیونکہ عرب والوں کا یہ خیال تھا کہ اگر یہ سچے نبی نہیں تو مکہ اور کعبہ ان کے لئے کبھی فتح نہیں ہوسکتا، جب اللہ تعالیٰ نے یہ فتح مبین عطا فرمادی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی سے تمام الزامات دُور ہو گئے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سچائی ظاہر ہوگئی، ذنب بمعنی الزام قرآن شریف میں مستعمل ہے دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ "مجھ پر ان کا ایک الزام ہے" معلوم ہوا کہ ذنب بمعنی الزام بھی مستعمل ہوتا ہے۔

یاد رکھئے جس طرح لفظ ذنب انبیاء علیہم السلام کے حق میں گناہ نہیں ہوتا اسی طرح غفر بھی ان کے لئے بخشش گناہ کے معنی میں نہیں آتا، گنہگاروں کا غفر، گناہوں کی سزا سے بچنا ہے اور انبیاء علیہم السلام کا غفر نفس گناہ سے بچنا اور خلاف اولیٰ امور کے ناپسندیدہ اثرات سے محفوظ رہنا ہے، مختصر یہ کہ کسی لفظ کے منسوب الیہ کے بدل جانے سے اس کے مرادی معنی بھی بدل جاتے ہیں۔[۲]

۱۔ الشفاء، قاضی عیاض، تفسیر خازن

۲۔ ماہنامہ السعید ملتان، شمارہ رمضان المبارک ۱۳۷۹ھ / مارچ ۱۹۶۰ء

حدیث نمبر (۱۲)

بیداری میں زیارت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

عن ابي هريرة قال سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول من رأني في المنام فسيراني في اليقظة ولا يتمثل الشيطان بي۔ [1]

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے سنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا وہ عنقریب مجھے بیداری میں دیکھے گا، اور شیطان میرا ہم شکل نہیں ہو سکتا''۔

حدیث شریف کے معنی بالکل واضح ہیں کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم صاف صاف ارشاد فرما رہے ہیں کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا وہ عنقریب مجھے بیداری میں دیکھے گا اور حدیث میں یہ اشکال ہے کہ فی الواقع ایسا نہیں ہوتا کہ ہر وہ شخص جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہو وہ بیداری میں بھی حضور کو دیکھ لے۔

اس کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں لیکن محققین کے نزدیک صرف ایک ہی جواب ایسا ہے جو نہایت ہی واضح اور شکوک وشبہات سے پاک ہے اور وہ جواب سادات صوفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے دیا ہے، جس کو شیخ شنوانی مصری نے پسند فرمایا ہے، حاشیہ الشیخ محمد الشنوانی علی مختصر ابن ابی جمرہ، مطبوعہ مصر، ص ۷ ۵۲ پر ہے :

'' وقال السادة الصوفيه يراه يقظة في دار الدنيا فالمعني حينئذ ان من راه مناما وكان مشتاقا واشتد شوقه راه في اليقظة كما وقع لكثير من الاولياء منهم الشيخ ابو العباس امرسي قال لو احتجبت عنه صلي الله عليه وسلم طرفة عين ما عددت نفسي من المسلمين وكذلك سيدي ابراهيم

[1] بخاری، کتاب بدء الوحی، حدیث ۶۹۹۳

المتبولي كان ينظر النبي ﷺ يقظة وكذلك الشيخ سحيمي وشيخنا البراوي نفعنا الله بالجميع"۔ [1]

"اور سادات صوفیہ نے فرمایا کہ حضور ﷺ کو خواب میں دیکھنے والا دار دنیا میں بحالت بیداری حضور ﷺ کو دیکھتا ہے، اس وقت حدیث کے معنی یہ ہوں گے کہ جس نے رسول اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا اور حضور کو بیداری میں دیکھنے کا مشتاق ہوگیا اور اس کا یہ شوق حد سے متجاوز ہوگیا تو وہ حضور ﷺ کو بیداری میں ضرور دیکھ لے گا، جیسا اکثر اولیاء کرام کے لئے واقع ہوا ان میں شیخ ابو العباس مرسی ہیں، انہوں نے فرمایا اگر میں پلک جھپکنے کی مقدار بھی حضور ﷺ سے اوجھل ہو جاؤں تو میں اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار نہ کروں اور اسی طرح سیدی ابراہیم متبولی رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ کو بیداری میں دیکھتے تھے اور اسی طرح شیخ سحیمی اور ہمارے شیخ براوی رضی اللہ تعالیٰ عنہما یہ سب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جمال مبارک جاگتے ہوئے کھلم کھلا دیکھا کرتے تھے"۔

روح المعانی پارہ ۲۲ ص ۳۴ میں اسی حدیث کے متعلق صاحب روح المعانی امام ابی محمد ابن ابی جمرہ کا قول نقل فرماتے ہیں:

"هذا الحديث يدل على ان من يراه ﷺ في النوم فسيراه في اليقظة وهل هذا على عمومه في حيوته وبعد مماته عليه الصلوٰة والسلام او هذا كان في حيوة وهل ذلك لكل من راه مطلقا او خاص بمن فيه الاهلية والاتباع لسنته عليه الصلوٰة والسلام اللفظ يعطي العموم ومن يدعي الخصوص فيه بغير مخصص مني ﷺ فمتعسف واطال الكلام في ذلك ثم قال وقد ذكر عن السلف والخلف هلم جرا ممن كانوا راوه ﷺ في النوم وكانوا ممن يصدقون بهذا الحديث فراوه بعد ذلك في اليقظة وسالوه عن اشياء

[1] حاشیہ شنوانی علی مختصر ابن ابی جمرہ للبخاری۔ مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی مصر ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۵ء ص ۲۰۲ م بیق من الفتوۃ (؟)

مطبوعہ دار الصدیق ... ۱۴۱۸ھ/۱۹۹۸ء ص ۳۲۸

وكانوا منها متشوشين فاخبرهم بتفريجا ونص لهم على الوجوه التي منها يكون فرجها فجاء الامر كذلك بلا زيادة ولانقص انتهى المراد منه ''۔ [1]

''یہ حدیث ''من رآنی فی المنام فسیرانی فی الیقظة'' دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ جس نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا وہ عنقریب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بیداری میں دیکھ لے گا، رہا یہ سوال کہ یہ حدیث اپنے عموم پر ہے، حضور کی حیات ظاہری اور وفات اقدس کے بعد یا یہ حیات ظاہری کے ساتھ مخصوص ہے، نیز یہ سوال کہ یہ ہر اس شخص کے لئے ہے جس نے حضور کو دیکھا، مطلقاً یا خاص ہے ان لوگوں کے ساتھ جن میں اہلیت اور اتباع سنت کا وصف پایا جاتا ہے تو ان دونوں سوالوں کا جواب یہ ہے کہ الفاظ حدیث تو عموم (الفاظ حدیث کے افادہ عموم کی جو توجیہ امام ابی محمد ابن ابی جمرہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمائی ہے نہایت صحیح اور بے غبار ہے، رہا شیخ محمد شنوانی کا قول ہے کہ وکان مشتاقا اشد شوقه اس کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے عن الناس فیما یعشقون مذاہب۔ کاظمی) ہی کا فائدہ دیتے ہیں اور جو شخص حضور کی تخصیص کے بغیر اپنی طرف سے خود بخود تخصیص کا دعویٰ کرے وہ متعصب ہے، اور امام موصوف نے اس کے متعلق کلام طویل فرما کر ارشاد فرمایا ہے کہ سلف سے لے کر خلف تک چلے آئیے، ان میں سے جو لوگ بھی نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھتے تھے، انہوں نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھنے کے بعد بیداری میں دیکھا اور حضور ﷺ سے ایسی چیزوں کے متعلق سوال کیا جن میں وہ متردد تھے تو حضور ﷺ نے ان اشیاء میں تردد سے کشادگی کی خبر دی اور ان کے لئے ایسے وجوہ کی تصریح فرما دی جن سے وہ متردد فیہ امور بالکل کشادہ ہو جائیں اور پھر حضور کے فرمان کے مطابق بلا کم و کاست اسی طرح وہ امور واقع ہوئے''۔

نبی کریم ﷺ کے بیداری میں تشریف فرما ہونے اور اپنے غلاموں کو اپنے لطف

[1] تفسیر روح المعانی جز ۲۲ ... سورۃ الاحزاب ... مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ص ۳۶

وکرم سے مستفید ہونے پر اکابر علماء امت اور علماء محققین کی اتنی تصریحات موجود ہیں کہ ان تمام کو نقل کرنے کے لئے یہ مختصر وقت کسی طرح مکتفی نہیں ہوسکتا۔ مشتے نمونہ از خروارے چند عبارات پیش کرتا ہوں :

تفسیر روح المعانی، پارہ ۲۲، ص ۳۳ پر ہے :

"فقد وقعت رؤیته صلی اللہ علیہ وسلم بعد وفاته بغیر واحد من الکاملین من هذه الامة والاخذ منه یقظة کما قال الشیخ سراج الدین بن الملقن فی طبقات الاولیاء الی اٰخره"۔

"بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھنا آپ کی وفات کے بعد اور بیداری میں حضور سے فیض لینا امت محمدیہ کے بکثرت کاملین کے لئے واقع ہوا ہے جیسا کہ شیخ سراج الدین بن الملقن نے طبقات الاولیاء میں فرمایا ہے"۔

اس عبارت کے بعد صاحب روح المعانی نے شیخ سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ کی نقول پیش کرتے ہوئے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مفصل واقعہ بیان کیا ہے جس میں صاف صاف مذکور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضور علیہ السلام کے بعد حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ظاہر و باہر تشریف لائے اور حضرت غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دہن مبارک میں اپنا مقدس لعاب دہن ڈالا اور وہ فیض پہنچایا جس کی مثال نہیں مل سکتی پھر شیخ خلیفہ بن موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق نقل فرمایا :

"کان کثیر الرؤیۃ لرسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام یقظۃ ومناماً"۔[1]

"حضرت شیخ خلیفہ بن موسیٰ رضی اللہ عنہ سوتے جاگتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت کثرت سے دیکھنے والے تھے"۔

---

[1] سید محمود آلوسی بغدادی: تفسیر روح المعانی: مطبوعہ ملتان ص ۳۶،۳۵ دار احیاء التراث العربی بیروت جلد ۲۲، ص ۳۵

اس کے بعد صاحب روح المعانی نے حضرت شیخ تاج الدین ابن عطاء اللہ کا قول ''لطائف المنن'' سے اس طرح نقل فرمایا :

''قال رجل الشيخ ابي العباس المرسي يا سيدي صافحني بكفك هذه فانك لقيت رجالاً وبلاداً فقال والله ماصافحت بكفي هذه الا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قال وقال الشيخ لو حجب عني رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم طرفة عين ماعددت نفسي من المسلمين ومثل هذه النقول كثير في كتب القوم جداً''۔ [۱]

''کسی شخص نے حضرت شیخ ابو العباس مرسی سے عرض کیا اے میرے سردار آپ اس ہتھیلی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ فرمائیں اس لئے کہ آپ بڑے شہروں میں گھومے ہیں اور بڑے مردان خدا سے آپ نے ملاقات کی ہے حضرت شیخ ابو العباس مرسی نے فرمایا خدا کی قسم میں نے اس ہتھیلی سے سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی کے ساتھ مصافحہ نہیں کیا، حضرت امام تاج الدین نے فرمایا کہ حضرت شیخ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر پلک جھپکنے کی مقدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے حجاب میں ہو جائیں تو میں اپنے آپ کو مسلمان شمار نہ کروں اور اس جیسی نقول کتب قوم میں بہت زیادہ ہیں''۔

اس کے بعد اسی بحث میں صاحب روح المعانی نے امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت ''تنویر الحلك'' سے نقل فرمائی جس کو بلفظہا پیش کرتا ہوں :

'' فحصل من مجموع هذا الكلام النقول والاحاديث ان النبي صلی اللہ علیہ وسلم حي بجسده وروحه وانه يتصرف ويسير حيث شاء في اقطار الارض وفي الملكوت وهو بهيئته التي كان

---

[۱] تفسیر روح المعانی، پ ۲۲، ص ۳۳، ۳۴ مطبوعہ مصر دار احیاء التراث العربی بیروت جلد ۲۲، ص ۳۰۹

علیها قبل وفاته لم یتبدل منه شيء وانه مغیب عن الابصار کما غیبت الملائکة مع کونهم احیاء باجساد هم فاذا اراد الله تعالیٰ رفع الحجاب عمن اراد اکرامه برؤیته راٰه علی هیئته التي هو علیه الصلوٰة والسلام علیها لامانع من ذلك ولاداعي الی التخصیص برؤیة المثال''۔[1]

''ان تمام نقول اور احادیث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ نبی کریم ﷺ اپنے جسم مبارک اور روح اقدس کے ساتھ زندہ ہیں اور بے شک حضور ﷺ اطراف زمین اور ملکوت اعلیٰ میں جہاں چاہتے ہیں سیر اور تصرف فرماتے ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی اسی ہیئت مبارکہ کے ساتھ ہیں جس پر وفات سے پہلے تھے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کوئی چیز بدلی نہیں اور بے شک نبی کریم ﷺ ظاہری آنکھوں سے غائب کردیئے گئے ہیں جس طرح ملائکہ غائب کردیئے گئے ہیں، حالانکہ وہ سب اپنے جسموں کے ساتھ زندہ ہیں جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو اپنے حبیب ﷺ کا جمال دکھا کر عزت و بزرگی عطا فرمانا چاہتا ہے تو اس سے حجاب کو دور کردیتا ہے اور وہ مقرب بندہ حضور ﷺ کو اسی ہیئت پر دیکھ لیتا ہے جس پر حضور واقع ہیں، اس روایت سے کوئی چیز مانع نہیں اور رؤیت مثالی کی تخصیص کی طرف کوئی امر داعی نہیں''۔

اور زرقانی، جلد ا، ص ٨، مطبوعہ مصر میں ہے :

'' لایمتنع رؤیة ذاته علیه السلام بجسده وروحه''۔

''یعنی حضور ﷺ کو حضور کے جسم اقدس اور روح مبارک کے ساتھ دیکھنا محال نہیں ہے''۔

---

[1] تفسیر روح المعانی (عربی)، ~~مطبوعہ ملتان، ص ٣٦، ج ٢٢~~ دار احیاء تراث العربی بیروت جلد ٢٢، ص ٣٦

حضور ﷺ کا جمال دیکھنے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دیکھنے والے نے حضور کی ذات اقدس اور روح مبارک کو دیکھا اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جمال محمدی دیکھنے والا حضور سید عالم ﷺ کے اس مبارک جسم مثالی کو دیکھ رہا ہے جس کے ساتھ حضور ﷺ کی روح مجردہ قدسیہ متعلق ہے اور اس امر سے کوئی شے مانع نہیں ہے کہ حضور ﷺ کے مثالی اجسام بے شمار تعداد میں متعدد ہو جائیں اور ہر جسد اقدس کے ساتھ روح مقدس کا بالکل وہی تعلق رہے جو ایک جسم کے الگ الگ اعضاء اور اجزاء کے ساتھ ہوتا ہے جیسا کہ روح المعانی میں نہایت تفصیل کے ساتھ وارد ہے ملاحظہ فرمائیے :

" والمرئي اما روحه عليه الصلوٰة والسلام التي هي اكمل الارواح تجرداً وتقديسا بان تكون قد تطورت وظهرت بصورة مرئية بتلك الرؤية مع بقاء تعلقها بجسده الشريف الحي في القبر السامي المنيف على حد ما قاله بعضهم من ان جبريل عليه السلام مع ظهوره بين يدي النبي عليه الصلوٰة والسلام في دحية الكلبي اوغيره لم يفارق سدرة المنتهى واما جسد مثالي تعلقت به روحه ﷺ المجردة القدسية ولا مانع من ان يتعدد الجسد المثالي الي ما لا يحصى من الاجساد مع تعلق روحه القدسية عليه من الله تعالى الف الف صلوٰة وتحية بكل جسد منها ويكون هذا التعلق من قبيل تعلق الروح الواحدة باجزاء بدن واحد ولا تحتاج في ادراكاتها واحساساتها في ذلك التعلق الي ما تحتاج اليه من الالات في تعلقها بالبدن في الشاهد وعلى ما ذكر يظهر وجه ما نقله الشيخ صفي الدين بن ابي منصور، والشيخ عبد الغفار عن شيخ ابي العباس الطبخي

من انه رأي السماء والارض والعرش والكرسي مملوءة من رسول الله ﷺ وينحل به السوال عن كيفية رؤية المتعددين له عليه الصلوٰة والسلام في زمان واحد في اقطار متباعدة ولا يحتاج معه الى ما اشار اليه بعضهم وقد سئل عن ذلك فانشد"

كالشمس في كبد السماء وضوؤها

يغشى البلاد مشارقا ومغاربا[1]

"اور جو چیز دیکھنے میں آتی ہے وہ یا روح مبارک ہے نبی کریم ﷺ کی جو تجرد اور تقدس کے لحاظ سے تمام روحوں میں سب سے زیادہ کامل ہے، بایں طور کہ وہ روح مبارک ظاہری صورت میں اس رؤیت کے ساتھ نظر آنے لگتی ہے اور اس روح اقدس کا تعلق حضور ﷺ کے اس جسد مبارک کے ساتھ باقی ہے جو قبر مبارک میں زندہ ہے، یہ قول بعض محققین کے اس قول کے بالکل مطابق ہے کہ جبریل علیہ السلام جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے حضرت دحیہ کلبی وغیرہ کی صورت میں حاضر ہوتے تھے تو سدرۃ المنتہیٰ سے جدا نہ ہوتے تھے (دیکھئے جبریل علیہ السلام زمین پر بھی ہیں اور اسی وقت سدرۃ المنتہیٰ پر بھی موجود ہیں) اور یا مثالی جسم نظر آتا ہے جس کے ساتھ روح مجردہ قدسیہ متعلق ہے اور اس سے کوئی شئے مانع نہیں ہے کہ حضور ﷺ کے مثالی جسم لا تعداد ولاتحصیٰ ہو جائیں اور روح قدسیہ کا تعلق ہر جسم سے مساوی طور پر رہے اور یہ تعلق بالکل ایسا ہے جیسا کہ ایک روح ایک بدن کے الگ الگ اجزاء و اعضاء سے تعلق رکھتی ہے اور مثالی جسموں میں وہ روح اپنے ادراکات و احساسات میں ان آلات کی قطعاً محتاج نہیں ہوتی جن کی ضرورت اسے کسی مشاہدہ کرنے والے شخص میں اس کے بدن کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہے (مثلاً جسم کا کوئی عضو جسم

---

[1] روح المعانی، پ ۲۲، ص ~~۳۵، مطبوعہ مصر~~ دار احیاء التراث العربی بیروت
جلد ۲۲ ص ۳۶

سے الگ ہو جائے تو روح کا تعلق اس سے نہیں رہتا، اس کے برخلاف مثالی جسم بے شمار تعداد میں الگ الگ اور دور دور ہوتے ہیں پھر بھی ان سب سے روح کا تعلق ہوتا ہے اور تمام جسموں کے ساتھ روح کے ادراکات اور احساسات اور ہر قسم کے تصرفات ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ کاظمی) اور اس بیان پر اس قول کی وجہ بھی ظاہر ہو جاتی ہے، جس کو شیخ صفی الدین بن منصور، اور شیخ عبدالغفار نے حضرت شیخ ابوالعباس طنجی سے نقل کیا اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابوالعباس طنجی نے آسمانوں اور زمینوں اور عرش اور کرسی کو رسول اللہ ﷺ سے بھرا ہوا دیکھا، نیز اس بیان سے یہ سوال بھی حل ہو جاتا ہے کہ متعدد لوگ ایک ہی وقت میں دُور دراز مقامات پر رسول اللہ ﷺ کو کس طرح دیکھ سکتے ہیں، پھر یہ کہ اس بیان کے ہوتے ہوئے اس مضمون کی بھی حاجت نہیں رہتی جس کی طرف بعض بزرگوں نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے جب ان سے اس رؤیت کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے یہ شعر پڑھ دیا۔

كالشمس فى كبد السماء وضوء ها

يغشى البلاد مشارقا ومغاربا

یعنی نبی کریم ﷺ اس سورج کی طرح ہیں جو آسمان کے وسط میں ہو اور اس کی روشنی مشرقوں اور مغربوں کے تمام شہروں کو ڈھانک لے''۔

حضور ﷺ کے لئے اقطارِ عالم کے اندر تشریف فرما ہونا کیونکر ناممکن ہو سکتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھئے کہ آسمان پر ہونے کے باوجود زمین پر بھی تشریف فرما ہوتے ہیں اور ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس وقت صرف زمین پر ہیں، آسمان پر نہیں، علامہ سید محمود آلوسی صاحب روح المعانی اسی روح المعانی میں فرماتے ہیں:

'' اخرج ابن عدي عن انس بينا نحن مع رسول الله ﷺ اذ رأينا بردا ق ويدا فقلنا يا رسول الله ماهذا البرد الذي رأينا

والید؟ قال قد رأیتموہ قالوا نعم قال ذلك عیسیٰ بن مریم سلّم علیّ"۔ [1]

"ابن عدی نے حضرت انس سے روایت کیا اس اثناء میں کہ ہم (صحابہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے ناگہاں ہم نے ایک چادر اور ایک ہاتھ دیکھا، ہم نے عرض کیا یارسول اللہ! (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کیا ہے یہ چادر جو ہم نے دیکھی اور یہ ہاتھ کیسا ہے؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تم نے دیکھا ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا حضور ہاں! فرمایا یہ عیسیٰ بن مریم ہیں جنہوں نے مجھ پر سلام عرض کیا"۔

اور سنئے!

اسی مقام پر بلکہ اسی حدیث کے نیچے صاحب روح المعانی ایک دوسری حدیث ارقام فرماتے ہیں ملاحظہ فرمائیے:

"وفي رواية ابن عساكر عنه كنت اطوف مع النبي ﷺ حول الكعبة اذ رأيته صافح شيئا ولم اره قلنا يا رسول الله صافحت شيئا ولا نراه قال ذلك اخي عيسىٰ بن مريم انتظرته حتى قضىٰ طوافه فسلمت عليه"۔ [2]

"اور ابن عساکر کی ایک روایت میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کعبہ کا طواف کر رہا تھا، ناگہاں میں نے رسول اللہ کو دیکھا کہ آپ نے کسی سے مصافحہ فرمایا اور میں نے اسے نہیں دیکھا، ہم نے عرض کیا، یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ نے کسی سے مصافحہ فرمایا مگر ہم نے اس کو نہیں دیکھا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا وہ میرے بھائی عیسیٰ ابن مریم ہیں، میں ان کا انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ وہ اپنے طواف سے فارغ ہو گئے پھر میں نے ان پر سلام پیش کیا"۔

[1] تفسیر روح المعانی: طبع دار احیاء التراث العربی بیروت، جلد ۲۲، [illegible]

[2] ایضاً

دیکھئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں پر رونق افروز ہوتے ہوئے زمینوں پر بھی موجود ہیں اور ایک عیسیٰ علیہ السلام پر کیا موقوف ہے احادیث صحیحہ کی روشنی میں علیٰ روس الاشہاد عرض کرتا ہوں کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور مقربان بارگاہ ایزدی کسی ایک مکان میں مقید نہیں ہوتے۔ ایک مکان کیا بلکہ ایک جہان میں بھی وہ مقید نہیں ہوتے بلکہ بیک وقت تمام جہانوں میں تشریف فرما ہوں تو ممکن بلکہ واقع ہے۔ حدیث شریف میں ہے حضور سید عالم ﷺ نے شب معراج بیت المقدس میں انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی امامت فرمائی اور تمام انبیاء و رسل نے حضور کے پیچھے نماز پڑھی جیسا کہ تفسیر ابن جریر، جزو ۱۵ ص ۳ پر ہے :

''ثم انطلقنا حتي اتينا الي بيت المقدس فصليت فيه بالنبيين والمرسلين اماماً ثم عرج بي الي السماء الدنيا''۔

''حضور ﷺ فرماتے ہیں پھر ہم چلے یہاں تک کہ بیت المقدس پہنچے میں نے وہاں تمام نبیوں اور رسولوں کو امام بن کر نماز پڑھائی، پھر مجھے پہلے آسمان کی طرف لے جایا گیا''۔

یہی مضمون ابو یعلیٰ نے اُم ہانی سے، مسلم نے ابو سلمہ اور سیدنا ابن مسعود سے، طبرانی نے اوسط میں ابی امامہ سے اور بیہقی نے ابو سعید سے، اور امام احمد نے حضرت ابن عباس سے روایت فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے : مواہب اللدنیہ، جزو ۲ ص ۱۶۔۱۷، مطبوعہ مصر، صحیح مسلم، جلد ۱ ص ۹۶، مطبع انصاری دہلی، باب الاسراء برسول اللہ ﷺ وفرض الصلوات۔

بیت المقدس میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو نماز پڑھا کر حضور ﷺ آسمانوں پر تشریف لے گئے اور وہاں آدم علیہ السلام، یحییٰ و عیسیٰ علیہما السلام، یوسف علیہ السلام، ادریس علیہ السلام، ہارون علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا اور ان سب سے ملاقات فرمائی۔ بخاری شریف، جلد ۱ ص ۵۴۸۔۵۴۹، مطبوعہ اصح المطابع، باب المعراج، مسلم شریف، مطبوعہ اصح المطابع، جلد ۱ ص ۹۳، باب الاسراء برسول اللہ ﷺ۔

یہاں قابل غور یہ امر ہے کہ ان میں سے جو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام وفات پاچکے ہیں

وہ اپنی قبور مبارکہ کے اندر عالم برزخ میں بھی موجود ہیں جو ایک مستقل جہان ہے اور اس جہان دنیا میں بھی مسجد بیت المقدس میں حضور ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں، اور جب حضور سید عالم ﷺ آسمانوں پر رونق افروز ہوتے ہیں (جسے عالم آخرت کہنا چاہئے) تو وہاں بھی اپنے اپنے مقامات پر یہ حضرات موجود ہیں، معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بیک وقت عالم دنیا، عالم برزخ اور عالم آخرت میں موجود ہیں، جب ہر عالم میں حضرات کا بیک وقت موجود ہونا ثابت ہے تو حضور سید عالم کا ہر مکان میں موجود ہونا کیونکر ناممکن ہو سکتا ہے؟

دیکھئے اسی حدیث معراج سے بالکل یہی مضمون امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ثابت کیا ہے، چنانچہ امام موصوف "الیواقیت والجواہر"، جلد دوم، ص ۳۶، مطبوعہ مصر میں فوائد معراج کی تفصیل فرماتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں :

"ومنها شهود الجسم الواحد في مكانين في اٰن واحد كما راٰي محمد ﷺ نفسه في اشخاص بني اٰدم السعداء حين اجتمع به في السماء الاولىٰ كما مر وكذلك اٰدم وموسىٰ وغيرهما فانهم في قبورهم في الارض حال كونهم ساكنين في السماء فانه قال راٰيت اٰدم. راٰيت موسىٰ راٰيت ابراهيم واطلق وما قال راٰيت روح اٰدم ولا روح موسىٰ فراجع ﷺ موسىٰ في السماء وهو بعينه في قبره في الارض قائما يصلي كما ورد فيا من يقول ان الجسم الواحد لا يكون في مكانين كيف يكون ايمانك بهذا الحديث فان كنت مؤمنا فقلد وان كنت عالما فلا تعترض فان العلم يمنعك وليس لك الاخبار فانه لا يخبر الا الله وليس لك ان تتاول ان الذي في الارض غير الذي في السماء لقوله عليه الصلوٰة والسلام راٰيت موسىٰ واطلق وكذلك سائر من

راٰه من الانبياء هنالك فالمسمي موسيٰ ان لم يكن عينه فالاخبار عنه كذاب انه موسيٰ هذا''۔

''اور فوائد معراج میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ایک جسم آن واحد میں دو مکانوں میں حاضر ہوگیا جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نیک بخت اولاد آدم کے افراد میں خود اپنی ذات کریمہ کو بھی ملاحظہ فرمایا، جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ پہلے آسمان پر جمع ہوئے تھے جیسا کہ گذرا اور اسی طرح آدم اور موسیٰ علیہما السلام اور ان کے علاوہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ پس بے شک وہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام زمین میں اپنی قبروں کے اندر ہیں دراں حالیکہ وہ آسمانوں میں بھی سکونت رکھتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مطلقاً اس طرح فرمایا کہ میں نے آدم علیہ السلام کو دیکھا، ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا۔ روح کی قید کے ساتھ مقید فرما کر اس طرح نہیں فرمایا کہ میں نے آدم علیہ السلام کی روح کو دیکھا اور نہ یوں فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کی روح کو دیکھا (جس سے ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعینہ ان انبیاء علیہم السلام ہی کو دیکھا تھا نہ کہ ان کی ارواح یا امثال کو) پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چھٹے آسمان پر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ گفتگو اور مراجعت فرمائی حالانکہ موسیٰ علیہ السلام بعینہ زمین میں اپنی قبر شریف کے اندر کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے جیسا کہ (مسلم شریف) کی حدیث میں وارد ہوا ہے، پس انتہائی افسوس ہے اور تعجب اس کہنے والے پر جو یہ کہتا ہے کہ ایک جسم بیک وقت دو مکانوں میں نہیں ہوسکتا (اے قائل) ذرا یہ تو بتادے کہ اس قول کے ہوتے ہوئے تیرا ایمان اس حدیث پر کیونکر ہوسکتا ہے۔ اگر تو مومن ہے تو تجھے مان لینا چاہئے، اگر تو عالم ہے تو اعتراض نہ کر، اس لئے کہ علم تجھے روکتا ہے اور تجھے حقیقت حال کا علم ہے نہیں، اس لئے کہ یہ علم حقیقۃً اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، اور تیرے لئے یہ بات بھی جائز نہیں کہ تو اس حدیث میں یہ تاویل کرلے کہ جو انبیاء زمین میں ہیں وہ ان کے غیر ہیں جنہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آسمان میں دیکھا، اس لئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے رآیت موسیٰ مطلقاً فرمایا، اور اسی طرح باقی انبیاء

امام عبدالوہاب شعرانی، الیواقیت والجواہر، جلد دوم، ص ۳۲

علیہم السلام کے متعلق جنہیں حضور علیہ السلام نے آسمانوں میں دیکھا (یہ نہیں فرمایا کہ میں نے آسمانوں میں ان کے غیر کو دیکھا جو زمین میں ہیں) تو حضور ﷺ نے جن کو موسیٰ فرمایا، اگر وہ بعینہٖ موسیٰ علیہ السلام نہ ہوں تو ان کے متعلق یہ خبر دینا کہ وہ موسیٰ ہیں کذب ہوگا، العیاذ باللہ۔۔۔

آگے چل کر امام شعرانی نے فرمایا:

"ثم ان المعترض ینکر علی الاولیاء مثل هذا في تطوراتهم وقد كان قضيب البان يتطور فيما شاء من الصور في اماكن متعددة وكل صورة خرطب فيها اجاب ان الله علي كل شئي قدير"۔

"فرماتے ہیں پھر معترض اولیاء اللہ کے متعدد صورتوں میں ظاہر ہونے کا انکار کرتا ہے حالانکہ قضیب البان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن صورتوں میں چاہتے تھے مختلف مقامات میں متصور ہو کر ظاہر ہو جاتے تھے اور جس صورت میں بھی آپ کو پکارا جاتا تھا، آپ ضرور جواب دیتے تھے، بے شک اللہ تعالیٰ ہر بات پر قادر ہے"۔[1]

بزرگانِ دین کا اپنی روحانیت اور نورانیت کے ساتھ متمثل ہو کر متعدد مقامات میں ظاہر ہونا درحقیقت ایک ایسا کمال ہے جو ان حضرات کو قوتِ قدسیہ کی تکمیل کے بعد حاصل ہو جاتا ہے، دیکھئے صاحب روح المعانی اپنی تفسیر، پارہ ۲۳، ص ۱۳ پر ارشاد فرماتے ہیں:

"والانفس الناطقة الانسانية اذا كانت قدسية قد تنسلخ من الابدان وتذهب متمثلة ظاهرة بصور ابدانها او بصور اخري كما يتمثل جبريل عليه السلام ويظهر بصورة دحية او بصورة بعض الاعراب كما جاء في صحيح الاخبار حيث

---

[1] الیواقیت والجواہر جلد ۲، ص ۳۲، مطبوعہ مصر

یشاء الله عزوجل مع بقاء نوع تحلق لها بالابدان الاصلیة یتاتی معه صدور الافعال منها کما یحکي عن بعض الاولیاء قدست اسرارهم انهم یرون في وقت واحد في عدة مواضع وما ذاکا الا لقوة تجرد انفسهم وغایة تقدسها فتمثل وتظهر في موضع وبدنها الاصلي في موضع آخر ''

لاتقل دارها الشرقی نجد

کل نجد للعامریة دار [۱]

''اور انسانی روحیں جب مقدس ہوجاتی ہیں تو کبھی اپنے بدنوں سے الگ ہو کر ان ہی بدنوں کی صورتوں یا دوسری شکلوں میں ظاہر ہو کر جبریل علیہ السلام کی طرح جیسا کہ دحیہ کلبی یا بعض اعراب کی صورت میں ظاہر ہوتے تھے جس طرح صحیح حدیثوں میں وارد ہوا ہے، جہاں اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تشریف لے جاتی ہیں، اور ان کا اپنے اصلی بدنوں کے ساتھ ایک قسم کا تعلق بھی باقی رہتا ہے اور وہ تعلق ایسا ہوتا ہے کہ جس کی وجہ سے بدنوں سے ان روحوں کے کام صادر ہوتے رہتے ہیں، چنانچہ بعض اولیا قدست اسرارہم کے متعلق منقول ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں متعدد مقامات پر دیکھے جاتے ہیں اور یہ بات صرف اس وجہ سے ہے کہ ان کی روحیں قوت تجرد اور انتہائے تقدس میں اعلیٰ مرتبہ حاصل کر لیتی ہیں، اس وجہ سے وہ روحیں متمثل ہو کر کسی جگہ ظاہر ہوتی ہیں، حالانکہ ان کا اصل بدن دوسرے مقام پر ہوتا ہے ۔

تم یہ نہ کہو کہ اس کا گھر شرقی جانب میں ہے ۔ بلکہ تمام نجد عامریہ کا گھر ہے

اس کے بعد متصلاً صاحب روح المعانی فرماتے ہیں :

''وهذا امر مقرر عند السادة الصوفیة مشهور فیما بینهم وهو غیر طے المسافة وانکار من ینکر کلا منها علیهم مکابرة لا تصدر الا من جاهل او معاند وقد عجب العلامة

[۱] تفسیر روح المعانی، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت، جلد ۲۲، ص ۱۴

التفتازاني من بعض فقهاء اهل السنة اي کابن مقاتل حيث حکم بالکفر علي معتقد ما روي عن ابراهيم بن ادهم قدس سره انهم رأوه بالبصرة يوم التروية وروي ذلك اليوم بمکة ومبناه زعم ان ذلك من جنس المعجزات الکبار وهو مما لا يثبت کرامة لولي وانت تعلم ان المعتمد عندنا جواز ثبوت الکرامة للولي مطلقا الا فيما يثبت بالدليل عدم امکانه کالاتيان بسورة من احدي سورة القرآن وقد اثبت غير واحد تمثل النفس وتطورها لنبينا ﷺ بعد الوفاة وادعي انه عليه الصلوة والسلام قد يري في عدة مواضع في وقت واحد مع کونه في قبره الشريف يصلي وقد تقدم الکلام مستوفي في ذلك وصح انه ﷺ رأي موسي عليه السلام يصلي في قبره عند الکثيب الاحمر ورأه في السماء وجري بينهما جري في امر الصلوات المفروضة وکونه عليه السلام عرج الي السماء بجسده الذي کان في القبر بعد ان راه النبي ﷺ مما لم يقله احد جزما والقول به احتمال بعيد وقد راي ليلة اسري به جماعة من الانبياء غير موسي عليه السلام في السموات مع ان قبورهم في الارض ولم يقل احد انهم نقلوا منها اليها علي قياس ما سمعت انفا وليس ذلك مما ادي الحکميون استحالة من شغل النفس الواحدة اکثر من بدن واحد بل هو امر وراءه کما لا يخفي من نور الله تعالي بصيرته۔ انتهي[1]

''اور یہ امر سادات صوفیہ کے نزدیک ثابت شدہ اور ان کے درمیان مشہور ہے اور وہ

---

[1] روح المعانی، پ ۲۳، ص ۱۲، مطبوعہ مصر، ص ۱۴۰ (دار احیاء التراث العربی، بیروت)

طے مسافت کے علاوہ ہے اور جو شخص ان دونوں کمالوں (طے مسافت اور بیک وقت مقامات متعددہ میں ان کا موجود ہونا) کا منکر ہے، اس کا انکار مکابرہ ہے جو سوائے جاہل یا معاند کے کسی سے صادر نہیں ہوسکتا، اور علامہ سعد الدین تفتازانی نے ابن مقاتل جیسے بعض فقہاء اہل سنت پر سخت تعجب کا اظہار کیا ہے، اس حیثیت سے کہ انہوں نے ایسے شخص پر کفر کا حکم لگایا جو ابراہیم بن ادہم قدس سرہ کے متعلق اس روایت کا معتقد ہے کہ لوگوں نے انہیں ذی الحج کی آٹھویں تاریخ کو بصرہ میں دیکھا اور وہ اسی دن مکہ میں بھی دیکھے گئے اور ان کے حکم کفر کا مدار اس امر پر ہے کہ انہوں نے یہ گمان کرلیا کہ ایک وقت میں متعدد مقامات پر موجود ہونا انبیاء علیہم السلام کے بڑے معجزات میں سے ہے اور یہ ان امور میں سے ہے جو ولی کے لئے بطور کرامت ثابت نہیں ہوسکتے، حالانکہ تو جانتا ہے کہ ہم اہل سنت کے نزدیک معتبر مسلک یہ ہے کہ نبی کا معجزہ ولی کے لئے بطور کرامت ثابت ہوسکتا ہے، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا سوائے اس معجزہ کے جس کا صدور ولی کے حق میں بطور کرامت ناممکن ہونا دلیل شرعی سے ثابت ہوجائے جس طرح قرآن مجید کی سورتوں میں سے کسی سورت کی مثل لے آنا (اس کے سوا باقی تمام معجزات خواہ وہ کیسے ہی عظیم الشان ہوں، اولیاء اللہ کے لئے بطور کرامت ان کا صدور وظہور ہوسکتا ہے) اور بکثرت علماء محققین نے حضور ﷺ کے لئے وفات شریف کے بعد آپ کی روح اقدس کے متمثل ہوکر ظہور فرمانے کو ثابت کیا ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضور ﷺ بسا اوقات ایک ہی وقت میں بہت سی جگہوں میں دیکھے جاتے ہیں، حالانکہ حضور ﷺ اپنی قبر شریف میں نماز پڑھ رہے ہیں اور اس مسئلہ میں اس سے پہلے نہایت تفصیلی کلام گذر چکا ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ حضور ﷺ نے سرخ رنگ کے ٹیلے کے نزدیک موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قبر شریف میں کھڑے ہوئے نماز پڑھتے دیکھا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں آسمان میں بھی دیکھا اور سب جانتے ہیں کہ فرض نمازوں کے بارے میں حضور ﷺ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان کیا گفتگو ہوئی اور نبی ﷺ کے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھنے

کے بعد موسیٰ علیہ السلام کا اپنے اسی جسم کے ساتھ جو قبر شریف میں تھا آسمانوں پر لے جایا جانا یقیناً ایسی بات ہے کہ آج تک کسی نے نہیں کی، اور ویسے بھی یہ قول احتمال بعید ہے (پھر یہ امر بھی قابل غور ہے) کہ نبی کریم ﷺ نے معراج کی رات موسیٰ علیہ السلام کے علاوہ اور انبیاء علیہم السلام کو بھی آسمانوں پر دیکھا، باوجود اس کے کہ ان کی قبور مقدسہ زمین میں ہیں اور یہ بات بھی آج تک کسی نے نہیں کہی کہ وہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں سے آسمانوں کی طرف منتقل کر دیئے گئے، جیسا کہ تم ابھی سن چکے ہو (ساتھ ہی یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے) کہ یہ بیک وقت متعدد مقامات میں ان مقدس حضرات کا موجود ہونا اس قبیلہ سے نہیں ہے جس کے محال ہونے کا فلسفیوں نے دعویٰ کیا ہے، کہ ایک روح کا شغل ایک بدن سے زائد بدنوں کے ساتھ ناممکن ہے، ان حضرات کا یہ کمال فلاسفہ کی محال قرار دی ہوئی صورت کے علاوہ اور اس سے بہت بلند ہے، جیسا کہ یہ حقیقت ان لوگوں پر ظاہر ہے جن کی بصیرت کو اللہ تعالیٰ نے روشن فرما دیا۔

مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی نے روح المعانی کی یہ عبارت فتح الملہم میں نقل کی ہے اور یہ تسلیم کیا ہے کہ حضور ﷺ باوجود اپنی قبر شریف میں رونق افروز ہونے کے بیک وقت متعدد مقامات پر دیکھے جاتے ہیں، ملاحظہ فرمائیے فتح الملہم، جلد اول، ص ۳۰۵، مطبوعہ مدینہ پریس بجنور۔

دیکھئے دیوبندی علماء بھی رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضور کے متعدد مقامات پر تشریف فرما ہونے کے قائل ہیں۔

فیض الباری، جزو اول، مطبوعہ قاہرہ، ص ۲۰۴ پر انور شاہ صاحب کشمیری فرماتے ہیں:

” ویمكن عندي رؤيته ﷺ يقظة لمن رزقه الله سبحانه كما نقل عن السيوطي رحمه الله تعالى انه راٰه ﷺ اثنين وعشرين مرة وسأله عن احاديث ثم صححها بعد

تصحیحہ صلی اللہ علیہ وسلم''۔

''اور میرے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جاگتے ہوئے بیداری کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنا ممکن ہے جس کو اللہ تعالیٰ یہ نعمت عطا فرمائے، جیسا کہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بائیس مرتبہ دیکھا ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض احادیث کے متعلق سوال کیا، پھر حضور علیہ السلام کی تصحیح کے بعد سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو صحیح کر لیا۔

اس کے بعد انور شاہ صاحب نے امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور حضور کے سامنے اپنے آٹھ رفقاء کی معیت میں بخاری شریف پڑھی، یہ لکھ کر انور شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ''فالرویۃ متحققۃ وانکارھا جھل'' یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بیداری میں دیکھنا متحقق اور ثابت ہے اور اس کا انکار جہل صریح ہے۔

انور شاہ کشمیری فیض الباری شرح صحیح بخاری جلد ۱ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۲۶ھ ص ۲۹۲

---

۲ کتاب ''تسکین الخواطر فی مسئلۃ الحاضر والناظر'' از علامہ کاظمی

حدیث نمبر (۱۳)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی عطا سے قاسم ہیں

''عن معاویة قال قال رسول الله ﷺ ... وانما انا قاسمٌ والله یعطي''

''اور بے شک میں تقسیم کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے''۔ [1]

"یعطی" فعل ہے اور "قاسم" صیغہ اسم فاعل، اسم فاعل اور اسم مفعول یہ سب مشبہ فعل ہوتے ہیں، یعطی فعل ہے اور قاسم مشبہ یا فعل، اور قاعدہ ہے کہ کبھی مشبہ فعل کا معمول حذف کیا جاتا ہے، فصاحت و بلاغت کی کتابیں جیسے ''مختصر المعانی'' بیان کی شرحیں آپ پڑھیں، تو فعل و مشبہ فعل کے معمولات کو حذف کرنے کی وجوہات کا پتہ چل جائے گا، کبھی فعل اور مشبہ فعل معمول کو اس لئے حذف کیا جاتا ہے کہ معمول عام ہو جائے اور کبھی فعل اور مشبہ فعل کے عموم کو ثابت کرنے کے لئے معمول کو حذف کیا جاتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "واللہ یعطی" اللہ دیتا ہے، اللہ کیا دیتا ہے؟ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یعطی کا مفعول ذکر نہیں کیا کہ اللہ کیا دیتا ہے؟ کیونکہ اللہ ہر چیز دیتا ہے کس کس چیز کا ذکر کیا جائے، لہذا ان چیزوں کا ذکر نہ کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ دیتا ہے وہ عام ہے کبھی مفعول کے عام ہونے پر دلالت کرنے کے لئے مفعول کو حذف کر دیا جاتا ہے، جس طرح یعطی کا مفعول عام ہے اور اسی طرح "وانا قاسم" کا مفعول بھی عام ہے، یعنی اللہ تعالیٰ سب کچھ دیتا ہے اور میں سب کچھ بانٹتا ہوں، نہ اللہ تعالیٰ کے دینے میں کمی ہے اور نہ میرے تقسیم کرنے میں کوئی کمی ہے، اس کی عطا بھی عام ہے میری تقسیم بھی عام ہے، وہ دنیا بھی دیتا ہے میں دنیا بھی بانٹتا ہوں، وہ دین بھی دیتا ہے میں دین

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب العلم، فصل اول، حدیث ۳ مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور، جلد ۱، ص ۲۲

بھی تقسیم کرتا ہوں، علم، اولاد، ایمان غرض یہ کہ دین و دنیا کی ہر نعمت وہ دیتا ہے اور میں بانٹتا ہوں۔

ایک سوال:

''واللہ یعطی و انا قاسم'' تو حضور ﷺ کی حیات دنیاوی کے ساتھ خاص تھی۔

جواب:

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جو شخص حضور ﷺ کی حیات کو نہ مانتا ہو وہ مومن بھی نہیں، کیونکہ یعطی میں استمرار ہے اور استمرار میں دوام کے معنی ہیں، جب حیات ختم ہوگئی تو عطا میں دوام کیسے ہوا؟ معلوم ہوا کہ نہ حیات ختم ہوئی اور نہ عطا، عطا مستمر ہے تو حیات بھی، اگر عطا منقطع ہو جائے تو حیات بھی منقطع ہوگئی، عطا منقطع ہوتی نہیں کیونکہ عطا میں استمرار ہے لہذا زندگی بھی منقطع نہیں ہوتی، اگر حضور نبی کریم ﷺ کی حیات کا انکار کریں گے تو عمل رسالت کا انکار کرنا پڑے گا، اور عمل رسالت کا انکار ہم کر ہی نہیں سکتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا''[1]

''بڑی برکت والا ہے وہ جس نے فیصلہ کرنے والی کتاب اپنے (مقدس) بندے پر اتاری تاکہ وہ تمام جہانوں کے لئے ڈرانے والا ہو''۔

میرے آقا ﷺ العالمین کے لئے نذیر اور رسول ہیں۔

''وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ''[2]

''اور ہم نے تمہیں نہیں بھیجا مگر (اے محبوب) سارے جہانوں کے لئے رحمت بنا کر''

العالمین کے اندر دنیا بھی ہے اور عقبیٰ بھی، العالمین کے اندر عالم برزخ بھی ہے اور

---

[1] سورۃ الفرقان، آیت ١

[2] سورۃ الانبیاء، آیت ١٠٧

عالم آخرت بھی، العالمین کے اندر عالم بیداری بھی ہے اور عالم نوم بھی، الغرض زمین، آسمان، ظاہر، باطن، تمام عالم خلق، تمام عالم امر، عالم اجسام، عالم ارواح، عالم جواہر، عالم اعراض، عالم معانی سب کچھ العالمین کے عموم میں شامل ہیں اور میرے آقا تمام عالموں کے رسول ہیں اور رسول کے معنی ہیں پیغام پہنچانے والا، پیغام پہنچانا ایک عمل ہے اور عمل حیات پر دلیل ہے، جہاں عمل ختم ہو جاتا ہے وہاں حیات ختم ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب تک کسی کی نبض چلتی رہے، دل کی حرکت قائم رہے، تو حیات باقی ہے کیونکہ دل کا حرکت کرنا نبض کا چلنا یہ ایک عمل ہے، جب تک عمل ہے تو حیات ہے عمل نہیں تو حیات نہیں لہٰذا میرے آقا ہر آن اور ہر وقت رسول ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

اگر میرے آقا ہر آن اور ہر وقت رسول نہیں ہیں تو وہ وقت بتاؤ جس وقت حضور ﷺ رسول نہیں ہیں؟ جب کوئی ایسا وقت نہیں ہے کہ جس وقت عمل رسالت نہ ہو، اور جس وقت عمل رسالت نہیں ہوگا اس وقت حضور رسول نہیں ہوں گے، اور جس وقت سرکار رسول نہیں ہوں گے، اس وقت ہم آپ ﷺ کے رسول ہونے کا کلمہ کیسے پڑھ سکتے ہیں؟ اس لئے ہر وقت اس کلمہ کا ہمارے اندر ہونا ضروری ہے، تو پتہ چلا کہ ہر وقت آپ ﷺ کا رسول ہونا ضروری ہے، اور یہ اس وقت ہوگا جب ہر وقت آپ کا عمل رسالت جاری ہو اور عمل رسالت تب ہی جاری رہے گا جب حیات جاری رہے گی، کیونکہ عمل بغیر حیات کے ہو نہیں سکتا، جہاں عمل ختم ہو گیا وہاں حیات ختم ہو گئی اور حضور ﷺ کا عمل رسالت تاقیامت جاری ہے اور جاری رہے گا، حضور کی سخا اور عطا کی کوئی حد نہیں، آپ ﷺ اپنے امتیوں میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ تمام نعمتوں کو بانٹ رہے ہیں۔ [1]

---

1. خطبات کاظمی، حصہ دوم مطبوعہ مکتبہ انوار صوفیہ علی پور، ضلع مظفر گڑھ ص ۹۱ تا ۹۴

حدیث نمبر (۱۴)

وسیلہ بعد از وصال

"عن عثمان بن حنیف ان رجلا ضریر البصر أتي النبي ﷺ فقال: ادع الله لي ان یعافیني فقال: إن شئت اخرت لك وهو خیرٌ وان شئت دعوت۔ فقال: ادعه۔ فامره ان یتوضأ فیحسن وضوءه، ویصلي رکعتین، ویدعو بهذا الدعاء: اللهم انی اسئلك، واتوجه الیك بمحمد نبي الرحمة، یا محمد! انی قد توجهت بك الیٰ ربي في حاجتي هذه لتقضي، اللهم! فشفعه في"۔ قال ابو اسحق: هذا حدیث صحیحٌ[1]

ترجمہ: "حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک نابینا حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو اس نے عرض کیا کہ حضور میرے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے بینائی عطا فرمائے، حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا! اگر تو چاہے تو میں تیرے لئے مؤخر کردوں (یعنی آخرت میں تجھے اس کا فائدہ پہنچے) اور وہ تیرے لئے بہتر ہے اور اگر تو چاہے تو دعا کردوں، اس نے عرض کیا حضور! اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں، تو حضور ﷺ نے اسے فرمایا کہ وہ اچھی طرح وضو کرے اور دو رکعت نماز پڑھے اور یہ دعا مانگے، اے اللہ، میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیرے نبی رحمت ﷺ کے وسیلہ سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں، یارسول اللہ میں اپنی بینائی واپس کراتے میں آپ کو دربار خداوندی میں سفارشی پیش کرتا ہوں، اے اللہ

---

[1] سنن ابن ماجہ، جلد ثانی مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، لبنان ص ۱۵۶، ۱۵۷ مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۲۴ھ/۲۰۰۳ء

میرے حق میں اپنے نبی کریم ﷺ کی سفارش قبول فرما۔ ابو اسحاق نے کہا یہ حدیث صحیح ہے"۔

اسی حدیث کو نسائی اور ترمذی نے اختلاف یسیر کے ساتھ روایت کیا، اور ترمذی نے کہا حسنٌ صحیح، بیہقی نے بھی اس حدیث کی تصحیح کی اور اپنی روایت میں اتنے الفاظ اور زیادہ بیان کئے "**وقام وقد بصر**" یعنی وہ آدمی دعا مانگ کر جب کھڑا ہوا تو بینا ہوگیا۔

محدثین نے فرمایا کہ یہ حدیث حضور ﷺ کی حیات ظاہری میں حضور سے توسل اور طلب شفاعت کے جواز پر دلالت کرتی ہے، اور حضور کی وفات کے بعد حضور کو وسیلہ بنانے اور طلب شفاعت پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جسے طبرانی نے معجم کبیر میں انہیں حضرت عثمان بن حنیف سے روایت کیا ہے۔ وہ روایت حسب ذیل ہے:

" عن عثمان بن حنيف ان رجلا كان يختلف الي عثمان بن عفان رضي الله عنه في حاجة له، فكان عثمان لا يلتفت اليه ولا ينظر في حاجته، فلقي عثمان بن حنيف، فشكا ذلك اليه، فقال له عثمان بن حنيف: ائت الميضاة، فتوضأ، ثم ائت المسجد فصلي فيه ركعتين، ثم قل: اللهم اني اسئلك: واتوجه اليك بنبينا محمد ﷺ نبي الرحمه، يا محمد اني اتوجه بك الي ربي، فيقضي لي حاجتي، وتذكر حاجتك ... فانطلق الرجل فصنع ما قال له عثمان، ثم اتي باب عثمان فجاء البواب حتي اخذ بيده، فأدخله عثمان بن عفان، فاجلسه معه علي الطنفسة، وقال: حاجتك؟ فذكر حاجة فقضاها له، ثم قال له: ماذكرت حاجتك حتي كانت هذه الساعة۔ وقال: ما كانت لك من حاجة فائتنا، ثم ان الرجل خرج من عنده، فلقي عثمان بن حنيف۔ فقال له: جزاك الله خيرا،

ماكان ينظر في حاجتي ولا يلتفت الي حتي كلمة في فقال عثمان بن حنيف : والله ما كلمة ولكن شهدت رسول الله ﷺ واتاه ضرير فكشا عليه ذهاب بصره۔ فقال له النبي ﷺ :افتصبرو؟ فقال: يارسول الله انه ليس لي قائد ، وقد شق علي۔ فقال له النبي ﷺ ايت الميضاة ، فتوضا ، ثم صل ركعتين ثم ادع بهذه الدعوات ، قال عثمان : فوالله ما تفرقنا وطال بنا الحديث حتي دخل علينا الرجل كانه لم يكن به ضر رقط'' ؎

ترجمہ:''حضرت عثمان بن حنیف سے روایت ہے کہ ایک آدمی اپنی کسی حاجت کے بارے میں سیدنا عثمان بن عفان کے پاس آتا جاتا تھا، اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کی طرف توجہ نہ فرماتے تھے (اور کثرتِ مشاغل کی وجہ سے اس کا کام کرنا انہیں یاد نہ رہتا تھا) اور (اسی وجہ سے) وہ اس کی حاجت میں نظر نہیں فرماتے تھے، وہ آدمی عثمان بن حنیف سے ملا اور اس بات کی شکایت کی، عثمان بن حنیف نے اس سے کہا کہ پانی کا ایک برتن لے آ، پھر وضو کر، اس کے بعد مسجد میں آ، پھر دو رکعت نماز ادا کر اور یہ دُعا پڑھ "اللهم انی اسئلك واتوجه اليك نبينا محمد ﷺ نبی الرحمة يا محمد انی توجهت بك الی ربی فيقضی حاجتی "اور پھر اپنی حاجت کا ذکر کر، عثمان بن حنیف کی بات سن کر وہ آدمی چلا گیا اور اس نے وہی کیا جو عثمان بن حنیف نے کہا تھا، پھر وہ حضرت عثمان کے دروازہ پر آیا اور دربان کے پاس پہنچا، دربان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے حضرت عثمان غنی کی خدمت میں پیش کر دیا، حضرت عثمان غنی نے اس کو اپنے ساتھ قالین پر بٹھایا اور فرمایا تیری حاجت کیا ہے؟ اس نے اپنی حاجت بیان کی، حضرت عثمان غنی نے اسے فوراً پورا کر دیا، پھر فرمایا تیرا یہ کام اب تک مجھے یاد ہی نہیں آیا تھا، اور فرمایا کہ جو کچھ تجھے حاجت ہوا کرے مجھ سے بیان کر دیا کر، وہ آدمی حضرت عثمان غنی کے پاس سے نکلا تو عثمان

؎ المعجم الکبیر طبرانی ۹ حدیث ۸۳۱۱ ، ص ۱۷ ، الجزء التاسع
مطبوعہ مکتبہ ابن تیمیہ قاہرہ

بن حنیف سے ملاقات ہوگئی، وہ شخص عثمان بن حنیف سے کہنے لگا! اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میری حاجت میں کسی قسم کی توجہ نہ فرماتے تھے اور میری طرف کوئی التفات نہ کرتے تھے، یہاں تک کہ آپ نے ان سے میرے بارے میں کلام کیا، عثمان بن حنیف نے جواب دیا، خدا کی قسم میں نے تیرے بارے میں ان سے کوئی بات نہیں کی، لیکن میں شہادت دیتا ہوں کہ حضور ﷺ کی خدمت میں ایک نابینا آیا تھا اور اس نے اپنی نابینائی کی شکایت حضور کی بارگاہ میں پیش کی تھی، حضور علیہ السلام نے اس سے فرمایا تھا کہ تو اس حال پر صبر کرلے تو بہتر ہے، اس نے عرض کیا! یارسول اللہ، میرا کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں اور میری نابینائی مجھ پر بڑی شاق ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس سے فرمایا کہ پانی کا ایک برتن لے آاور وضو کر، پھر دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد دعا کے یہ کلمات ادا کر، ابن حنیف نے کہا کہ ابھی ہم متفرق نہ ہونے پائے تھے (حدیث کو طویل کرتے ہوئے کہا) کہ وہ آدمی ہم پر داخل ہوا گویا اسے (نابینائی کا) کبھی کوئی ضرر نہ پہنچا تھا"۔

علماء محدثین نے اس حدیث سے ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بعد الوفات بھی توسل اور استشفاع جائز ہے، ساتھ ہی ان دونوں حدیثوں سے ثابت ہوگیا کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات ظاہری اور بعد الوفات دونوں زمانوں میں لفظ "یا" کے ساتھ حضور کو پکارنا خود حضور علیہ السلام کے اپنے ارشاد کے مطابق ہے، جو شخص اس کا منکر ہوگا، وہ ارشاد رسول کا معاند اور منکر حدیث قرار پائے گا۔

تھانوی صاحب کی جرأت و بے باکی

حدیث شریف میں ترمیم کرڈالی

مولوی اشرف علی صاحب تھانوی نے ابن ماجہ شریف کی روایت منقولہ بالا میں رسول اللہ ﷺ کی تلقین فرمائی ہوئی دعا کے الفاظ میں سے "یامحمد انی قد توجھت بك الی ربی" کے الفاظ نکال دیئے، اور اپنی کتاب "مناجاتِ مقبول" ص ۱۱۴، مطبوعہ اصح المطابع بقول زشخصے "عذر گناہ بدتر از گناہ" یہ لکھ دیا کہ "اختصرته لان النداء الوارد فیه لا دلیل علی بقائه بعد حیاته علیه السلام" یعنی میں نے (صیغہ نداء اور خطاب کی تمام عبارت نکال کر) اس حدیث کو اس لئے مختصر کر دیا کہ اس حدیث میں (یا محمد کے الفاظ) جو ندا اور خطاب کے الفاظ وارد ہیں، حضور ﷺ کی حیات کے بعد ان کے باقی رہنے پر کوئی دلیل نہیں۔

میں عرض کروں گا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے خود بنفس نفیس یہ الفاظ تلقین فرمائے تو اب صیغۂ ندا و خطاب کا ہونا اصل قرار پاگیا، اور قاعدہ ہے کہ اصل اپنی بقاء میں محتاجِ دلیل نہیں ہوتی، بلکہ عدم بقا خلاف اصل ہونے کے باعث محتاج دلیل ہوگا، تھانوی صاحب کا "اصل" کو محتاج دلیل قرار دینا علم و عقل کی روشنی میں انتہائی تعجب انگیز ہے۔

علاوہ ازیں عہد خلافت عثمانیہ میں حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک حاجت مند کو یہی دعا بصیغۂ ندا و خطاب تلقین کرنا بروایت طبرانی ہم ابھی نقل کر چکے ہیں، اس سے بڑھ کر بقاء اور نداء پر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے؟ رہی یہ بات کہ اُس وقت کے مسلمان خوش عقیدہ تھے، اس زمانہ میں فسادِ عقیدہ امر شاہد ہے، لہٰذا حفاظت عوام کے لئے صیغۂ ندا کو حذف کرنا ضروری ہے تو یہ اور بھی زیادہ تعجب انگیز اور مضحکہ خیز ہے، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تشہد سے بھی "السلام علیک ایها النبی" کو حذف کردینا ضروری ہے، تھانوی صاحب نہ معلوم کس موڈ میں

لکھ گئے، انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ ابن ماجہ والی دعا تو کبھی کوئی مسلمان پڑھتا ہو گا لیکن السلام علیک ایھا النبی تو ہر مسلمان شب و روز ہر نماز میں پڑھتا ہے، حفاظت عوام کے لئے تو نماز سے صیغۂ ندا کا حذف کرنا سب سے زیادہ ضروری تھا، جب نماز میں اس کا باقی رہنا محتاج دلیل نہیں تو دعاء حاجت میں اس کی بقا کیونکر محتاج دلیل ہو سکتی ہے؟ اس کے جواب میں تھانوی صاحب کا یہ فرمانا کہ "التحیات" میں صیغۂ نداء مقرون بالسلام ہے اور سلام بارگاہ رسالت میں پیش ہوتا ہے، اس لئے نداء کا صیغہ مضر نہیں، قطعاً بے سود ہے، اس لئے کہ بارگاہ رسالت میں صرف صلوٰۃ و سلام ہی پیش نہیں ہوتا، بلکہ امت کے تمام اعمال بھی پیش ہوتے ہیں، جیسا کہ احادیث صحیحہ میں وارد ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ دعا بھی ایک عمل بلکہ عمل صالح ہے، باقی اعمال کے ساتھ یہ عمل بھی بارگاہ رسالت میں ضرور پیش ہوگا، ایسی صورت میں دونوں یکساں ہو گئے، تشہد کا صیغۂ نداء سلام کے ضمن میں پیش ہوا اور دعائے حاجت کا یہ صیغۂ نداء (یا محمد انی توجہت بک الی ربی) اعمال حسنہ کے ساتھ بارگاہ رسالت میں پیش ہوا، نہ وہ مضر رہا، نہ یہ، ایسی صورت میں تھانوی صاحب کی تفریق بالکل بے سود ہو کر رہ گئی۔

پھر یہ کہ تھانوی صاحب جب صیغۂ ندا مقرون بالسلام کو جائز سمجھتے ہیں تو وہ اس دعا میں "یا محمد الخ" کو حذف کرنے کی بجائے اس کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم لکھ دیتے تا کہ یہاں بھی صیغۂ نداء مقرون بالسلام ہو کر مضر نہ رہتا، اور دعا پڑھنے والے کو درود و سلام پڑھنے کی فضیلت بھی حاصل ہو جاتی اور حدیث میں کانٹ چھانٹ کی نوبت بھی نہ آتی، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ بموجب احادیث صحیحہ دعا کے ساتھ درود و سلام پڑھنا قبولیت دعا کا موجب ہے۔

ادعیہ ماثورہ میں الفاظ کا ردّ وبدل جائز نہیں

تھانوی صاحب کی یہ دیدہ دلیری کہ انہوں نے الفاظ حدیث میں اختصار کر دیا، انتہائی موجب حیرت ہے، کیا انہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ ادعیہ ماثورہ میں اختصار تو درکنار الفاظ کا ردّ وبدل بھی جائز نہیں ہے، دیکھئے صحیحین میں براء بن عاذب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث وارد ہے، انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مجھے ایک دعا تلقین فرمائی، جس کے آخر میں یہ الفاظ تھے "امنت بکتابك الذی انزلت ونبیك الذی ارسلت" براء بن عاذب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ الفاظ حضور علیہ السلام کے سامنے دوبارہ پڑھے تو "نبیك" کی بجائے "برسولك" پڑھ دیا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "لا ونبیك" نہیں بلکہ نبیک کہو، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نبی بھی ہیں اور رسول بھی، مگر چونکہ دعا میں الفاظ ماثورہ کو بدلنا جائز نہ تھا، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان پر ردّ فرمایا، اور وہی الفاظ ادا کرنے کی تاکید فرمائی جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تلقین فرما چکے تھے، ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ "مرقاۃ شرح مشکوۃ" میں فرماتے ہیں:

> "وقال ابن حجر في بعض طرقه عن البراء قال قلت ورسولك الذي ارسلت فقال ونبيك... والاظهر والله اعلم في وجه الرد ان الادعية الواردة لا تتغير عن الفاظها الخ" [۱]

ترجمہ: "علامہ ابن حجر نے کہا اس حدیث کے بعض طرق میں حضرت براء سے مروی ہے، انہوں نے کہا میں نے ورسولک الذی ارسلت کے الفاظ کہے، حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ورسولک نہ کہو بلکہ نبیک ہی کہو...... اس ردّ کی سب سے زیادہ ظاہر وجہ واللہ تعالیٰ اعلم یہ ہے

[۱] مرقاۃ، جلد ۳، ص ۷۹ طبع مصر

کہ جو دعائیں شرع مطہر میں وارد ہیں وہ اپنے الفاظ سے متغیر نہیں کی جاتیں"۔

ثابت ہوا کہ ادعیۂ ماثورہ کے الفاظ میں اختصار تو درکنار تغیر بھی باطل و مردود ہے، اس کے باوجود بھی تھانوی صاحب نے اختصار فی الحدیث کی جرأت فرمائی۔ معاذ اللہ

یہ حدیث جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، صحیح بخاری و صحیح مسلم دونوں کتابوں میں وارد ہے، دیکھئے بخاری شریف، جلد ثانی ص ۹۳۴ اور مسلم شریف، جلد ثانی ص ۳۴۸۔

حاشیہ بخاری میں کرمانی سے منقول ہے "وفیہ دلیل علی ان رعایة الالفاظ المرویة امر مھم فیہ حکمة بالغة (حاشیہ ۲، بخاری ص ۹۳۴) یعنی اس حدیث میں اس امر پر دلیل ہے کہ الفاظ مرویہ کی رعایت امر عظیم اور مہتم بالشان ہے جس میں حکمت بالغہ پائی جاتی ہے۔

افسوس! تھانوی صاحب نے کرمانی کی تصریح کو بھی نظر انداز کر دیا، اسی حدیث براء بن عاذب کے تحت علامہ نووی شارح مسلم فرماتے ہیں:

"واختار المازري وغيره ان سبب الانكار ان هذا ذكر ودعاء فينبغي فيه الاقتصار علي اللفظ الوارد بحروقه وقد يتعلق الجزاء بتلك الحروف ولعله اوحي اليه ﷺ بهذه الكلمات فيتعين اداوها بحروفها وهذا لقول حسن"۔[۱]

ترجمہ: "اور اختیار کیا مازری وغیرہ نے کہ براء بن عاذب رضی اللہ عنہ پر رسول اللہ ﷺ کے انکار کا سبب یہ تھا کہ یہ ذکر اور دعا ہے، اس لئے اس میں اسی لفظ پر اقتصار کرنا چاہیے، جو اس کے حروف کے ساتھ وارد ہوا ہے، اور بسا اوقات جزا بھی انہی حروف کے ساتھ متعلق ہوتی ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں کلمات کے ساتھ حضور ﷺ کی طرف وحی کی گئی ہو تو ان

---

۱ شرح نووی علی الصحیح مسلم، جلد ثانی ص ۳۴۸

کلمات کا انہی حروف کے ساتھ ادا کرنا متعین ہوگا اور یہ قول بہت اچھا ہے"۔

تعجب ہے تھانوی صاحب نے شارحین حدیث کی ان تمام تصریحات کو دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہ فرمائی اور قطعاً نہ سوچا کہ اگر انہی کلمات اور حروف کے ساتھ یہ دعا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی گئی ہو تو ان حروف وکلمات کے ساتھ ان کا ادا کرنا یقیناً متعین ہوگا، ایسی صورت میں کلمات کا اختصار وحی الٰہی میں تحریف صریح قرار پائے گی، جس شخص کے دل میں ذرا بھی خوف خداوندی ہو وہ کبھی ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔

بلکہ میں تو یہ عرض کروں گا کہ بموجب آیۂ کریمہ: "وما ینطق عن الھوای ان ھو الا وحی یوحی" اغلب یہی ہے کہ ادعیہ وارده اوراذ کار ماثورہ کے حروف وکلمات بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کئے جاتے ہیں، کلمات وحی الٰہی میں اختصار کی جرأت اسی شخص کو ہو سکتی ہے جس کے دل میں نہ وحی الٰہی کی کوئی عظمت ہو، نہ خدا کے خوف کا کوئی اثر پایا جائے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس مقام پر اگر یہ شبہ کیا جائے کہ ترمذی کی حدیث میں بھی یہی دعا صیغہ ندا کے بغیر مروی ہے، اگر تھانوی صاحب نے اختصار کر دیا تو کیا ہوا؟ ابو عیسیٰ ترمذی نے بھی تو صیغۂ نداء کو حذف کر کے اختصار سے کام لیا ہے۔

اس کا ازالہ یہ ہے کہ ترمذی میں صرف "یا محمد" کا لفظ نہیں، باقی خطاب کے الفاظ بعبارت ذیل موجود ہیں، ملاحظہ فرمائیے " انی قد توجھت بك الی ربی" تھانوی صاحب نے صرف "یا محمد" کو حذف نہیں کیا، بلکہ پوری سطر صاف کر گئے، رہا لفظ "یا محمد" کا نہ ہونا تو میں عرض کروں گا کہ ایک ہی حدیث کے بعض طرق میں اگر بعض ایسے الفاظ مروی ہوں جو کسی دوسرے طریق میں نہیں تو اس کی وجہ سے ان کا نہ ہونا لازم نہیں آتا، یہ نسخوں کا اختلاف نہیں کہ جس میں سہل انگاری کو دخل ہو یہ تو طرق روایت کا تفاوت ہے، ابو عیسیٰ ترمذی نے نہ اس روایت کا انکار کیا، نہ اختصار کا دعویٰ کیا، بلکہ ایک طریقہ کو ذکر

کر دیا، دوسرے طریق میں یہی روایت یا محمد کے الفاظ سے جب وارد ہوگئی تو اب "یا محمد" کا روایت ہونا متعین ہوگیا جس کا انکار یا اختصار نہ امام ابو عیسیٰ ترمذی نے کیا، نہ کسی دوسرے محدث نے، البتہ تھانوی صاحب کو یہ جرأت ضرور ہوئی کہ انہوں نے حدیث کے الفاظ واردہ وماثورہ مرویہ میں کمی کردی۔

علاوہ ازیں یہ کہ اس صورت میں تھانوی صاحب "اختصر یہ" کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی، وہ صاف لکھ دیتے کہ میں نے ترمذی کی روایت میں "یا محمد" کے الفاظ نہیں پائے اس لئے انہی کو نقل کر دیا، بلا وجہ اختصار کا دعویٰ کر کے انہوں نے اپنے سر پر اختصار حدیث کا بوجھ اٹھایا، بات یہی ہے کہ ترمذی یا کسی دوسری کتاب میں صیغۂ نداء کا نہ پایا جانا اس کے مروی ہونے پر اثر انداز نہیں ہوسکتا، بعض طرق میں اس کا وارد ہوجانا اس کی روایت کو متعین کر دیتا ہے، اب اس کے بعد اس میں اختصار کرنا یقیناً تحریف حدیث ہے، جس کا ارتکاب صرف تھانوی صاحب نے کیا ہے، ابو عیسیٰ ترمذی یا کسی دوسرے محدث کے دامن کو اس جرأت عظیمہ کے دھبہ سے ملوث نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے بعد تھانوی صاحب کے اس دعویٰ کو ملاحظہ فرمائیے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد تشہد میں صیغۂ نداء چھوڑ دیا تھا، اور وہ التحیات میں "السلام علی النبی" پڑھتے تھے، تھانوی صاحب نے بخاری شریف کتاب الاستیذان کی جس حدیث سے اپنا دعویٰ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ ان کے دعویٰ کے ثبوت سے بالکل ساکت ہے، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث حسب ذیل ہے:

"کنا نقول في حیاة رسول الله ﷺ السلام علیك ایها النبي فلما قبض قلنا السلام یعني علی النبي"۔[1]

---

[1] مرقاۃ المفاتیح، جلد ۲، ص ۳۳۲

تھانوی صاحب نے اس حدیث کے معنی یہ سمجھ لئے کہ عبداللہ بن مسعود یہ فرمارہے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو ہم نے "السلام علیك ایھا النبی" چھوڑ دیا اور اس کی بجائے "سلامٌ علی النبی" کہا، حالانکہ ان معنی پر حدیث کی دلالت نہیں، یہ تو ایک احتمال ہے جس سے استدلال کرنا سراسر باطل اور فہم و دانش کے خلاف ہے، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ "قلنا السلام" پر ختم ہو جاتے ہیں، "یعنی علی النبی" راوی کا قول ہے عبداللہ بن مسعود کا قول نہیں، اس تقدیر پر حدیث میں دو احتمال پیدا ہو گئے ہیں، ایک یہ کہ ہم نے صیغۂ نداء کو چھوڑ کر صرف "السلام علی النبی" پر اکتفا کر لیا لیکن یہ معنی آئمہ اربعہ کے نزدیک مردود ہیں، اس لئے کہ کسی امام نے صیغۂ نداء کے بغیر تشہد نقل نہیں کیا، امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے مذہب میں بھی تشہد پڑھا جاتا ہے، جس میں نداء اور خطاب کے صیغے موجود ہیں، اگر صیغۂ ندا کا ترک اس حدیث کا مدلول ہوتا، تو کسی امام کا مذہب تو ان صحابہ کے مذہب کے مطابق ہوتا، لیکن کسی نے "السلام علی النبی" پڑھنے کو اپنا مذہب قرار نہیں دیا، یہ ثابت ہوا کہ اس حدیث کا مدلول صیغۂ ندا اور خطاب کا ترک نہیں بلکہ یہ صرف احتمال ہے جو ثبوت دعویٰ کے لئے کافی نہیں ہو سکتا، دوسرا احتمال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہم نے تشہد میں حضور پر سلام پڑھنا ترک نہیں کیا، بلکہ بعد الوفات بھی ہم بدستور "السلام علیک ایھا النبی" پڑھتے رہے، چونکہ دونوں احتمال پیدا ہو گئے اس لئے حدیث میں کسی ایک معنیٰ پر دلالت باقی نہ رہی اور تشہد میں السلام علیك ایھا النبی پڑھنا احادیث صحیحہ، اور مذاہب آئمہ اربعہ سے ثابت ہے، لہذا اس کا مخالف احتمال مرجوع ہو کر مردود قرار پائے گا، دیکھئے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مرقاۃ شرح مشکوۃ میں فرماتے ہیں:

" واما قول ابن مسعود کنا نقول فی حیاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم السلام علیك ایھا النبي. فلما قبض ولیہ السلام قلنا السلام

علي النبي فهو رواية ابي عوانة ورواية البخاري الاصح منها بينت ان ذلك ليس من قول ابن مسعود بل من فهم الراوي عنه ولفظها فلما قبض قلنا السلام. يعني علي النبي فقوله قلنا السلام يحتمل انه اراد به استمررنا به علي ماكنا عليه في حياته ويحتمل انه، اراد عرضنا عن الخطاب واذا احتمل اللفظ لم يبق فيه دلالة كذا ذكره ابن حجر''۔[1]

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول کہ ''ہم حضور ﷺ کی حیات میں السلام علیك ایها النبی کہتے تھے، جب حضور کی وفات ہوگئی تو ہم نے السلام علیک علی النبی کہا''، ابوعوانہ کی روایت ہے، بخاری کی روایت میں، جو اس کے مقابل اصح ہے، یہ الفاظ نہیں۔ بخاری شریف کے الفاظ یہ ہیں کہ ''فلما قبض قلنا السلام، یعنی علی النبی'' (جب حضور ﷺ کی وفات ہوگئی تو ہم نے سلام کہا یعنی نبی کریم ﷺ پر) بخاری کی اس روایت نے بیان کر دیا کہ یہ قول حضرت ابن مسعود کا نہیں، بلکہ راوی کا قول ہے۔ اس نے اپنی فہم کے مطابق اپنے لفظوں میں بیان کر دیا اور اس قول میں بھی دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ جس طرح حضور ﷺ کی حیات ظاہری میں ہم السلام علیك ایها النبی کہا کرتے تھے، اسی طرح حضور کی وفات کے بعد بھی کہتے رہے، دوسرا احتمال یہ ہے کہ ہم نے خطاب چھوڑ دیا، جب الفاظ میں احتمال پیدا ہوگیا تو دلالت (قطعیہ) باقی نہ رہی''۔

الحمد للہ! ہمارے اس بیان اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت کی روشنی میں تھانوی صاحب کا یہ دعویٰ بھی غلط ثابت ہوا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد صیغۂ خطاب ترک کر دیا تھا۔

بعض لوگ اس بات پر انتہائی زور دیتے ہیں کہ متابعات اور شواہد کی روشنی میں

---

[1] مرقاۃ المفاتیح، جلد ۱، ص ۵۵۸

ابوعوانہ کی روایت کے بموجب یہ بات بالکل صحیح ہے کہ صحابہ کرام نے حضور کی وفات کے بعد "السلام علیک ایہا النبی" کی بجائے "السلام علی النبی" کہنا شروع کر دیا تھا، میں ان سے دریافت کرتا ہوں کہ اگر آپ کی یہ بات صحیح ہے تو پھر آپ صحابہ کرام کے مذہب کے موافق علی النبی کیوں نہیں پڑھتے، خود تھانوی صاحب عمر بھر السلام علیک ایہا النبی پڑھتے اور پڑھواتے رہے، ثابت ہوا کہ تھانوی صاحب کا یہ دعویٰ اُن کے اپنے نزدیک بھی باطل ہے۔

ناظرین کرام غور فرمائیں کہ تھانوی صاحب کا حدیث رسول ﷺ میں ردّ و بدل کرنا، بلکہ تقریباً پوری سطر غائب کر دینا کس قدر شدید مداخلت فی الدین ہے، اور حدیث رسول اللہ ﷺ پر کیسی عظیم قسم کی زیادتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ منکرین حدیث کو بھی ایسی جرأت نہیں ہو سکتی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار [1]

---

[1] ماہنامہ السعید ملتان شمارہ اپریل ۱۹۶۳ء ص ۷ تا ۱۲

حدیث نمبر (۱۵)

اللہ تعالیٰ عزّ وجل نے مشورہ طلب فرمایا

"ان ربي استشارني في أمتي؛ ماذا أفعل بهم؟ فقلت: ماشئت يا رب؛ هم خلقك وعبادك. فاستشارني الثانية، فقلت له كذلك. فاستشارني الثالثة فقلت له كذلك. فقال تعالىٰ: اني لن أخزيك في أمتك يا احمد وبشرني أن أول من يدخل الجنة معي من أمتي سبعون ألفا مع كل ألف سبعون ألفا ليس عليهم حساب؛ ثم أرسل اليّ: أدع تجب، وسل تعط. فقلت لرسوله: او معطي ربي تعالىٰ سئولي؟ قال: ما أرسل اليك الا ليعطيك" ۔[1]

ترجمہ: بے شک میرے رب کریم نے میری امت کے بارے میں مجھ سے مشورہ طلب فرمایا کہ میں ان کے ساتھ کیا کروں؟ میں نے عرض کیا اے میرے رب جو کچھ تو چاہے وہی کر، وہ تیری مخلوق اور تیرے بندے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے دوبارہ مجھ سے مشورہ لیا، میں نے وہی جواب دیا، اس نے تیسری دفعہ مجھ سے مشورہ طلب فرمایا، میں نے پھر وہی عرض کیا، پھر میرے رب کریم نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اے احمد (ﷺ) بے شک میں تیری اُمت کے معاملہ میں تجھے ہرگز رسوانہ کروں گا، اور مجھے بشارت دی کہ میرے ستر ہزار اُمتی سب جنتیوں سے پہلے میری ہمراہی میں داخل جنت ہوں گے جن سے حساب تک نہ لیا جائے گا، پھر میرے رب نے قاصد بھیجا کہ میرے حبیب (ﷺ) تو دعا کر تیری دعا قبول کی جائے گی اور مانگ تجھے دیا جائے گا، میں نے اپنے رب کریم کے قاصد سے کہا کہ کیا میرا رب

---

[1] کنز العمال: الجزء الحادی عشر، ص ۴۳۸۔ مسند امام احمد بن حنبل: الجزء السادس عشر، طبع قاہرہ، ص ۵۹۶

حدیث ۲۳۹۸۱ حدیث ۳۲۱۰۶

میری ہر مانگی ہوئی چیز مجھے دے گا؟ تو اس قاصد (فرشتہ) نے عرض کیا کہ حضور اسی لئے تو رب تعالیٰ نے آپ کو پیغام بھیجا ہے کہ آپ جو کچھ بھی مانگیں آپ کو عطا فرمائے۔ الخ

اعتراض

اہل عقل خوب جانتے ہیں کہ کسی کا دوسرے سے مشورہ لینا احتیاج و عاجزی پر دلالت کرتا ہے، یا کم از کم مشورہ اس واسطے ہوتا ہے کہ غلطی کا احتمال نہ رہے، اور اللہ کی طرف نہ احتیاج و عاجزی کی نسبت درست ہے اور نہ وہاں غلطی کے احتمال کا امکان ہے، ہوسکتا ہے کہ اس کی تاویل یوں کرلی جائے کہ یہ مشورہ عزت افزائی کی خاطر ہے، مگر دوسری طرح بھی اس میں کچھ گفتگو ہوسکتی ہے، مثلاً ابن حذیفہ نام کا کوئی صحابی بھی نہیں ہوا، خیر اس بات کو بھی کتابت کی غلطی کہہ کر کاتب کے سر منڈھ دیا جائے گا، اور کہا جاسکتا ہے کہ ابن حذیفہ نہیں، حذیفہ درحقیقت تھا، مگر اس کو کیا کیجئے کہ مسند احمد صفحہ ۳۸۲۔۴۰۸ میں اس صحابی کی بہت سی روایات ہیں، مگر ایسی جھوٹی روایت کا نام ونشان بھی نہیں۔

ضعیف اور وضعی احادیث بیان کرنا بھی اگرچہ جرم ہے مگر یہ تو نہ حدیث وضعی (گھڑی ہوئی) ہے نہ ضعیف بلکہ سرے سے اس کا کہیں ذکر ہی نہیں، پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس جھوٹی حدیث کو مسند احمد میں بتانے والا ہمارے دوستوں کے نزدیک مجدد مأۃ حاضرہ بھی ہے، اگر مجدد ایسے ہی ہوتے ہیں تو ہمارا ایسے مجددوں کو دور ہی سے سلام ہے"۔ [1]

مضمون بالا میں کسی دیوبندی نے سیدی اعلیٰ حضرت مجدد مأۃ حاضرہ مؤید ملت طاہرہ فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "الامن والعلی" کے ص ۸۵ سے اللہ تعالیٰ کے مشورہ طلب کرنے کی طویل حدیث کے ایک جملہ کا ترجمہ نقل کیا ہے اور اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اس نقل کردہ حدیث مبارکہ کو محض اس لئے جھوٹا قرار دیا ہے کہ مشورہ طلب کرنا غلطی کا احتمال

---

[1] ماہنامہ الصدیق ملتان (خیر المدارس)، بابت ماہ ذی الحجہ ۷۸ھ

دور کرنے اور احتیاج و عاجزی کی بنا پر ہوتا ہے، رب تعالیٰ جب ان باتوں سے پاک ہے تو اس کے لئے مشورہ طلب کرنا کیونکر ممکن ہوگا، لہٰذا یہ حدیث غلط اور جھوٹی ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ :

۱۔ کیا یہ حدیث بروایت ابن حذیفہ حدیث کی کسی کتاب میں موجود ہے یا نہیں؟

۲۔ امام احمد اور امام عساکر کی طرف اس کی نسبت درست ہے یا نہیں؟

۳۔ ابن حذیفہ نام کا کوئی صحابی ہوا ہے یا نہیں؟

۴۔ مشورہ طلب کرنا ہمیشہ احتیاج و عاجزی کی بنا پر غلطی دور کرنے کے لئے ہوتا ہے یا کبھی اس کے بغیر بھی مشورہ طلب کیا جاتا ہے؟

۵۔ اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی مخلوق سے کوئی مشورہ طلب کیا ہے یا نہیں؟

جواب

بدعقیدگی اور گمراہی کی اصل بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل مجدہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعالِ مقدسہ کا قیاس اپنے افعال پر کرلیا جائے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ

یاد رکھئے: اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ ہم اپنے مشوروں کے متعلق اگر یہ کلیہ تسلیم کرلیں کہ ہمارا مشورہ طلب کرنا غلطی کا احتمال دور کرنے کے لئے احتیاج اور عاجزی کی بنا ہوتا ہے، تو ممکن ہے کہ کسی حد تک اسے صحیح کہا جاسکے لیکن اللہ اور اس کے رسول کے مشورہ کو بھی اس کلیہ میں شامل کرنا باطل محض ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ معاذ اللہ، اللہ و رسول ہماری مانند ہیں، غلطی کا احتمال دور کرنا بھی حاجت ہے اور عاجزی بھی احتیاج کو متلزم ہے، اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں، اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے محتاج نہیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم دونوں غنی، بے پرواہ اور احتیاج سے پاک ہیں، جیسا کہ عنقریب دلائل کی روشنی میں واضح کیا جائے گا۔

ایک صحیح اور واقعی حدیث کو جو کتب احادیث میں موجود ہے، اور معترض علم حدیث سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اُسے معلوم کرنے سے قاصر رہا، محض اپنی رائے ناقص پر اعتماد کرکے جھوٹی حدیث کہہ دینا، بلکہ اپنے زعم باطل کی بنا پر یہ دعویٰ کردینا کہ اس حدیث کا کہیں ذکر نہیں، بدترین جہالت وضلالت کا مظاہرہ ہے، دیکھئے یہ حدیث مبارک مسند امام احمد، جلد پنجم وکنز العمال، جلد ششم اور خصائص کبریٰ، جلد دوم، تینوں کتابوں میں موجود ہے۔

''إنَّ ربي تبارك وتعالىٰ استشارني في أُمتي؛ ماذا أفعل بهم؟ فقلت: ماشئت أي رب؛ هم خلقك وعبادك، فاستشارني الثانية. فقلت له كذلك. فقال: لاأحزنك في أمتك يا محمد. وبشرني أن أول من يدخل الجنة من أمتي؛ سبعون ألفاً، مع كل ألف؛سبعون ألفاً، ليس عليهم حساب، ثم أرسل الي فقال: ادع تجب؛ وسل تعط، فقلت لرسوله: أو معطي ربي سؤلي؟ فقال: ماأرسلني اليك الا ليعطيك''۔الحديث حم (احمد وابن عساكر عن حذيفة)[1]

ترجمہ: بے شک میرے رب کریم نے میری اُمت کے بارے میں مجھ سے مشورہ طلب فرمایا کہ میں ان کے ساتھ کیا کروں؟ میں نے عرض کیا، اے میرے رب جو کچھ تو چاہے وہی کر، وہ تیری مخلوق اور تیرے بندے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے دوبارہ مجھ سے مشورہ لیا، میں نے وہی جواب دیا، اس نے تیسری دفعہ مجھ سے مشورہ طلب فرمایا۔ میں نے پھر وہی عرض کیا، پھر میرے رب کریم نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اے احمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بے شک تیری

---

[1] کنز العمال، ج ۶، ص ۱۱۲، حدیث ۱۷۳۵ خصائص کبریٰ، ج ۲، ص ۲۱۰، اخرج احمد وابوبکر الشافعی فی الغیلانیات وابونعیم وابن عساکر عن حذیفۃ بن الیمان ومسند امام احمد، ج ۵، مطبوعہ مصر، ص ۳۹۳۔

امت کے معاملہ میں تجھے ہر گز رسوانہ کروں گا، اور مجھے بشارت دی کہ میرے ستر ہزار امتی سب جنتیوں سے پہلے میری ہمراہی میں داخل جنت ہوں گے، ان میں سے ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار اور ہوں گے جن سے حساب تک نہ لیا جائے گا، پھر میرے رب نے قاصد بھیجا کہ میرے حبیب تو دعا کر تیری دعا قبول کی جائے گی، اور مانگ تجھے دیا جائے گا، میں نے اپنے رب کریم کے قاصد سے کہا کہ کیا میرا رب میری ہر مانگی ہوئی چیز دے گا؟ تو اس قاصد (فرشتہ) نے عرض کی کہ حضور اسی لئے تو رب تعالیٰ نے آپ کو پیغام بھیجا ہے کہ آپ جو کچھ بھی مانگیں آپ کو عطا فرمائے۔

آگے یہ حدیث مبارک طویل ہے، جس میں حضور سید عالم ﷺ نے اپنے اور اپنی امت مکرمہ کے بہت سے فضائل ومحامد بیان فرمائے، ہم نے قدرِ ضرورت پر اکتفا کیا ہے۔

معترض کا قول تو یہ تھا کہ اس جھوٹی حدیث کا کہیں ذکر ہی نہیں، لیکن بحمدہ تعالیٰ ہم نے ثابت کر دیا کہ مسند امام احمد، کنزالعمال اور خصائص کبریٰ میں یہ حدیث موجود ہے، کنزالعمال میں تو اس کی تخریج صرف امام احمد اور امام ابن عساکر کی طرف منسوب ہے، لیکن خصائص کبریٰ میں ان کے علاوہ ابوبکر شافعی (امام بزار) اور ابونعیم کی طرف بھی اس حدیث کی تخریج کو منسوب کیا ہے۔ وللہ الحجۃ السامیہ

اعلیٰ حضرت مجدد دین وملت رحمۃ اللہ علیہ نے ''الامن والعلیٰ'' میں مسند امام احمد کا نام نہیں لکھا، صرف اتنا تحریر فرمایا: الامام احمد وابن عساکر عن حذیفۃ (الامن والعلیٰ، ص ۱۲۳، مطبوعہ مطبع اہل سنت والجماعت، بریلی) اور الفاظ حدیث کنزالعمال جلد ششم سے نقل فرمائے اور کتاب کا حوالہ نہیں دیا، تاکہ ان منکرین ومخالفین کے ادعائے علم وفضل کی حقیقت آشکارہ ہو، الحمد للہ اہل علم نے دیکھ لیا کہ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت مجدد ملت قدس سرہ العزیز علم وفضل کا وہ بحر ذخار ہیں، جس کے ساحل تک منکرین کی رسائی نہیں۔ ذالک فضل اللہ۔

رہا ابن حذیفہ کا معاملہ تو یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ کنز العمال اور خصائص کبری اور مسند امام احمد تینوں میں عن حذیفہ موجود ہے، نیز الامن والعلی، مطبوعہ مطبع اہل سنت والجماعت، بریلی شریف، ص ۱۲۳ پر اور اسی طرح الامن والعلی شائع کردہ نوری کتب خانہ، لاہور کے ص ۱۲۳ پر عن حذیفہ موجود ہے، البتہ صابر الیکٹرک پریس کی مطبوعہ کے ص ۸۵ پر کاتب کی غلطی سے عن کی بجائے ابن لکھا گیا ہے، جسے کوئی معمولی سمجھ والا انسان بھی مصنف کی طرف منسوب نہیں کر سکتا، مگر جو شخص تعصب وعناد کے جوش میں ایک ایسی عظیم وجلیل حدیث کو نہیں مانتا جو کتب احادیث میں موجود ہے، تو وہ اس حقیقت ثابتہ کو کیونکر تسلیم کرنے لگا ہے۔

چوتھے سوال کا جواب یہ ہے کہ ہمارا آپس میں مشورہ طلب کرنا تو احتیاج وعاجزی کی بنا پر اور غلطی کے احتمال کو دور کرنے کے لئے ہو سکتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مشورہ طلب کرنا احتیاج وعاجزی اور ازالہ احتمال غلطی کے لئے قطعاً نہیں ہو سکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دونوں غنی ہیں، اللہ تعالیٰ کا بندوں کے مشورہ سے غنی ہونا تو ظاہر ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُمت کے ساتھ مشورہ فرمانے سے اس لئے غنی ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر آسمان سے وحی الٰہی آتی ہے، نیز یہ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام کائنات سے زیادہ علم اور عقل والے ہیں، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز کسی کے مشورہ کے محتاج نہیں لیکن اس کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو "وشاورھم فی الامر" فرما کر مشورہ کرنے کا حکم فرمایا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے رب کریم کے ارشاد کی تعمیل میں اپنے غلاموں سے مشورہ فرمایا، صرف اس لئے کہ انہیں مشورہ کی تعلیم دیں اور مشورہ کو ان کے لئے رحمت بنائیں، اور انہیں استخراج رائے صحیح میں اجتہاد کی رغبت دلائیں اور ان سے مشورہ لے کر ان کی شان بڑھائیں اور ان کے دلوں کو خوش کریں۔

دیکھئے صاحب روح المعانی آیۂ کریمہ "وشاورھم فی الامر" کے تحت اسی مضمون کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''ويؤيده ماأخرجه ابن عدي ، والبيهقي في الشعب بسند حسن عن عن ابن عباس قال: لما نزلت (وشاورهم في الامر) قال رسول الله ﷺ أما ان الله ورسوله لغنيان عنها ولكن جعلها الله تعالى رحمة لامتي'' ۔[1]

ترجمہ: ''اور اس مضمون کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جسے ابن عدی نے شعب الایمان میں بیہقی نے سند حسن کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا کہ جب آیت کریمہ ''وشاورهم في الامر'' نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، لوگو! خبردار ہو جاؤ، بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول دونوں مشورہ سے غنی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے میری امت کے لئے رحمت بنایا ہے''۔

اسی طرح تفسیر ابن جریر میں ہے :

'' عن الربيع (وشاورهم في الامر) قال: أمر الله نبيه ﷺ أن يشاور اصحابه في الامور وهو ياتيه الوحي من السماء، لانه أطيب لأنفسهم'' ۔

ترجمہ: حضرت ربیع سے روایت ہے ''وشاورهم في الامر'' نازل فرما کر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو مشورہ طلب امور میں حضور کے صحابہ سے مشورہ کرنے کا حکم دیا، حالانکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی آسمانی آتی ہے، صرف ان کے دلوں کو خوش کرنے کی خاطر''۔

اسی مقام پر ابن جریر میں ایک اور حدیث ہے، جس کے الفاظ ہیں'' وان كنت عنهم غنيا'' ''اے حبیب ﷺ آپ اپنے صحابہ کی تالیف کے لئے ان سے مشورہ کرلیا کریں، اگرچہ آپ ان سے غنی ہیں''۔[2]

اور تفسیر کبیر میں ہے ''(الخامس) وشاورهم في الامر. لتستفيد منهم

[1] روح المعانی، پ ۴، ص ۹۴ [2] تفسیر ابن جریر، پ ۴، ص ۹۴

رأیاً وعلماً لکن لکی تعلم مقادیر عقولهم وأفهامهم ومقادیر حبهم الخ ''یعنی آپ کو مشورہ کرنے کا حکم اس وجہ سے نہیں دیا کہ آپ ان سے کسی قسم کی رائے یا علم کا استفادہ کریں، بلکہ اس لئے یہ حکم دیا گیا ہے کہ ان کے عقول وافہام آپ کے سامنے ظاہر ہو جائیں اور ان کی محبت کے انداز سامنے آجائیں''۔ اس کے چند سطر بعد امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: (السادس) "وشاورهم فی الامر" لالأنك محتاج الیهم ولکن لاجل لانك اذا شاورتهم فی الامر اجتهد کل واحد منهم فی استخراج الوجه الاصلح الخ

ترجمہ: اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے مشورہ فرمائیں، اس لئے نہیں کہ آپ ان کے محتاج ہیں، لیکن جب آپ ان سے مشورہ فرمائیں گے تو آپ کے غلاموں میں سے ہر شخص وجہ اصلح کے استخراج میں کوشش کرے گا۔ (تفسیر کبیر، ج ۳، ۱۲۰)

تفسیر نیشاپوری میں اس آیت کریمہ وشاورهم فی الامر کے تحت مرقوم ہے:

'' وقد ذکر العلماء لامر الرسول بالمشاورة مع انه اعلم الناس واعقلهم فوائده منها انها توجب علوشانهم ورفعة قدرهم '' الخ۔

ترجمہ: باوجود اس بات کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ علم اور عقل والے ہیں، اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو مشورہ کا امر فرمایا، علماء نے اس کے کئی فائدے ذکر کئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا ان سے مشورہ فرمانا ان کی علو شان رفعتِ قدر و منزلت اور ان کے اخلاص ومحبت کے زیادہ ہونے کی موجب ہے۔

الحمد للہ! ان روایات وعبارات علماء مفسرین سے یہ امر آفتاب سے زیادہ روشن ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مشورہ طلب فرمانا، احتیاج وعاجزی کی وجہ سے ہرگز

نہیں، نہ کسی غلطی کے احتمال کو دور کرنے کے لئے ہے، بلکہ ایسی حکمتوں اور فائدوں کی بنا پر ہے، جن کا تصور بھی معترض کے ذہن میں نہیں اور ہم نے انہیں بالتفصیل بیان کر دیا۔

پانچویں سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے مشورہ طلب فرمایا ہے، دیکھئے تفسیر ابن جریر میں آیت "واذ قال ربك للملٰئكة انی جاعلٌ فی الارض خلیفه" کے تحت ایک حدیث نقل فرمائی جو حسب ذیل ہے:

عن سعید عن قتاده واذ قال ربك للملئكة انی جاعل في الارض خليفة فاستشار الملئكة في خلق آدم فقالوا اتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدماء حديث [1]

ترجمہ: آیت کریمہ "انی جاعلٌ فی الارض خلیفه" کی تفسیر میں حضرت سعید، حضرت قتادہ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بارہ میں فرشتوں سے مشورہ طلب فرمایا، تو فرشتوں نے عرض کیا: اتجعل فیها من یفسد فیها الآیة

تفسیر عرائس البیان میں اسی آیت کے تحت ہے:

"فعرفهم عند المشورة مع الملٰئكة خلوهم من المحبة [2]

ترجمہ: فرشتوں سے مشورہ کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے جذبہ محبت سے خالی ہونے کی بات انہیں بتا دی تھی۔

تفسیر مدارک میں اسی آیت کے تحت مرقوم ہے:

"أو ليعلم عبادة المشاورة في امورهم قبل أن يقدموا عليها وان كان هو بعلمه وحكمته البالغة غنياً عن المشاورة"۔ [3]

---

[1] تفسیر ابن جریر، پ ۱، ص ۱۵۸

[2] تفسیر عرائس البیان، ج ۱، ص ۱۹ [3] تفسیر مدارک، ج ۱، ص ۳۲

ترجمہ: ''یا اس لئے فرشتوں سے انی جاعل فی الارض خلیفہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس بات کی تعلیم دے کہ وہ اپنے کام کرنے سے پہلے مشورہ کرلیا کریں، اگرچہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے، اور اس کی حکمت بالغہ مشورہ سے غنی ہے''۔

تفسیر نیشاپوری میں ہے:

''والفائدة في اخبار الملٰئكة بذلك اما تعليم العباد المشاورة في اُمورهم وان كان هو بحكمة البالغة غنيا عن ذلك واما ان يسئلوا ذلك السوال ويجابوا بما اُجيب''۔[1]

ترجمہ: فرشتوں کو یہ خبر دینے میں یا یہ فائدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان کاموں میں مشورہ کرنے کی تعلیم دے، اگرچہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت بالغہ کی وجہ سے مشورہ کرنے سے غنی ہے، اور یا یہ فائدہ ہے کہ فرشتے یہ خبر سن کر اَتَجْعَلُ فِيْهَا کے ساتھ سوال کریں، اور انہیں اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کے ساتھ جواب دیا جائے۔

تفسیر سراج المنیر میں ہے:

''وفائدة قوله هذا للملٰئكة تعليمُ المشاورة اَوْ تعظيم شان المجعول''۔[2]

ترجمہ: فرشتوں سے ''انی جاعلٌ فی الارض خلیفه'' فرمانے کا فائدہ تعلیم مشاورت یا تعظیم شان مجعول ہے۔[3]

---

[1] تفسیر نیشاپوری، پارہ اول، ص ۲۰۹

[2] تفسیر سراج المنیر، جلد اول، ص ۳۲

[3] اسی طرح تفسیر جمل، ج ۱، ص ۳۸، تفسیر بیضاوی، ج ۱، تفسیر کشاف، ج ۱، ص ۲۰۹، تفسیر کبیر، ج ۱، ص ۸۲، ۳، تفسیر روح المعانی، ج ۱، ص ۲۰۳، تفسیر روح البیان، ج ۱، ص ۹۳ پر ہے۔

ان تمام عبارات سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مشورہ کی تعلیم دینے اور آدم علیہ السلام کی تعظیم و دیگر حکمتوں کی بنا پر آدم علیہ السلام کے پیدا کرنے سے پہلے فرشتوں سے مشورہ لیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ غنی ہے، ثابت ہوا کہ مشورہ لینا ہمیشہ احتیاج و عاجزی کی وجہ سے ہی نہیں ہوتا، بلکہ حکمتوں پر بھی مبنی ہوتا ہے، پھر یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ فرشتوں سے مشورہ فرمانا اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف نہیں تو حضور نبی کریم ﷺ سے مشورہ کرنا کیونکر عظمت خداوندی کے منافی ہوسکتا ہے؟

مشورہ کے معنی اور معترض کی غلط فہمی کا ازالہ

لفظ مشورہ عرب کے قول "شِرْتُ الْعَسَلَ" سے ماخوذ ہے، یعنی میں نے شہد کو اس کی جگہ سے نکال لیا، مشورہ کے معنی ہیں "استخراج الرائے" بیضاوی میں ہے "المشورۃ استخراج الرّائی بمراجعۃ البعض الی البعض" (مفردات امام راغب، ص ۲۷۲)، خلاصہ یہ کہ کسی کی طرف رجوع کر کے اس کی رائے کے استخراج کا نام مشورہ ہے، مشورہ میں یہ ضروری نہیں کہ متکلم و مخاطب میں سے ہر ایک کی رائے کا استخراج ہو، بلکہ صرف مخاطب کی رائے لینا بھی کافی ہے، اللہ تعالیٰ متکلم ہے اور فرشتے مخاطب، اللہ تعالیٰ نے انی جاعلٌ فی الارض خلیفۃ کہہ کر فرشتوں کی رائے لی اور فرشتوں نے اتجعل فیھا کہہ کر اپنی رائے ظاہر کر دی، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی اُمت کے بارے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ماذا افعل بھم فرما کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رائے لی، حضور ﷺ نے ماشئت یارب ھم خلقك وعبادك فرمایا، اور اللہ تعالیٰ کا یہ مشورہ لینا اور رائے طلب فرمانا بالکل ایسا ہے، جیسے اپنے نبیوں یا فرشتوں یا کسی فرد مخلوق سے کسی بات کا پوچھنا اور سوال فرمانا، قرآن کریم میں بے شمار آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے استفسارات وسوالات مذکور ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا!

أَوَلَمْ تُؤْمِنْ اے ابراہیم! کیا تو ایمان نہیں لایا؟ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا بلیٰ کیوں نہیں، میں ضرور ایمان لایا، اسی طرح قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نبیوں سے سوال فرمائے گا ماذا أُجبتم اے نبیو! بتاؤ تم کیا جواب دیئے گئے؟ نیز عیسیٰ علیہ السلام سے دریافت فرمائے گا ءانت قلت للناس اتخذونی وأمی الهين من دون الله اے عیسیٰ کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود بنالو، نیز موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے دریافت فرمایا وما تلك بيمينك يموسىٰ اے موسیٰ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟

اگر مشورہ کرنا یعنی کسی کی رائے دریافت کرنا، احتیاج اور عاجزی پر منحصر ہو تو کسی بات کا پوچھنا بھی معاذ اللہ لاعلمی اور احتیاج پر مبنی ہوگا، لہٰذا معترض نے جہاں حدیث استشارہ کا انکار کیا ہے، وہاں اللہ تعالیٰ کے سوالات کی تمام آیات کا بھی انکار کر دے، اور اگر سوالات میں حکمت کا قائل ہے تو استشارہ میں اسی حکمت کا کیوں انکار کرتا ہے؟[1]

فوضح الحق حق الوضوح ولله الحجة البالغة

[1] ماہنامہ السعید ملتان: شمارہ دسمبر ۱۹۵۹ء

حدیث نمبر (۱۶)

لا الہ الا اللہ کی گواہی، ضمانت جنت

قال حدثني ابو هريره قال كنا قعوداً حول رسول الله ﷺ معنا ابو بكر و عمر في نفر فقام رسول الله ﷺ من بين اظهرنا فابطأ علينا وخشينا ان يقتطع دوننا وفزعنا فقمنا فكنت اوّل من فزع فخرجت ابتغي رسول الله ﷺ حتي اتيت حائطاً للانصار لبني النجار فدرت به هل اجد له باباً فلم اجد فاذاً ربيع يدخل في جوف حائطٍ من بئرٍ خارجةٍ والربيع الجدول قال فاحتفزت كما يحتفز الثعلب فدخلت علي رسول الله ﷺ فقال ابو هريره فقلت نعم يارسول الله قال ماشانك قلت كنت بين اظهرنا فقمت فابطات علينا فخشينا ان تقتطع دوننا ففزعنا فكنت اوّل من فزع فاتيت هذا الحائط فاحتفزت كما يحتفز الثعلب وهٰؤلاء الناس ورائي فقال يا ابا هريرة واعطاني نعليه قال اذهب بنعلي هاتين فمن لقيت من وراء هذا الحائط يشهد ان لا اله الا الله مستيقنا بها قلبه فبشره بالجنة فكان اوّل من لقيت عمر فقال ما هاتان النعلان يا ابا هريرة فقلت هاتان نعلا رسول الله ﷺ بعثني بهما من لقيت يشهد ان لا اله الا الله مستيقنا بها قلبه بشرتهُ بالجنة فضرب عمر بيده بين ثديي فخررت لاستي فقال ارجع يا ابا هريرة فرجعت الي رسول الله ﷺ فاجهشت بكاء وركبني عمر فاذا هو علي اثري فقال لي رسول الله ﷺ مالك يا ابا هريرة قلت لقيت عمر فاخبرته بالذي بعثتني

به فضرب بین ثدیي ضربة خررت لاستي قال ارجع فقال له رسول الله ﷺ یا عمر ما حملك علی ما حملك علی ما فعلت قال یا رسول الله بابي انت وامي ابعثت ابا هریرة بنعلیك من لقي یشهد ان لا اله الا الله مستقینا بها قلبه بشره بالجنة قال نعم قال فلا تفعل فاني اخشي ان یتکل الناس علیها فخلهم یعملون قال رسول الله ﷺ فخلهم۔ رواہ مسلم [1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا! ہم بیٹھے ہوئے تھے رسول اللہ ﷺ کے آس پاس، اور ہمارے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی تھے ایک جماعت میں تو حضور ﷺ یکا یک ہمارے درمیان سے اُٹھ کر تشریف لے گئے اور واپس تشریف لانے میں بہت دیر فرمائی، ہمیں خوف ہوا کہ مبادا حضور ﷺ کو ہماری عدم موجودگی میں کوئی تکلیف نہ پہنچے، ہم سب گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے گھبرانے والوں میں سب سے پہلا میں تھا، میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تلاش کرتا ہوا نکلا، یہاں تک میں انصار بنی نجار کی چہار دیواری کھنچے ہوئے ایک باغ میں پہنچا، میں باغ کے آس پاس گھومتا رہا کہ کوئی دروازہ پاؤں، مگر میں نے (گھبراہٹ کی وجہ سے) اس کا کوئی دروازہ نہ پایا، ناگاہ پانی کی ایک نالی تھی جو باہر کے کنوئیں سے باغ کے اندر پہنچتی تھی، حضرت ابوہریرہ نے فرمایا کہ میں سکڑ کر اس نالی کے راستہ سے باغ میں داخل ہو کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گیا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا! ابوہریرہ آگئے، میں نے عرض کیا حضور ہاں، فرمایا تمہارا کیا حال ہے، میں نے عرض کیا، حضور آپ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے، پھر اچانک آپ کھڑے ہو گئے اور واپسی میں ہم پر بہت تاخیر فرمائی، ہم

[1] صحیح مسلم: مطبوعہ مصر ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۹ء، ص ۲۳۴ تا ۲۴۰

کتاب الایمان حدیث ۳۱ بیت الافکار ریاض ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء ص ۴۶

ڈرے کہ مبادا حضور کو ہماری غیر حاضری میں کوئی تکلیف نہ پہنچے تو ہم سب گھبرا گئے، سب سے پہلے گھبرانے والا میں ہی تھا، میں اس باغ میں آیا تو اس طرح سکڑا جس طرح لومڑی سکڑتی ہے اور یہ سب لوگ میرے پیچھے ہیں، حضور علیہ السلام نے فرمایا اے ابوہریرہ! اور مجھے حضور علیہ السلام نے اپنے نعلین شریفین (اپنی دونوں مبارک جوتیاں) عطا فرمائیں، پھر فرمایا کہ ہمارے یہ دونوں مبارک جوتے لے جاؤ جو تمہیں اس باغ کے پیچھے ملے اس حال میں کہ اپنے دل کے یقین کے ساتھ اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو تم اسے جنت کی خوش خبری سنادو، تو سب سے پہلے جن سے میں نے ملاقات کی وہ حضرت عمر تھے، حضرت عمر نے مجھ سے کہا اے ابوہریرہ! یہ نعلین شریفین کیسے ہیں؟ میں نے انہیں جواب دیا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں، یہ دے کر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے بھیجا ہے کہ جس کے ساتھ میں ملاقات کروں، درآنحالیکہ وہ اپنے دل کے یقین کے ساتھ گواہی دیتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں تو میں اُسے جنت کی خوشخبری سنادوں، حضرت عمر نے (یہ بات سن کر) میرے سینے میں ہاتھ مارا جس کی وجہ سے میں اپنے سرین کے بل گر پڑا، حضرت عمر نے پھر کہا کہ اے ابوہریرہ واپس چلے جاؤ (بالآخر) میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس لوٹا اور میں نے رو کر حضور کی بارگاہ میں فریاد کی، حضرت عمر کی ہیبت مجھ پر سوار تھی، ناگہاں وہ میرے پیچھے موجود تھے، حضور نے مجھ سے فرمایا! یا ابوہریرہ تمہیں کیا ہے، میں نے عرض کیا حضور میں حضرت عمر سے ملا اور میں نے انہیں اسی بات کی خبر دی جس کے ساتھ حضور نے مجھے بھیجا تھا، تو انہوں نے میرے سینے پر ایسا ہاتھ مارا کہ جس کی وجہ سے میں اپنی سرین کے بل گر گیا، پھر فرمایا کہ ابوہریرہ واپس چلے جاؤ، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت عمر سے فرمایا کہ اے عمر تمہیں اس فعل پر کس چیز نے برانگیختہ کیا؟ حضرت عمر نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں کیا آپ نے اپنی نعلین شریفین دے کر

ابوہریرہ کو اس لئے بھیجا کہ جس سے وہ ملاقات کریں اس حال میں کہ وہ دل کے یقین کے ساتھ اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں تو وہ اُسے جنت کی بشارت سنادیں، حضور علیہ السلام نے فرمایا! ہاں، حضرت عمر نے عرض کیا، حضور ایسا نہ کیجئے مجھے خوف ہے کہ لوگ اس پر بھروسہ کرلیں گے، لہذا حضور انہیں چھوڑ دیں کہ وہ عمل کرتے رہیں، حضور علیہ السلام نے فرمایا، اچھا انہیں چھوڑ دو۔ (اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا)

شرح

رسول اللہ ﷺ کا صحابہ کرام کے درمیان سے اُٹھنا ایک تجلی خاص کی بنا پر تھا، جس کا ورود بیٹھے بٹھائے قلب مبارک پر شروع ہوا، اور حضور ﷺ واردات کے اسی حال میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور بنی نجار کے باغ میں جلوہ افروز ہوگئے، جہاں اس تجلی الٰہی کا ظہور تام ہوا، اس تجلی کی ایک جھلک اس بشارت کی صورت میں ظاہر ہوئی جس کے ساتھ حضرت ابوہریرہ کو حضور نے بھیجا، چونکہ حضور علیہ السلام کی ہر بات وحی الٰہی ہے اور وحی الٰہی میں کسی غلطی اور کوتاہی کا امکان نہیں اس لئے حضور ﷺ کا ارشاد کہ فبشرہ بالجنۃ یقیناً حق اور وحی الٰہی کے مطابق تھا لیکن اس کی تبلیغ مقید تھی مطلق نہ تھی، کیونکہ حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں:۔ فمن لقيك من وراء هذا الحائط يشهد ان لا اله الا الله مستيقناً بها بقلبه فبشره بالجنة جو تجھے اس باغ کے پیچھے صدق دل سے " لا الہ الا اللہ " کی شہادت دینے والا ملے اُسے جنت کی بشارت دیدے، یہ بشارت من وراء ھذا الحائط کی قید سے مقید ہے لیکن حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونکہ محض محدث ہیں مجتہد نہیں اس لئے اس قید کی طرف اُن کا ذہن متوجہ نہیں ہوا، رہا یہ امر کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے سینے پر ہاتھ مار کر گرادیا، اور انہیں لوٹ جانے پر مجبور کیا، تو اس موقعہ پر بمقتضائے سیاق وسباق حضرت ابوہریرہ کا اتنا قول ضرور مخفی ماننا پڑے گا کہ حضرت

عمر نے مجھ سے فرمایا کہ واپس چلو، میں نے ان کی بات نہ مانی، پھر انہوں نے مارا کیونکہ بلا سبب مارنا عقل سلیم کی روشنی میں سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان کے لائق نہیں، ورنہ اگر واقعی حضرت عمر بلا وجہ مارتے تو حضور سید عالم ﷺ حضرت عمر کو ان کے اس فعل پر ضرور سرزنش فرماتے اور قصاص کا حکم صادر فرماتے، حضور ﷺ کا حضرت عمر کو کسی قسم کی سرزنش اور ان کے اس فعل پر انکار نہ فرمانا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ حضرت عمر نے حضرت ابو ہریرہ کو بلا وجہ نہیں مارا، اور وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ حضرت عمر کے کہنے پر واپس نہیں لوٹے۔

اس واقعہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابو ہریرہ کو کیوں واپس کیا، اس سے بظاہر رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کی مخالفت پائی جاتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجتہد تھے اور حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد سنتے ہی منشاء رسالت کو سمجھ گئے تھے، کہ صرف ایک فرد کو اس بشارت کا پہنچا دینا ہی ارشاد نبوی کی تعمیل ہے کیونکہ عوام اس اجمالی بشارت کے اہل نہیں جس میں صرف کلمہ شہادت پر نجات کا بیان ہے۔ فرائض و واجبات اور دیگر اعمال و طاعات کی کوئی تفصیل نہیں، ایسی اجمالی بشارت سے عوام کے حق میں یہ خوف ہو سکتا ہے کہ وہ محض کلمہ شہادت پر اکتفا کر کے باقی اعمال چھوڑ بیٹھیں۔

رہا یہ امر کہ نبی کریم ﷺ نے ایسی بشارت کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ کو کیوں بھیجا جو عوام کے لئے اس خوف کا موجب ہو سکتی تھی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ذات مقدسہ پر حضور کے اسم مبارک البشیر کی صفت بشارت کی تجلی کا غلبہ ہوا جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، انبیاء علیہم السلام پر تجلیات کا ورود محض منجانب اللہ ہوتا ہے اور حکمت الٰہیہ اس کی مقتضی ہوتی ہے، یہاں یہ حکمت تھی کہ غلبہ حال کے باعث اس امر کی طرف ملتفت ہوئے بغیر کہ عوام محض کلمہ شہادت پر اکتفا کر کے باقی اعمال چھوڑ بیٹھیں گے زبان رسالت

سے یہ بشارت ایک مرتبہ ادا ہو کر کسی لائق بشارت تک پہنچ جائے تاکہ صدقِ دل سے کلمۂ شہادت پڑھنے کے مدارِ نجات ہونے پر دلیل قائم ہو اور غلبہ حال اس عدم التفات کے لئے وجہ وجیہ قرار پائے اور اس کی وجہ سے حضور ﷺ کی ذاتِ مقدسہ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہ ہو سکے جو شانِ رسالت سے بعید ہے۔

یہ بشارت چونکہ تکمیلِ دین کے لئے تھی اس لئے حضور ﷺ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس کا اہل نہیں ہو سکتا تھا، البتہ عوام کے حق میں اس کے بعد جو خوف متوقع تھا اس کے ازالہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا دیا، جو رسول اللہ ﷺ کے فیضِ صحبت کی وجہ سے "کان رأیہ موافقاً بالوحی والکتاب اور ان اللہ جعل الحق علی لسان عمر" کے مصداق ہو چکے تھے اور جن کے متعلق خود زبانِ رسالت کا یہ ارشادِ گرامی رہتی دنیا تک باقی رہے گا کہ "لو کان بعدی نبی لکان عمر" چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابوہریرہ سے بشارت سن کر واپس لوٹنے کے لئے فرمایا، جس کا مقصد یہ تھا کہ اے ابوہریرہ حضور ﷺ کی بشارت آپ نے مجھے سنا دی، آپ تعمیلِ حکم سے بری الذمہ ہو گئے، تکمیلِ دین کا جو پہلو اس بشارت سے متعلق تھا وہ پورا ہو گیا، اب اس سے آگے اس بشارت کو عوام میں پھیلانا منشاءِ رسالت نہیں بلکہ اس امر کا باعث ہے کہ عوام اس بشارت کی وجہ سے اعمال چھوڑ کر محض کلمۂ شہادت پر اکتفا کر لیں، چنانچہ حضرت ابوہریرہ کے پیچھے پیچھے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے اور حضرت ابوہریرہ نے حضور ﷺ کے روبرو آہ و بکا کے ساتھ فریاد کی تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے عمر! تم نے ایسا کیوں کیا، حضرت عمر نے عرض کیا کہ آقا! کیا حضور نے صدقِ دل سے کلمۂ شہادت پڑھنے والے کو جنت کی بشارت دینے کے لئے ابوہریرہ کو بھیجا تھا؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، ہاں! حضرت عمر نے عرض کیا کہ حضور! ابوہریرہ کے اس بشارت کو سنا دینے سے تعمیلِ حکمِ نبوت ہو چکی، اب اس کے بعد عوام میں اس بشارت کو پھیلانے کا

کام نہ کیجیے، مبادا کہ وہ محض کلمہ شہادت پر اکتفا کر کے اعمال چھوڑ بیٹھیں، لہٰذا حضور انہیں عمل کرنے دیں، حضور ﷺ نے فرمایا اچھا انہیں چھوڑ دو کہ وہ عمل کرتے رہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی معروضات ان کی ذات سے نہ تھیں بلکہ یہ سب حضور ﷺ کے فیض صحبت سے تھا جسے انہوں نے اپنے الفاظ میں پیش کیا، تاکہ حضور ﷺ کی توجہ اس اس امر کی طرف مبذول ہو جائے، جس سے غیر ملتفت ہو کر حضور نے ابوہریرہ کو بشارت کے ساتھ بھیجا تھا، یہی وجہ تھی کہ سرکار دو عالم ﷺ نے حضرت عمر کے جواب میں ان کی معروضات پر مہر تصدیق ثبت فرما دی، حضرت عمر کے کلام میں اگر کوئی بات منشائے رسالت کے خلاف ہوتی تو حضور ﷺ یقیناً ان پر انکار فرماتے، لیکن ایسا نہیں ہوا، بلکہ حضرت عمر کے "فخلهم يعملون" کے جواب میں حضور ﷺ نے فخلهم ارشاد فرمایا جو اس بات کی روشن دلیل ہے کہ حضور ﷺ تجلی خاص کے حال سے مغلوب ہو کر بمقتضائے حکمت الٰہیہ جس امر کی طرف غیر ملتفت تھے حضرت عمر کی معروضات سن کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور حضرت عمر کی اس عرضداشت کو شرف قبولیت سے مشرف فرمایا جو انہوں نے حضور ہی کے ارشادات اور فیوض و برکات سے متاثر ہو کر پیش کی تھی۔

اس کی نظیر اس واقعہ کو قرار دیا جا سکتا ہے، جو قیامت کے دن پیش آئے گا، کہ حضور نبی کریم ﷺ حوض کوثر پر جلوہ افروز ہوں گے اور صفت جود و کرم سے متجلی ہو کر پیاسوں کو سیراب فرما رہے ہوں گے، اس وقت حضور ﷺ کے سامنے کچھ لوگ گذریں گے جنہیں فرشتے دوزخ کی طرف کھینچ کر لے جا رہے ہوں گے، حضور ﷺ انہیں دیکھ کر ارشاد فرمائیں گے" اصیحابی اصیحابی" یہ لوگ تو کچھ تھوڑی سی مدت میری صحبت میں رہے ہیں، فرشتے عرض کریں گے" اما شعرت ما احدثوا بعدك" یعنی حضور، کیا آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کام کیے، حضور علیہ السلام فرمائیں گے، اچھا انہیں دوزخ میں لے جاؤ، بعض نادان لوگ اس واقعہ سے حضور کی لاعلمی ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قیامت

کے دن تک بھی بعض امور کا حضور کو علم نہ ہوگا، ان میں یہ لوگ بھی شامل ہیں کہ حضور کو ان کے اعمال کی خبر نہ ہوگی۔

مگر یہ غلط ہے، حدیث شریف کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ حضور علیہ السلام ان کے کاموں سے بے خبر نہیں ہیں، فرشتے عرض کریں گے "اما شعرت ما احدثوا بعدك" حضور کیا آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا! "ما" نافیہ پر ہمزہ استفہام انکاری داخل ہے، نفی کی نفی اثبات ہوتا ہے، معنی یہ ہیں کہ حضور آپ جانتے تو ہیں، کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا، (جن روایات میں ہمزہ استفہام مذکور نہیں وہاں مقدر ہے اور یہ مذکور اس محذوف پر دلیل ہے کیونکہ واقعہ ایک ہے)۔ اس کے باوجود بھی حضور ان کی طرف نگاہ کرم فرما رہے ہیں، جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ "جود و کرم" کے غلبہ حال کی وجہ سے حضور ان کے اعمال قبیحہ کفر و ارتداد کی طرف ملتفت نہیں، جب فرشتے "اما شعرت ما احدثوا" بعدکو عرض کریں گے تو حضور ﷺ یہ بات سن کر فوراً ان کے اعمال کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور فرمائیں گے جاؤ جاؤ انہیں دوزخ میں لے جاؤ، بالکل یہی صورت حال حدیث زیر نظر میں ہے کہ حضور ﷺ غلبہ حال کی وجہ سے اس امر کی طرف ملتفت نہ تھے کہ اس نوعیت کی بشارت عوام کے لئے اعمال صالحہ چھوڑ دینے کا موجب ہو سکتی ہے، حضرت عمر کی گذارش سنتے ہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توجہ اس طرف مبذول ہو گئی، اور فرمایا اچھا انہیں چھوڑ دو کہ وہ عمل کرتے رہیں۔

معلوم ہوا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضور ﷺ کے امر کی قطعاً کوئی مخالفت سرزد نہیں ہوئی۔

اگر کہا جائے کہ حضور ﷺ نے صرف "لا الٰہ الا اللہ" کی شہادت پر جنت کی بشارت دے دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ "محمد رسول اللہ" کی شہادت نجات پانے کے لئے ضروری نہیں۔

تو میں عرض کروں گا کہ "لا الہ الا اللہ" کی شہادت کے بغیر "محمد رسول اللہ" کے ممکن نہیں، اس لئے کہ جو شخص محمد رسول اللہ کو نہیں مانتا اس کے لئے "لا الہ الا اللہ" کا جاننا محال ہے، تو ماننا بھی محال ہوا، اس سے ظاہر ہے کہ "لا الہ الا اللہ" کی شہادت کے لئے "محمد رسول اللہ" کی شہادت کا ہونا لازم ہے، اور قاعدہ ہے کہ اذا ثبت الشئی ثبت بجمیع لوازمه، جب کوئی چیز ثابت ہوگی تو اپنے تمام لوازمات کے ساتھ ثابت ہوگی لہذا "لا الہ الا اللہ" کی شہادت کے ساتھ" محمد رسول اللہ" کی شہادت کا ہونا لازم ہوگا، معلوم ہوا کہ "محمد رسول اللہ" کی شہادت کے بغیر نجات پانا ممکن نہیں۔

اس کے بعد اتنی بات باقی رہ جاتی ہے کہ حضور ﷺ نے جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو بشارت کے لئے بھیجا تو انہیں اپنی نعلین شریفین کس لئے عطا فرمائیں، اس میں کیا حکمت تھی؟ اس کے متعلق محدثین کے چند اقوال ہیں۔

بعض نے کہا نعلین شریفین کا عطا فرمانا بطور نشانی تھا۔ بعض کا قول ہے کہ صحابہ کرام کے اسلام پر ثابت قدم رہنے اور دین متین کے لئے جدوجہد کے میدان میں قدم بڑھانے اور سرگرم عمل رہنے کے لئے اشارہ تھا، ایک قول یہ بھی ہے کہ ایمان باللہ کا اقرار کرنے کے بعد استقامت اور ثابت قدمی کی طرف اشارہ مقصود تھا، یہ بھی ممکن ہے کہ حضور ﷺ نے نعلین مقدسین کے ساتھ حضرت ابوہریرہ کو اس لئے بھیجا ہو کہ صحابہ کرام سمجھ لیں کہ یہ بشارت رسول اللہ ﷺ کی نعلین مطہرین کے طفیل ملی ہے، لہذا حضور کی اتباع اور آپ کے قدم بقدم چلے بغیر اس بشارت عظمیٰ کا حصہ نہیں مل سکتا، اور ملا علی قاری نے مرقاۃ میں یہ بھی کہا کہ حضور ﷺ کو اس نوری مقام میں طوری تجلی حاصل ہوئی تو حضور ﷺ نے اپنے نعلین مقدسین اتار دیئے اور اپنے اصحاب کو (عطیہ) کونین عطا فرما دیا، یعنی دنیا اور آخرت دونوں جہان اپنے غلاموں کو بخش دیئے۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جنتی ہونے کا دارومدار صرف ایمان پر ہے۔ لیکن ساتھ یہ بھی ظاہر ہوا کہ ایسی مجمل بشارات بغیر شرح وتفصیل کے عوام کو نہ سنائی جائیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ عمل چھوڑ بیٹھیں۔ علاوہ ازیں یہ مسئلہ بھی اس حدیث سے واضح ہوگیا کہ جو شخص زبانی شہادت ادا کرنے پر قادر ہو اس کے لئے محض اعتقاد رکھنا نجات کے لئے کافی نہیں، بلکہ زبان سے کلمہ شہادت ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ واللہ اعلم

(فقیر سید احمد سعید کاظمی غفرلہ) [۱]

[۱] ماہنامہ السعید ملتان: شمارہ اکتوبر ۱۹۶۳ء

حدیث نمبر (17)

زمین پر اللہ کے گواہ

من اثنيتم عليه خيراً وجبت له الجنة ومن اثنيتم عليه شراً وجبت له النار انتم شهداء الله في الارض انتم شهداء الله في الارض انتم شهداء الله في الارض۔[1]

ترجمہ: تم نے خوبی کے ساتھ جس کی تعریف کی، اس کے لئے جنت واجب ہوگئی اور جس کی تم نے برائی کی اس کے لئے نار جہنم واجب ہوگئی۔ تم اللہ کے گواہ ہو اس کی زمین میں، تم اللہ کے گواہ ہو اس کی زمین میں، تم اللہ کے گواہ ہو اس کی زمین میں"۔

ایک دو لفظوں کے اختلاف کے ساتھ یہ حدیث بخاری شریف (کتاب الجنائز) میں بھی موجود ہے۔ مشکوٰۃ شریف (کتاب الجنائز) کی ایک حدیث میں پورا واقعہ اس طرح مروی ہے کہ ایک جنازہ گزرا، صحابہ کرام نے اس میت کی خوبیوں کے ساتھ تعریف کی، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا "وجبت" بے شک واجب ہوگئی، پھر دوسرا جنازہ گزرا تو صحابہ کرام نے اس کی برائی بیان کی، حضور سید عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "قد وجبت" بے شک واجب ہوگئی، صحابہ کرام نے عرض کیا حضور کیا چیز واجب ہوگئی، تو سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کی تم نے تعریف کی اس کے لئے جنت واجب ہوگئی اور جس کی تم نے مذمت کی اس کے لئے دوزخ واجب ہوگئی، تم اللہ کے گواہ ہو اس کی زمین پر، تین مرتبہ حضور ﷺ نے اس کلمہ کی تکرار فرمائی۔

یہ بات محتاج بیان نہیں کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو خدائی گواہ ہونے کا جو شرف حاصل ہوا وہ صرف اس لئے کہ انہیں بارگاہ نبوت سے قوی نسبت اور گہرا تعلق تھا، معلوم ہوا کہ اللہ کے وہ خاص بندے جنہیں بارگاہ رسالت سے غیر منقطع نسبت و رابطہ اور ختم

صحیح مسلم کتاب الجنائز، باب فیمن یثنی علیه خیر او شر من الموتی جلد

[1] مشارق الانوار ص ۷، مطبوعہ نظامی کانپور۔

صحیح بخاری کتاب الجنائز، باب ثناء الناس علی المیت، مطبوعہ بیت الافکار ریاض ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء حدیث نمبر ۱۳۶۷، ص ۲۶۹

نہ ہونے والا تعلق حاصل ہے، وہ اللہ کی زمین پر اللہ کے گواہ ہیں، جھوٹی گواہی ہر طرح مذموم ہے، چہ جائیکہ سرکاری گواہ جھوٹی گواہی دیں، پھر احکم الحاکمین جل مجدہ کے گواہ کس طرح جھوٹی گواہی دے سکتے ہیں، اور کوئی نادرست کلمہ اور راہ صواب کے خلاف امر کیونکر ان سے سرزد ہوسکتا ہے، اسی واسطے حضور اکرم ﷺ نے اپنے غلاموں سے ارشاد فرمایا کہ تم نے جس کی تعریف کر دی اس کے لئے جنت واجب ہوگئی اور تم نے جس کی برائی بیان کر دی اس کے لئے دوزخ واجب ہوگئی، تم اللہ کی زمین پر اللہ کے گواہ ہو، یعنی بحیثیت گواہ خداوندی ہونے کے تمہارے منہ سے نکلی ہوئی بات غلط نہیں ہوسکتی، جو کچھ تم کہہ دیتے ہو قلم قدرت بھی اس کی تائید وتصدیق فرما دیتا ہے۔

اس مضمون کی تائید میں مسلم شریف، جلد ثانی، کتاب الدیات، ص ۵۹ میں ایک اور حدیث بھی وارد ہوئی اور اس کے ہم معنی بخاری شریف میں بھی ایک حدیث ہے، ہم مسلم شریف سے وہ حدیث نقل کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ربیع کی بہن ام حارثہ نے ایک آدمی کو زخمی کر دیا، یہ مقدمہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں پیش ہوا، سرکار مدینہ ﷺ نے فرمایا! قصاص ادا کرو، قصاص۔

ربیع کی والدہ نے عرض کیا! کیا ام حارثہ سے قصاص لیا جائے گا؟ خدا کی قسم اس سے ہرگز قصاص نہ لیا جائے گا، حضور ﷺ نے فرمایا! سبحان اللہ اے ام ربیع قصاص تو اللہ کی کتاب کا حکم ہے، ام ربیع نے پھر کہا خدا کی قسم اس سے کبھی قصاص نہ لیا جائے گا، (ام ربیع کا اس انکار قصاص اور قسم، حضور ﷺ کے حکم مبارک کو نعوذ باللہ رد کرنا مقصود نہیں، بلکہ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ مستحقین قصاص کو عفو کی طرف رغبت ہو اور حضور ﷺ عفو کی سفارش فرمائیں۔ کما قال النووی (احمد سعید کاظمی)، کچھ دیر آپس میں گفتگو ہوتی رہی، یہاں تک کہ مستحق قصاص نے قصاص معاف کر دیا اور وہ دیت پر راضی ہو گئے، حضور اکرم نور مجسم ﷺ نے ارشاد فرمایا!

''ان من عباد الله من لو اقسم علی الله لابره'' [۱]

(بے شک اللہ کے بندوں میں سے بعض ایسے بندے ہیں کہ اگر وہ اللہ پر قسم کھالیں تو البتہ اللہ تعالیٰ ان کو (اس قسم میں) بری فرمادے)

امام نووی اس حدیث کے تحت ارقام فرماتے ہیں کہ:

''معناه لایخشه لکرامة علیه'' [۲]

(اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ وہ بندہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت مکرم و معظم ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی قسم میں حانث نہیں فرمایا)

اس حدیث کا مضمون حدیث سابق "انتم شهداء الله فی الارض" کے مضمون کی واضح طور پر تائید کر رہا ہے۔

بے شک اللہ کے خاص بندے جن کے قلوب انوار نبوت کے جلووں سے معمور ہیں، اللہ کی زمین پر اللہ کے گواہ ہیں، ان کے منہ سے نکلی ہوئی بات رائیگاں نہیں جاتی، مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے سچ فرمایا ہے:

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اللہ کے نیک اور متقی بندے چونکہ اللہ کی زمین پر اللہ کے گواہ ہیں اور ان کی زبانیں لغو و غلط سے پاک ہیں، ان کا کلام نادرستی اور کجروی سے مبرا ہے، اس لئے بارگاہ ایزدی میں وہ مستجاب الدعوات بھی ہیں، ان کا اجماع اور اجتہاد و قیاس حجۃ شرعیہ ہے۔ حدیث مبارک کے اس مضمون کو پیش نظر رکھتے ہوئے اندازہ فرمائیے کہ جن کے غلاموں کی یہ شان ہے، خود ان کا کیا مرتبہ ہوگا، اس مقام پر ان لوگوں کو خاص طور پر غور کرنا چاہئے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعائیں بھی رد ہوجاتی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لغزشیں اور غلطیاں سرزد ہوئیں۔

ان فی ذلک لعبرة لاولی الالباب۔ [۳]

---

[۱] مسلم شریف، جلد دوم، مطبوعہ کراچی، ص ۵۹ [۲] مسلم مع نووی، ص ۵۹

[۳] ماہنامہ السعید ملتان، شمارہ مئی، جون ۱۹۶۳ء، ص ۱۰۹

حدیث نمبر (۱۸)

ولی سے عداوت، اللہ تعالیٰ کا اعلان جنگ

عن ابي هريرة قال قال رسول الله ﷺ ان الله تعالي قال من عادي لي وليا فقد اذنته بالحرب وما تقرب كي عبدي بشيئ احب الي مما افترضت عليه وما يزال عبدي يتقرب الي بالنوافل حتي احبته فاذا احببته كنت سمعه الذي يسمع به وبصره الذي يبصر به ويده الذي يبطش بها ورجله التي يمشي بها (وفي رواية وفواده الذي يعقل به ولسانه الذي يتكلم به وايضاً في بعضها وبي يسمع وبي يبصر وبي يبطش وبي يمشي) ولئن سالني لا عطينه ولئن استعاذني لا عيذنه وما ترددت عن شيئ انا فاعله ترددي عن نفس المومن يكره الموت وانا اكره مسأته وفي بعض النسخ ولا بدله منه رواه البخاري" [1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس نے میرے ولی سے عداوت کی تو بے شک میں نے اسے اعلان جنگ کر دیا، اور نہ حاصل کی نزدیکی میرے لئے میرے بندے نے کسی ایسی چیز کے ساتھ جو زیادہ محبوب ہو میری طرف اس چیز سے جو میں نے اس پر فرض کی ہے، اور میرا بندہ نوافل کے ذریعہ ہمیشہ میری طرف نزدیکی حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے محبوب بنا لیتا ہوں، جب میں اسے محبوب بنا لیتا ہوں تو میں اس کی سماعت ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی بینائی ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، حدیث ۶۵۰۲

صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی، رقم حدیث ۶۵۰۲، ص ۱۲۴۷
طبع بیت الافکار، الریاض ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء

چلتا ہے (اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ میں اس کا دل ہو جاتا ہوں جس سے وہ ادراک کرتا ہے اور اس کی زبان ہو جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے، اور بعض روایات میں اتنے الفاظ اور بھی زیادہ ہیں کہ وہ بندہ مجھ سے سنتا ہے اور مجھ سے دیکھتا ہے اور مجھ سے پکڑتا ہے اور مجھ سے چلتا ہے) اور اگر وہ بندہ مجھ سے سوال کرے تو میں اسے ضرور دیتا ہوں، اور اگر وہ مجھ سے پناہ مانگے تو میں اسے ضرور پناہ دیتا ہوں، اور میں توقف نہیں کرتا کسی شے میں جسے میں کرنے والا ہوں، مثل میرے توقف کے مومن کی جان قبض کرنے سے کہ وہ (بحکم طبیعت) موت کو ناخوش رکھتا ہے اور میں اس کے غمگین ہونے کو ناپسند رکھتا ہوں، اور بعض نسخوں میں ہے کہ حال یہ ہے کہ بندے کو موت سے چارہ نہیں، اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا۔

حدیث کے معنی کا بیان

اس حدیث مبارک کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ولی سے عداوت، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ولی اللہ کے دشمن کو اعلان جنگ کا موجب ہے، نیز یہ کہ قرب فرائض قرب نوافل سے محبوب تر ہے، پھر قرب نوافل کی یہ شان ہے کہ نوافل کے ذریعہ قرب الٰہی حاصل کرنے والا بندہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہو جاتا ہے اور محبوبیت کے بعد اسے یہ شرف حاصل ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی شنوائی، بینائی، ہاتھ، پاؤں، دل اور زبان ہو جاتا ہے، وہ اللہ سے سنتا، اسی سے دیکھتا، اسی سے پکڑتا، اسی سے چلتا، اسی سے سمجھتا اور اسی سے بولتا ہے، ایسا شخص اللہ سے جو کچھ مانگے اللہ اسے ضرور دیتا ہے اور اس کے سوال کو ہرگز رد نہیں فرماتا اور خدا کا وہ محبوب اگر اللہ تعالیٰ سے پناہ ڈھونڈے تو اللہ اسے ضرور پناہ دیتا ہے، اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی روح اس وقت تک قبض نہیں فرماتا جب تک اس کے دل سے موت کی کراہت طبعی نہ جاتی رہے، اور رضائے الٰہی کی بشارت و کرامت سے مسرور نہ ہو جائے۔

ان مسائل کا بیان جو اس حدیث شریف سے مستنبط ہوتے ہیں

(۱) ولی اللہ کی عداوت خدا تعالیٰ کے قہر و غضب کا موجب ہے۔

(۲) قرب فرائض کا مرتبہ قرب نوافل سے بلند ہے۔

(۳) ادائے فرض یقیناً محبوب تر ہے لیکن نوافل بھی فرائض کے لئے مکمل و متمم ہیں۔

(۴) قرب نوافل اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کا سبب ہے۔

(۵) گناہ اور معاصی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہیں تو جب تک بندۂ مقرب گناہوں سے پاک نہ ہولے اس وقت تک محبوبیت کا بلند ترین مقام (جس کی بلندی مضمون حدیث سے واضح ہے) حاصل نہیں کرسکتا لہذا ضروری ہے کہ یہ بندہ جس نے قرب نوافل حاصل کیا ہے گناہوں سے پاک ہونے کے بعد محبوبیت کا شرف پائے۔ محبوب ہونا بعد کو ہوا اور گناہوں سے پاک ہونا پہلے۔ اس لئے کہ محبوبیت کے بعد جو مرتبہ اسے ملتا ہے وہ بہت ہی بلند مقام ہے اور وہ یہ کہ بندۂ مقرب مظہر صفات الٰہیہ ہوجاتا ہے۔ اور صفات خداوندی کے انوار اس میں چمکنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی صفت سمع و بصر و ید و رجل و قدرت و کلام و علم و حکمت سب کے انوار سے وہ منور و روشن ہوجاتا ہے۔ اور قرب خداوندی کا اصل مفہوم بھی یہی ہے۔ نیز عظمت انسان کی بلندی کا صحیح معیار یہی کمال ہے۔ اس کو شرک کہنا کمال انسانی اور جواہر انسانیت سے معریٰ اور بے خبر ہونے کی دلیل ہے۔

(۶) جب بندۂ مقرب صفات الٰہیہ کے انوار سے منور اور اللہ تعالیٰ کی سمع و بصر کا مظہر ہوکر کسی چیز کو سنے یا دیکھے گا تو ظاہر ہے کہ اس میں قرب و بعد کی قید نہ پائی جائے گی اور یہ بھی ناممکن ہوگا کہ کوئی مسموع یا مُبصر اس بندۂ مقرب کی سمع و بصر سے خارج رہے۔ اسی طرح اس کی قوت و قدرت اور عمل و تصرف اور علم و ادراک بھی عام ہوگا۔ ہر نزدیک اور دُور کی چیز اور ہر مشکل اور آسان کام اس کے لئے یکساں ہوگا۔ اس کی قوت تصرف سب کو شامل ہوگی اور یہ

شرک نہ ہوگا، اس لئے کہ یہ صفات وکمالات دراصل صفات الٰہیہ اور کمالات خداوندی ہیں جو اس بندۂ مقرب کے لئے بالاستقلال ثابت نہیں، اور یہ بندۂ مقرب مستقلاً ان سے موصوف نہیں، بلکہ اپنے تزکیۂ نفس اور صفائے باطن اور جلائے قلب کے باعث ان کا مظہر ہے، جیسے آئینہ اپنے مجلّٰی اور مصقل ہونے کی وجہ سے آفتاب کا مظہر ہوجاتا ہے، چمکتے ہوئے آفتاب کے سامنے دس ہزار شیشے رکھ دیئے جائیں، وہ شیشے مجلّٰی اور صاف ہوں اور شیشوں اور آفتاب کے درمیان کوئی حائل نہ ہو تو یقیناً ایک آفتاب سب شیشوں میں چمکتا ہوا نظر آئے گا، اور کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ شیشوں میں نظر آنے والے آفتاب کے جلوے مستقل آفتاب ہیں، بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ کے عباد مقربین کے قلوب آئینہ کی طرح مجلّٰی اور مصفّٰی ہوتے ہیں، ان کے، اور انوار صفات الٰہیہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا لہذا وہ صفات باری تعالیٰ اور کمالات خداوندی کے انوار سے روشن اور منور ہوجاتے ہیں، وہ خدا نہیں ہوتے اور ان کی یہ مظہریت ان کے کمالِ قرب خداوندی کی دلیل ہے۔

(۷) بیان سابق کی روشنی میں یہ مسئلہ بھی واضح ہوگیا کہ جو لوگ اس حدیث کے یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ بندۂ مقرب جب اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بندے کی سمع و بصر ہوجاتا ہے، یعنی اس بندے کے کان گناہوں سے پاک ہوجاتے ہیں، اس کی آنکھ بھی گناہ نہیں کرتی، اسی طرح ہاتھ پاؤں، زبان اور دل کے گناہوں سے وہ پاک ہوجاتا ہے، یعنی پھر وہ بندہ اپنے کانوں سے کوئی ناجائز بات نہیں سنتا، اپنی آنکھوں سے خلاف شرع کوئی چیز نہیں دیکھتا، اپنے ہاتھ پاؤں سے خلاف شرع کوئی کام نہیں کرتا۔

یہ معنی بالکل غلط ہیں اور حدیث شریف میں تحریف کرنے کے مترادف ہے، کیونکہ اس معنی سے تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے نزدیکی حاصل کرنے والا بندہ محبوب ہونے کے بعد اپنے کسی عضو یا حصہ سے گناہ نہیں کرتا اور اپنے کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں سے جو کام کرتا ہے وہ سب جائز اور شرع کے مطابق ہوتے ہیں، لیکن اس معنی کو جب الفاظ حدیث پر پیش کیا

جاتا ہے تو حدیث شریف کا کوئی لفظ اس کی تائید نہیں کرتا، کیونکہ ایک معمولی سمجھ والا انسان بھی اس بات کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ گناہوں سے بچنے کی وجہ سے تو وہ محبوب بنا، اگر گناہوں میں مبتلا ہونے کے باوجود بھی محبوبیت کا مقام حاصل ہو سکتا ہے تو تقویٰ اور پرہیز گاری کی تو پھر ضرورت ہی نہیں رہتی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے!

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ

ترجمہ: آپ فرمایئے (انہیں کہ) اگر تم محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری پیروی کرو (تب) محبت فرمانے لگے گا تم سے اللہ۔

معلوم ہوا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع یعنی تقویٰ اور پرہیز گاری کے بغیر مقام محبوبیت خداوندی کا حصول ناممکن ہے۔

بندہ پہلے برے کاموں کو چھوڑتا ہے، ان سے توبہ کرتا ہے، فرائض ونوافل ادا کرتا ہے، تب وہ محبوب ہو جاتا ہے، محبوب ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ اس بندے کے کان ہو جاتا ہے، جس سے پھر وہ سنتا ہے، اللہ اس کی آنکھ ہو جاتا ہے، جس سے وہ دیکھتا ہے، اللہ اس کے ہاتھ ہو جاتا ہے، جس سے وہ پکڑتا ہے، اللہ اس کے پاؤں ہو جاتا ہے، جس سے وہ چلتا ہے، یہ سب کچھ محبوب بننے کے بعد ہوتا ہے، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ بندہ برے کام بھی کرے اور محبوب بھی بن جائے اور بعد میں برے کام چھوڑے۔

تو بندہ جب اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی صفت سمع، بصر اور قدرت کے انوار، بندے کی سمع، بصر اور قدرت میں ظاہر ہونے لگتے ہیں اور اس طرح یہ مقرب بندہ صفات الٰہیہ کا مظہر بن جاتا ہے، یعنی یہ بندہ اللہ تعالیٰ کے نور سمع سے سنتا ہے، اسی کے نور بصر سے دیکھتا ہے اور اسی کے نور قدرت سے تصرف کرتا ہے، نہ خدا بندے میں حلول کرتا ہے اور نہ بندہ خدا ہو جاتا ہے، بلکہ خدا کا یہ مقرب بندہ مظہر خدا ہو کر کمال انسانیت کے اس مرتبہ پر فائز

ہوتا ہے جس کے لئے اس کی تخلیق ہوئی تھی، اگر آپ غور فرمائیں گے تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ آیت کریمہ "وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون" کے معنی یہی ہیں جن کا مصداق یہ عبد مقرب ہے، عبادت کے معنی پامالی کے ہیں، عبد مقرب اپنی انانیت اور صفاتِ بشریت کو اپنے رب کی بارگاہ میں پامال یعنی ریاضت ومجاہدہ کے ذریعے ان کو فنا کر دیتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس بندے میں اس کی اپنی صفات عبدیت کی بجائے صفاتِ حق متجلی ہوتی ہیں اور انوار صفات الٰہیہ سے وہ بندہ منور ہو جاتا ہے۔ جب قرآن سے ثابت ہے کہ درخت سے "انی انا اللہ" کی آواز آسکتی ہے تو عبد مقرب کے لئے کیونکر محال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات سمع و بصر کا مظہر نہ ہو سکے۔

بیان سابق میں اس کے جواب کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ بندۂ مقرب کو یہ مرتبہ محبوبیت کے بعد ملتا ہے اور گناہوں سے پاکیزگی کا مرتبہ محبوبیت سے مقدم ہے، لہذا ثابت ہو گیا کہ "بی سمع" الحدیث، گناہوں سے پاک ہونے کا بیان نہیں بلکہ محبوبیت کے بعد مظہر صفات خداوندی ہونے کا بیان ہے۔

علاوہ ازیں اگر "بی سمع" کے معنی گناہوں سے پاک ہونے کے لئے جائیں تو یہ ایسے معنی ہونگے جن کا الفاظ حدیث سے کوئی تعلق نہ ہوگا، اور یہ امر بالکل واضح ہے کہ الفاظ حدیث ان معنی کے قطعاً متحمل نہیں مولوی انور شاہ صاحب کشمیری نے بھی "فیض الباری شرح صحیح بخاری" میں صاف لکھ دیا کہ "حدیث کے یہ معنی بیان کرنا حق الفاظ سے تجاوز اور کج روی ہے۔ دیکھئے فیض الباری، جز ۴، ص ۴۲۸۔ آگے چل کر مولوی انور شاہ صاحب کشمیری نے اسی جلد کے ص ۴۲۹ پر ہمارے منقولہ بالا معنی کی زور شور سے تائید کی ہے، نیز امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تفسیر کبیر میں اس حدیث کے یہی معنی بیان فرمائے، ہم ان کی عربی عبارت کا خلاصہ اردو زبان میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیے، امام رازی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کی زبان اقدس پر فرمایا! میرا بندہ میری طرف کسی چیز کے ذریعے وہ نزدیکی نہیں حاصل کرسکتا جو ادائے فرائض کے ذریعہ حاصل کرتا ہے. اور نوافل کے ذریعہ وہ مجھ سے ہمیشہ قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں، پھر جب وہ میرا محبوب ہوجاتا ہے تو میں اس کے کان، آنکھ، زبان، دل، ہاتھ اور پاؤں ہوجاتا ہوں، وہ مجھ سے سنتا ہے، مجھ سے دیکھتا ہے، مجھ سے بولتا ہے اور مجھ سے چلتا ہے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان بندگان مقربین کی آنکھوں کانوں بلکہ تمام اعضا میں غیر اللہ کے لئے کوئی حصہ باقی نہیں رہا، اس لئے کہ اگر یہاں اللہ تعالیٰ کے غیر کے لئے کچھ باقی رہا ہوتا تو اللہ تعالیٰ یہ کبھی نہ فرماتا کہ میں اس کی سمع اور بصر ہوجاتا ہوں"۔

اس کے بعد آگے چل کر یہی امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

"اور اسی لئے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ خدا کی قسم میں نے خیبر کا دروازہ جسمانی قوت سے نہیں اکھاڑا بلکہ ربانی قوت سے اکھاڑا تھا، اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس وقت حضرت علی کی نظر عالم اجساد سے منقطع ہوچکی تھی اور ملکی قوتوں نے حضرت علی کو عالم کبریا کے نور سے چمکا دیا تھا، جس کی وجہ سے ان کی روح قوی ہوکر ارواح ملکیہ کے جواہر سے مشابہ ہوگئی تھی اور اس میں عالم قدس وعظمت کے انوار چمکنے لگے تھے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں وہ قدرت حاصل ہوگئی جو ان کے غیر کو حاصل نہ تھی، اور اسی طرح جب کوئی بندہ نیکیوں پر ہمیشگی اختیار کرتا ہے تو اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے "کنت لہ سمعاً وبصراً" فرمایا ہے، جب اللہ تعالیٰ کے جلال کا نور اس کی سمع ہوجاتا ہے تو وہ دورونزدیک کی آوازوں کو سن لیتا ہے، اور جب یہی نور اس کی بصر ہوجاتا ہے تو وہ دورونزدیک کی چیزوں کو دیکھ لیتا ہے اور جب یہی نور جلال اس کا ہاتھ ہوجاتا ہے تو یہ بندہ ہر مشکل وآسان اور قریب وبعید چیزوں میں تصرف کرنے پر قادر ہوجاتا ہے"۔ [1]

---

[1] تفسیر کبیر، جلد ۵، ص ۶۸۷، ۶۸۸

جلد ۲۱، زیر آیت ۹ ام حسبت ان اصحاب الکہف، ص ۹۴
مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء

اسی مضمون کی تائید تفسیر روح المعانی، پ ۱۵، ص ۱۴۶، ۱۴۷، اور الیواقیت والجواہر، ص ۱۲۵ پر بھی موجود ہے۔

(۸) حدیث شریف سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مقربین کے سوال کو رد نہیں فرماتا بلکہ وہ جو کچھ اپنے رب سے مانگتے ہیں، رب تعالیٰ انہیں ضرور دیتا ہے، کیونکہ حدیث پاک میں اللہ تعالیٰ کا فرمان صاف طور پر موجود ہے" وان سالنی لا عطینہ یعنی اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں اسے ضرور دیتا ہوں، اور عبد مقرب سے اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ عام ہے خواہ وہ دنیا میں مانگے یا برزخ میں یا آخرت میں، اپنے لئے یا کسی دوسرے کے لئے، اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے "لا عطینہ" میں اسے ضرور دوں گا، چونکہ اللہ تعالیٰ کسی وقت کسی کے لئے ان کا سوال کبھی رد نہیں فرماتا، اس لئے اہل سنت اپنی حاجت اور اپنی مراد اللہ تعالیٰ کے مقربین سے منگواتے ہیں، دنیا میں بھی صالحین سے دعا کی درخواست کرتے ہیں اور جب وہ عالم برزخ میں ہوتے ہیں تو اس وقت بھی ان کے مزارات مقدسہ پر جا کر ان سے طالب دعا ہوتے ہیں، اور ان شاء اللہ آخرت میں بھی ان سے طالب شفاعت ہوں گے، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے مقربین وصالحین کا سوال رد نہیں فرماتا۔

اسی طرح ان کا پناہ ڈھونڈنا بھی عام ہے، اپنے لئے پناہ طلب کریں یا کسی دوسرے کے لئے، دنیا میں پناہ مانگیں یا برزخ میں یا آخرت میں، لہٰذا مومنین ہر حالت میں صالحین سے التجا کرتے ہیں کہ آپ ہمارے لئے ہمارے رب سے پناہ طلب فرما دیں، آپ کی پناہ جوئی ضائع نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ رب تعالیٰ کا وعدہ ہے " ولئن استعاذنی لا عیذنہ" یعنی اگر وہ مجھ سے پناہ مانگے تو میں اسے ضرور پناہ دیتا ہوں، ثابت ہوا کہ اولیاء اللہ سے علی الاطلاق اپنے لئے دعا و استعاذہ کا طالب ہونا جائز اور درست ہے۔

(۹) مومن کے لئے موت کا بحکم طبیعت مکروہ ہونا بری بات نہیں۔

(۱۰) اللہ تعالیٰ مقربین کی ارواح طیبہ کو اس وقت قبض فرماتا ہے جب کہ انہیں اپنی

رضا و عطا کی بشارت و کرامت سے مسرور فرما کر موت سے ان کی کراہت طبعی کو دور فرما دیتا ہے، اور اپنی لقاء و وصال کا انہیں مشتاق بنا دیتا ہے۔

(۱۱) یہ تمام کمالات مذکورہ سابقہ قرب نوافل سے متعلق ہیں اور ظاہر ہے کہ قرب فرائض قرب نوافل سے بہت زیادہ محبوب اور ارفع و اعلیٰ ہے تو معلوم ہوا کہ قرب فرائض کے ساتھ تقرب حاصل کرنے والے مقربین کے کمالات ان سے زیادہ اقویٰ اور اعلیٰ ہیں، پھر انبیاء علیہم السلام اور ان کے بعد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و قدرت، سمع و بصر اور قوت تصرف کا کیا عالم ہوگا؟

قیاس کن از گلستان من بہار مرا[۱]

---

[۱] ماہنامہ السعید ملتان شمارہ ستمبر ۱۹۵۹ء، ص ۲۱ تا ۲۴

حدیث نمبر (۱۹)

حدیث ربیعہ: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قاسم جنت

"وعن ربيعة بن كعب، قال: كنت أبيت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فاتيته بوضوءه وحاجته فقال لي سل فقلت اسألك مرافقتك في الجنة قال او غير ذلك؟ قلت هو ذاك، قال: فاعني على نفسك بكثرة السجود- رواه مسلم"[1]

(ربیعہ بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے وضو کا پانی اور جس چیز کی آپ کو ضرورت ہوا کرتی تھی (مسواک، مصلی وغیرہ) لایا کرتا تھا، (ایک بار دریائے رحمت جوش میں آیا) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے ربیعہ مانگ، انہوں نے عرض کی! حضور میں جنت میں آپ کی رفاقت مانگتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کچھ اور بھی مانگتے ہو؟ حضرت ربیعہ نے عرض کی بس حضور یہی مانگتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا پس تم کثرت سجود سے میری مدد کرو۔)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کیا مانگ، کیا نہ مانگ، کیا دے سکتا ہوں کیا نہیں دے سکتا، فرمایا "سل" (مانگ)، اسی لئے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے "اشعۃ اللمعات" میں صاف صاف فرمایا:

"(فقال لی سل) پس گفت آں حضرت مرا بطلب ہر چہ می خواہی از خیر دنیا وآخرت...... واز اطلاق سوال کہ فرمود "سل" بخواہ وتخصیص نکرد بمطلوبے خاص معلوم مے شود کہ کار ہمہ بدست ہمت وکرامت اوست صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر چہ خواہد ہر کرا خواہد باذن پروردگار خود بدہد۔

[1] مشکوٰۃ: کتاب الصلاۃ، باب السجود وفضلہ، رقم الحدیث ۸۹۶

صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب فضل السجود، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۲۴ھ/۲۰۰۳ء، رقم الحدیث: ۹۸۱، ص ۲۳۴

بیت

فان من جودک الدنیا وضرتہا
ومن علومک علم اللوح والقلم

''دنیا اور آخرت یارسول اللہ آپ کے جود وسخا سے کچھ حصہ ہے اور لوح وقلم کا علم آپ کے علوم سے کچھ حصہ ہے''۔

بیت

اگر خیریت دنیا وعقبیٰ آرزو داری
بدرگاہش بیاؤ ہرچہ مے خواہی تمنا کن

''(اے مسلمان) اگر تو دنیا اور آخرت کی خیریت کی آرزو رکھتا ہے تو حضور کی بارگاہ میں حاضر ہو جو جی میں آئے مانگ''۔[1]

نواب صدیق حسن خاں غیر مقلد نے بھی اس حدیث کی شرح میں یہی بات لکھی :

''قال لی النبی گفت مرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سل بطلب ہرچہ میخواہی از خیر دنیا و آخرت واز اطلاق این سوال کہ فرمود بخواہ وتخصیص نکرد بمطلوبی خاص معلوم میشود کہ کار ہمہ بدست وہمت کرامت اوست صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرچہ خواہد ہر کرا خواہد باذن پروردگار خود بدہد''۔[2]

حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

'' یؤخذ من اطلاقہ علیہ السلام الأمر بالسوال أن اللہ تعالیٰ مکنہ من اعطاء کل ما ارادمن خزائن الحق ''۔

(یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو مانگنے کا حکم مطلق دیا، اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ

---

[1] اشعۃ اللمعات، جلد ا صفحہ ۳۹۶

[2] مسک الختام شرح بلوغ المرام، مطبوعہ مطبع نظامی کانپور، ۱۲۸۸ھ، جلد اول، ص ۲۷۶

اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں سے جو کچھ چاہیں عطا فرمائیں)

پھر فرماتے ہیں :

" وذكر ابن سبع في خصائصه وغيره ان الله تعالیٰ اقطعه ارض الجنة يعطي منها ماشاء لمن يشاء " ۔

(یعنی امام ابن سبع وغیرہ علماء نے حضور ﷺ کے خصائص کریمہ میں ذکر کیا ہے کہ جنت کی زمین اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی جاگیر کر دی ہے۔اس میں سے جو چاہیں جس کے لئے چاہیں بخش دیں)۔ [1]

نسائی شریف کی حدیث میں "سلنی" کے الفاظ ہیں۔سلنی کا معنی ہے مجھ سے مانگ : [2]

اور طبرانی کی حدیث میں یہ الفاظ ہیں " یا ربيعة سلني فاعطيك" یعنی اے ربیعہ مجھ سے مانگ میں عطا کروں۔ (سبحان اللہ) [3]

ابو داؤد شریف کی حدیث میں بھی "سلنی" (مجھ سے مانگ) کے الفاظ ہیں : [4]

مرقاۃ شرح مشکوۃ میں علامہ شیخ علی قاری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں :

" (سل) أي اطلب مني حاجة " یعنی مجھ سے حاجت طلب کر۔ [5]

یہاں اگر کوئی اعتراض کرے کہ اگر حضور ﷺ نے حضرت ربیعہ کو جنت دے دی تو پھر یہ کیوں فرمایا " فاعنی علی نفسک بکثرت السجود" اے ربیعہ کثرت سجود سے میری مدد کرو ؟

"فاعني على نفسك بكثرت السجود" اے ربیعہ کثرت سجود سے میری مدد

---

[1] مرقاۃ شرح مشکوۃ، جزالثانی مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ص ۵۶۷

[2] نسائی، جزاول، کتاب التطبیق، حدیث ۱۱۳۷، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، ص ۲۷۵

[3] المعجم کبیر طبرانی، جزالخامس، حدیث ۴۵۷۶، مکتبہ ابن تیمیہ قاہرہ، ص ۵۸

[4] سنن ابی داؤد، کتاب الصلوۃ، حدیث ۱۱۹۳، جلد الخامس، مطبوعہ دار غراس الکویت، ص ۲۶

[5] مرقاۃ شرح مشکوۃ، جزالثانی مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ص ۵۶۷

کرو کا مفہوم یہ ہے کہ اے ربیعہ تجھے جنت میں میری رفاقت تو مل گئی، اب اگر تو یہ سمجھ کر کہ جنت تو مجھے مل گئی رکوع وسجود چھوڑے گا تو دوسرے لوگ بھی رکوع وسجود چھوڑ دیں گے ،اس طرح میرے دین میں خلل آئے گا، "فاعنی" کا مطلب ہے "فاعنی دینی" یعنی اے ربیعہ میرے دین کی مدد کرو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ان تنصروا اللہ ینصرکم" (سورۃ محمد، آیت ۷) یعنی اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا، اس آیت میں اللہ کی مدد کرنے سے کیا مراد ہے؟ اللہ کے دین کی مدد کرنا ہی تو ہے، مطلب یہ ہوا کہ اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے (تو) وہ تمہاری مدد کرے گا، یعنی اللہ تعالیٰ بھی دین کی مدد طلب فرما رہا ہے اور اللہ کا رسول ﷺ بھی دین کی مدد طلب فرما رہے ہیں "فاعنی علی نفسك بكثرت السجود" سے رسول اللہ ﷺ کی کمزوری ثابت کرنا چاہتے ہیں تو پہلے "ان تنصروا اللہ" سے اللہ تعالیٰ کی کمزوری ثابت کریں، لیکن یقیناً اللہ تعالیٰ بھی کمزوری سے پاک ہے اور اس کا رسول ﷺ بھی۔ واللہ الحمد

اگر "فاعنی" سے "فاعنی دینی" مراد نہ لیا جائے اور ضد کی جائے کہ حضور ﷺ نے تو فرمایا کہ میری مدد کرو اور کہا جائے کہ حضور ﷺ معاذ اللہ کیا دے سکتے ہیں؟ تو سنن نسائی و ابوداؤد کے الفاظ "سلنی" (مجھ سے مانگ) اور طبرانی کبیر کے الفاظ "سلنی فاعطیك" (مجھ سے مانگ کہ میں عطا کروں) کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ یہ الفاظ کسی محدث کے نہیں ہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کے الفاظ مبارکہ ہیں۔[1]

---

[1] آڈیو کیسٹ، خطبات کاظمی، حصہ دوم، مطبوعہ بزم سعید علی پور ضلع مظفر گڑھ ص ۹۵

حدیث نمبر (۴۰)

سواد اعظم کی پیروی

"عن انس بن مالك قال سمعت رسول الله ﷺ يقول ان امتي لا تجتمع علي ضلالة فاذا رايتم اختلافاً فعليكم بالسواد الاعظم"۔ (رواه ابن ماجه) [1]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری اُمت گمراہی پر جمع نہ ہوگی، جب تم اختلاف دیکھو تو سب سے بڑی جماعت کو لازم پکڑو۔

بعض لوگ سوال کیا کرتے ہیں کہ اسلام میں فرقہ بندی کیوں ہوئی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضور سید عالم محمد رسول اللہ ﷺ نے اس اختلاف وافتراق کی بابت پیشین گوئی فرمائی تھی۔

"وتفرق امتي علي ثلث وسبعين ملة كلهم في النار الا ملة واحده الخ"۔ (مشکوٰۃ)

(اور میری اُمت تہتر فرقوں میں منقسم ہو جائے گی، (ان میں سے) ایک جنت میں جائے گا اور بہتر دوزخ میں جائیں گے)

حضور سید عالم ﷺ کی پیش گوئی انسانی فطرت کے عین مطابق تھی، نظام کائنات اور رفتار زمانہ بھی اس پر شاہد ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ نسل انسانی ابتداً چند اصول کو تسلیم کر لیتی ہے پھر مرور زمانہ کی وجہ سے اس کے بعض افراد کے خیالات میں ان مانے ہوئے اصول کے متعلق تفاوت اور اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، بلکہ زیادہ مدت گزرنے کے بعد وہ اختلاف کچھ ایسی نوعیت اختیار کر لیتا

[1] سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب السواد الاعظم، ج ۲، دار الفکر بیروت ۱۴۲۴ھ/۲۰۰۳ء، حدیث ۳۹۵۰، ص ۱۹۳

ہے کہ اس جماعت میں سے ایک فرد بھی مسلمہ اصول پر قائم نہیں رہتا، لیکن آسمانی اور الہامی اصول اور سچے دین کی امتیازی شان یہ ہے کہ اس دین کو قبول کرنے والوں میں سے ضرور ایک جماعت ایسی ہوتی ہے جو اس کثرت اختلاف کے باوجود بھی حق وصداقت پر قائم رہتی ہے اور فرقہ بندی کا طوفان اس کے پائے استقلال کو ڈگمگا نہیں سکتا۔

مختصر یہ کہ غلط اصول کا ذکر ہی کیا؟ جب ان کی بنیاد ہی باطل ٹھہری تو ان میں حقانیت وصداقت کا تصور بھی نہیں ہوسکتا، تاریخ عالم گواہ ہے کہ الہامی اور آسمانی تعلیمات میں بھی نسل انسانی نے اس قدر اختلاف کیا کہ مدت مدید کے بعد ان کو قبول کرنے والوں کی اتنی قلیل تعداد حق وصداقت پر باقی رہی کہ اسے اکہتر یا بہتر یا تہتر حصوں میں سے ایک حصہ کہا جاسکتا ہے، انسان کی اس فطرت کے ساتھ گردش کائنات کا نقشہ بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔

رفتار زمانہ کے اثر سے زمانیات میں جو تفاوت پایا جاتا ہے اس کا انکار بھی نہیں ہوسکتا، زمانیات کے بہت تھوڑے افراد ایسے ہیں جو اس گردش لیل ونہار سے متاثر ہوکر مختلف اور متفاوت نہیں ہوتے اور پہلے حال پر قائم رہتے ہیں۔

بہر حال اس فطری اصول کے موافق ہادی اعظم نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اختلاف امت کے بارے میں جو کچھ فرمایا وہ عین حق وصواب پر مبنی تھا، لیکن اس مقام پر جو بات قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اس دور اختلاف وافتراق میں حق پسند اور نجات پانے والے گروہ کا کیسے پتہ چلے اور کیونکر معلوم ہو کہ موجودہ فرقوں میں کون حق پر ہے؟

اس حدیث مبارکہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی بات ارشاد فرمائی ہے کہ:

''فاذا رائیتم اختلافا فعلیکم بالسواد الاعظم''

جب تم اختلاف دیکھو تو سب سے بڑی جماعت کو لازم پکڑو۔

یہاں اختلاف سے مراد اصولی اختلاف ہے جس میں ''کفر وایمان'' اور ''ہدایت وضلالت'' کا فرق پایا جائے، یہاں فروعی اختلاف ہرگز مراد نہیں، کیونکہ وہ تو رحمت ہے جیسا کہ

حدیث شریف میں ہے "اختلاف اُمتی رحمۃ" میری اُمت کا (فروعی) اختلاف رحمت ہے۔[۱]

اس تفصیل کو ذہن میں رکھ کر موجودہ اسلامی فرقوں میں اس بڑے فرقے کو تلاش کیجئے، جو باہم اصولاً مختلف نہ ہو اور جس قدر اسلامی فرقے اس کے ساتھ اصولی اختلاف رکھتے ہوں وہ ان سب میں بڑا ہو تو میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ آپ کو ایسا فرقہ اہل سنت والجماعت کے سوا کوئی نہ ملے گا، جس میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، قادری، چشتی، سہروردی، نقشبندی، اشعری، ماتریدی سب شامل ہیں، یہ سب اہل سنت ہیں، اور ان کے مابین کوئی ایسا اصولی اختلاف نہیں جس میں کفر و ایمان یا ہدایت و ضلالت کا فرق پایا جائے۔

حنفی، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو اختلافی مسائل میں خطاء اجتہادی پر تسلیم کرتے ہیں، مگر ان کے مسائل کو (خطاء اجتہادی پر مبنی ہونے کے باوجود) ان کے حق اور ہدایت سے خالی نہیں سمجھتے، بخلاف معتزلہ، مرزائیہ، روافض و خوارج وغیرہم کے ان میں بعض گروہ ایسے ہیں جو اہل سنت کے نزدیک دائرہ اسلام و ایمان سے خارج ہیں اور بعض وہ ہیں کہ ہدایت سے بے بہرہ ضلالت میں مبتلا ہیں۔

لہٰذا اس دور پرفتن میں حدیث مذکور کی رو سے سواد اعظم اہل سنت والجماعت کا حق پر ہونا ثابت ہوا، جیسا کہ شیخ عبدالغنی دہلوی علیہ الرحمہ "انجاح الحاجۃ حاشیہ ابن ماجہ" میں اسی حدیث پر ارقام فرماتے ہیں۔

"فهذا الحديث معيار عظيم لأهل السنة والجماعة شكر الله سعيهم فانهم هم السواد الاعظم وذلك لا يحتاج الي برهان. فانك لو نظرت الي اهل الاهواء باجمعهم مع انهم اثنان وسبعون فرقة لا يبلغ عدد هم عشر اهل

---

[۱] اشعۃ اللمعات، جلد ۴، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۲ء، ص ۶۳۳

السنة واما اختلاف المجتهدين فيما بينهم وكذلك
اختلاف الصوفية الكرام والمحدثين العظام والقراء
الاعلام فهو اختلاف لا يضلل أحدهم الآخر الخ"۔[1]

یعنی یہ حدیث اہل سنت و جماعت (اللہ ان کی سعی کو مشکور فرمائے) کے لئے معیار عظیم ہے، بے شک وہی سواد اعظم ہیں اور یہ امر کسی برہان کا محتاج نہیں تمام اہل ہوا باوجود یکہ وہ بہتر فرقے ہیں کو اگر تم دیکھو تو وہ اہل سنت کے دسویں حصہ کو بھی نہ پہنچ سکیں گے، رہا مجتہدین اور اسی طرح صوفیاء کرام اور محدثین عظام اور قراء اعلام کا باہمی اختلاف تو وہ ایسا ہے کہ جس کی وجہ سے کوئی ایک دوسرے کی تضلیل نہیں کرتا۔

یہاں بعض لوگ یہ شبہ پیش کیا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے کہ

"منهم المؤمنون واكثرهم الفاسقون"[2]

(ان میں سے بعض مومن ہیں اور اکثر فاسق ہیں)

نیز ارشاد فرمایا:

"اعملوا آل داؤد شكراً وقليل من عبادي الشكور"[3]

(عمل کرو اے آل داؤد (علیہ السلام) شکر کا اور کم ہیں میرے بندوں سے شکر کرنے والے)

ان کے علاوہ اور آیات سے بھی یہ ثابت ہے کہ مومن اور نیک بندے قلیل ہیں، اس لئے یہ حدیث قرآن مجید کے خلاف ہے، لہذا قابل قبول نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ مدار نجات ایمان پر ہے، ایمان رکھنے والوں میں بھی ایسے لوگوں کی تعداد کم ہوتی ہے جو حسب استطاعت اللہ تعالیٰ کی پوری شکر

ترجمہ [illegible]
[illegible]

۱۔ انجاح الحاجۃ حاشیہ ابن ماجہ کتاب الفتن ص ۲۹۲، حاشیہ ۱

۲۔ سورۃ آل عمران، آیت ۱۱۰ ۳۔ سورۃ سبا، آیت ۱۳

گزاری کرنے والے کامل مومن ہوں۔

دوسرے یہ کہ جن آیتوں میں مومنین کو قلیل اور کفار کو کثیر فرمایا گیا ہے، وہاں کفار سے وہ بہتر فرقے بالخصوص مراد نہیں جو مدعی اسلام ہیں، بلکہ وہاں کفار سے عام کفار مراد ہیں جن میں اسلام کے مدعی اور منکر سب شامل ہیں، اور یہ امر واضح ہے کہ اسلام کے مدعی اور منکر تمام جہان کے کافروں کے مقابلہ میں سواد اعظم اہل سنت و جماعت کو لایا جائے تو یہ ضرور قلیل ہوں گے اور وہ کفار یقیناً کثیر ہوں گے، لہذا قرآن و حدیث میں کوئی اختلاف نہ رہا۔

بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ دوسری حدیث میں حضور ﷺ نے فرقہ ناجیہ کے متعلق فرمایا کہ "ما انا علیہ اصحابی"، (مشکوٰۃ ص)، (ناجی گروہ وہ ہے جو میرے اور میرے صحابہ کرام کے مسلک پر ہو)۔

اس حدیث میں سواد اعظم کا ذکر نہیں، اس کا جواب ظاہر ہے کہ یہ حدیث سواد اعظم والی حدیث کے خلاف نہیں بلکہ اس کو اور واضح کر رہی ہے کیونکہ "ما انا علیہ اصحابی" والی حدیث میں یہ اجمال باقی ہے کہ حضور ﷺ اور حضور کے صحابہ کے موافق کون ہے؟ تہتر فرقوں میں سے ہر فرقہ یہ کہہ سکتا ہے میرا عقیدہ اور مذہب حضور ﷺ اور صحابہ کرام کے موافق ہے۔ اس صورت میں ناجی گروہ کا پتہ نہیں چل سکتا، "ما انا علیہ اصحابی" والی حدیث نے اس اجمال کو دور کر دیا اور اس امر کو واضح کر دیا کہ جتنے فرقے اس امر کے مدعی ہوں گے کہ ہمارا دین و مذہب حضور ﷺ اور صحابہ کرام کے موافق ہے، وہ سب جھوٹے ہوں گے، میرے دین پر جو جماعت صحیح معنی میں قائم رہے گی وہ سواد اعظم ہوگی، لہذا تم سواد اعظم ہی کو لازم پکڑنا۔

اس مقام پر ایک اعتراض کا جواب دینا نہایت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ حدیث مبارک میں مذکور ہے کہ میری امت میں بہتر (۷۲) فرقے ناری ہوں گے اور ایک ناجی ہوگا، حالانکہ اگر ان فرقوں کو دیکھا جائے جو ہمارے نزدیک ناری ہیں تو ان کی تعداد سینکڑوں

سے متجاوز ہو چکی ہے، پھر اہل سنت کا وہ ایک فرقہ جو ہمارے نزدیک ناجی ہے اس میں بھی متعدد گروہ پائے جاتے ہیں، جیسے حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، علیٰ ہذا القیاس صوفیاء کرام اور علماء متکلمین وغیرھم میں بہت سے گروہ ہیں حالانکہ ہم ان سب کو ناجی سمجھتے ہیں، اس حدیث سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ناجی فرقہ صرف ایک ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث مبارک میں بہتر ناری فرقوں سے وہ فرقے مراد ہیں جو کفر والحاد اور گمراہی و بے دینی کا سرچشمہ اور جڑ ہیں، اسی طرح ایک ناجی گروہ سے وہ نجات پانے والا فرقہ مراد ہے جو اسلام و ایمان، ہدایت و رحمت کا منبع ہو اور یہی ان کی اصل و بنیاد ہے، ظاہر ہے کہ ایک جڑ سے کئی شاخیں نکلتی ہیں مگر ان کی اصل وہی جڑ ہے جس سے وہ نکلتی ہیں، شاخوں کی کثرت سے جڑوں کی کثرت لازم نہیں آتی، جیسے ایک قبیلے میں کئی خاندان ہوتے ہیں اور ہر خاندان میں کئی گھر اور ہر گھر میں کئی افراد، اسی طرح گمراہی کی بہتر (۷۲) جڑوں اور ضلالت کے بہتر قبیلوں سے سینکڑوں کیا ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں بھی اگر شاخیں اور خاندان و افراد پیدا ہو جائیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کی اصل اور قبیلے بھی اتنی ہی تعداد میں ہوں، مختصر یہ کہ جس طرح گمراہی کی بہتر جڑوں سے سینکڑوں ہزاروں شاخیں پیدا ہو گئیں (جنہیں فرقوں میں شمار کر لیا گیا) اسی طرح ہدایت کی ایک جڑ سے کئی شاخیں پیدا ہوئیں، مگر یاد رکھیے ضلالت کی جڑ کی ہر شاخ ضلالت ہوگی اور ہدایت کی جڑ سے جو شاخیں نمودار ہوں گی وہ سب ہدایت قرار پائیں گی۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

"والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا"[۱]

(جن لوگوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا (اس سے کہ وہ جہاد جانی ہو یا مالی، جسمانی ہو یا روحانی، جہاد اصغر ہو یا جہاد اکبر ہو) ہم انہیں اپنی راہوں کی طرف راہنمائی فرمائیں گے)

۱۔ سورۃ العنکبوت، آیت ۶۹

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے سبیل کی بجائے سُبل فرمایا، یعنی یہ نہیں فرمایا کہ ہم انہیں اپنی راہ کی طرف راہنمائی فرمائیں گے بلکہ یہ ارشاد فرمایا کہ ہم انہیں اپنی راہوں کی طرف راہنمائی فرمائیں گے۔

معلوم ہوا کہ سبیل خداوندی ایک نہیں بلکہ متعدد ہیں اور وہ وہی ہیں جن کا مبدا اور مرکز فرقہ ناجیہ السواد الاعظم اہل سنت و جماعت ہو، جیسے حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، چشتی، قادری، سہروردی، نقشبندی، ماتریدی، اشعری وغیرھم۔

اس اختلاف وافتراق کے دور میں نجات کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ حدیث مبارک علیکم بالسواد الاعظم کے مطابق مسلمانوں کے سب سے بڑے گروہ اہل سنت و جماعت کو لازم پکڑ لیا جائے اور اس کے علاوہ مرزائی، رافضی، نیچری، وہابی، غیر مقلد وغیرھم سب سے علیحدگی اختیار کی جائے۔ واللہ الموافق للھدایۃ وھو الموصل الی سبیل الرشاد [1]

---

[1] ماہنامہ "قائد" ملتان، شمارہ جنوری، فروری ۱۹۵۱ء

حدیث نمبر (۲۱)

توراتِ شریف میں صفاتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

عن عطاء بن یسار قال لقیت عبد الله بن عمرو بن العاص قلت اخبرني عن صفة رسول الله صلى الله عليه وسلم في التوراته قال اجل والله انه الموصوف في التوراته ببعض صفته في القراٰن يا ايها النبي انا ارسلناك شاهدا ومبشرا ونذيرا وحرزا للاميين انت عبدي ورسولي سميتك المتوكل ليس بفظ ولا غليظ ولا سخاب في الاسواق ولا يدفع بالسيئة ولكن يعفو ويغفر ولن يقبضه الله حتي يقيم به الملة العوجاء بان يقولوا لا اله الا الله ويفتح بها اعينا عميا واذانا صما وقلوبا غلفا۔ [1]

حضرت عطاء بن یسار سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ میں عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے ملا، میں نے اُن سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفت توراۃ میں نازل ہوئی وہ مجھے بتائیے، انہوں نے کہا ہاں! خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توراۃ میں بعض ان صفت کے ساتھ موصوف ہیں، جن کا بیان قرآن کریم (کی اس آیت) میں ہے۔

یَاۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا [2]

اے نبی ہم نے آپ کو آپ کی اُمت (۱) کے احوال کا شاہد بنا کر بھیجا اور خوش خبری دینے والا اور گنہگاروں کے عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔

(۱) اشعۃ اللمعات، جلد رابع، ص ۴۷۰ پر حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی ترجمہ کیا ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ، باب فضائل سید المرسلین [2] سورۃ الاحزاب، آیت ۴۵

صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب کراہیۃ السخب فی السوق، مطبوعہ بیت الافکار الریاض ۱۴۱۹ھ، حدیث ۲۱۲۵، ص ۴۰۰

(آیت قرآنیہ کے بعض اوصاف کا بیان یہاں تک ہوا، اب اس کے علاوہ دیگر اوصاف کا ذکر ہے)

اور اہل عرب کے لئے پناہ بنا کر بھیجا، اے محمد ﷺ آپ میرے ایسے خاص مقدس بندے ہیں کہ آپ کی اس خاص بندگی میں آپ کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں، اور آپ میرے رسول ہیں، میں نے آپ کا نام متوکل رکھا، اس لئے کہ آپ نے تمام کام اور اپنی قدرت وغیرہ (جو میں نے آپ کو عطا فرمائی ہے) سب کچھ میرے ہی سپرد کر دیا ہے، آپ ایسے متوکل ہیں کہ درشت خو نہیں نہ سخت کلام ہیں، نہ بازاروں میں شور مچانے والے ہیں، نہ برائی کا بدلہ برائی کے ساتھ دینے والے لیکن معاف فرماتے اور بخش دیتے ہیں، آپ ایسے متوکل ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ ہرگز دنیا سے نہ اُٹھائے گا تاوقتیکہ اُس کے وجود اقدس کے ساتھ کجرو اور گمراہ قوم کو سیدھا نہ کر دے، بایں طور کہ وہ لوگ لا الہ الا اللہ پڑھ لیں، اور اللہ تعالیٰ اُس کی ذات کریمہ کے ساتھ اندھی آنکھوں اور غافل دلوں کو کھولے گا۔ اس حدیث کو بخاری نے راویت کیا اور اسی طرح اس کو دارمی نے حضرت عطاء سے حضرت ابن سلام سے اسی کی مثل روایت کیا۔

اس مبارک حدیث سے مندرجہ ذیل امور ثابت ہوئے۔

۱۔ حضور سید عالم ﷺ کی پیش گوئی اور آپ کے صفات خصوصی کا بیان کتب سابقہ میں بھی ہے۔ اور سچے نبی کی یہی شان ہوتی ہے۔

۲۔ آقائے نامدار ﷺ اپنی اُمت کے احوال پر شاہد ہیں کسی فرد اُمت کا کوئی حال ایسا نہیں جس کا آپ مشاہدہ نہ فرما رہے ہوں جیسا کہ شاہدا کی تفسیر میں حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اشعۃ اللمعات، جلد رابع، مطبوعہ مطبع تیج کمار لکھنؤ طبع نہم ۱۹۶۳ء، ص ۱۷۴ پر فرماتے ہیں :

"اے گرامی پیغمبر بدرستی ما فرستادہ ایم ترا شاہد احوال اُمت"

۳۔ حضور سید عالم ﷺ اہل عرب کے لئے پناہ ہیں یعنی آپ کے دامن رحمت میں مصائب وآلام دارین سے پناہ ملتی ہے، اور اگر بلیات شیطانی وآفات نفسانی مراد لئے جائیں تو اہل عرب پر ہی کیا موقوف ہے، حضور ﷺ کا وجود اقدس عالم کے ہر فرد کے لئے پشت و پناہ ہے، اسی مقام پر حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ "اشعۃ اللمعات"، جلد ۴، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۳ء، ص ۲۷۴ پر فرماتے ہیں:

"واگر ضرر از غوائل شیطانی وآفات نفس مراد دارند وجود شریف وے ﷺ پشت و پناہ عالمیان ست"۔

۴۔ حضور سید عالم ﷺ اللہ تعالیٰ کے ایسے خاص بندے ہیں کہ آپ کی اس بندگی میں کوئی آپ کا شریک نہیں، جیسا کہ اسی حدیث میں انت عبدی کے تحت حضرت شاہ صاحب موصوف اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں:

"تو اے محمد بندۂ خاص منی کہ در حقیقت در بندگی خاص ہیچ کس با تو شریک نیست"۔[۱]

معلوم ہوا کہ سرور عالم ﷺ کی عبدیت آپ کا وہ کمال ہے، جس میں آپ کے ساتھ کسی دوسرے کو شرکت نصیب نہیں۔

۵۔ آقائے نامدار ﷺ متوکل ہیں اور متوکل حقیقتاً اسے کہتے ہیں جو اپنا سب کچھ اپنے رب کو سپرد کر دے، جیسا کہ اسی مقام پر اشعۃ اللمعات میں ہے:

"نام کردہ ام ترا متوکل کہ ہمہ کارہائے بہ من سپردۂ وقطعاً بر حول وقوت خود نہ ایستادہ"۔[۲]

سب کاموں میں جاننا بھی داخل ہے، جسے علم کہتے ہیں اگرچہ وہ دل کا کام ہے، مگر کام ضرور ہے، تو اگر کسی موقع پر رسول اللہ ﷺ کسی چیز کے علم کی اپنی ذات اقدس سے بظاہر نفی فرمادیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضور ﷺ کو اس چیز کا علم نہیں دیا گیا، بلکہ ایسے مواقع پر

۱۔ اشعۃ اللمعات"، جلد ۴، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۳ء، ص ۲۷۴

۲۔ اشعۃ اللمعات"، جلد ۴، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۳ء، ص ۲۷۴

آپ نے اس شئے کے علم کو اللہ تعالیٰ کے سپرد فرما کر اپنی متوکلانہ شان کا مظاہرہ فرمایا ہے، اور کبھی دوسری حکمتوں کے پیش نظر اپنے علم کا اظہار بھی فرمایا۔ کما لا یخفیٰ علی العاق اللبیب۔

۶۔ حضور ﷺ کی سیرۃ طیبہ ادنیٰ درجہ کی درشت خوئی اور سخت کلامی سے بھی پاک تھی گویا آپ سراپا رحمت اور مجسمہ اخلاق حسنہ تھے۔

۷۔ تاجدار مدنی ﷺ نے اپنے غلاموں کے دلوں میں توحید کو اتنا پختہ فرما دیا کہ اس کے انوار سے گمراہ ہدایت پر آگئے، ٹیڑھے سیدھے ہو گئے، اندھوں کی آنکھیں روشن ہوگئیں، بہروں کے کان کھل گئے، غافلوں کے دل خواب غفلت سے بیدار ہو گئے، یہ سب کچھ حضور ﷺ کی قوت قدسیہ کا کرشمہ اور انہی کا صدقہ ہے۔ [1]

اللھم صلي علي سيدنا ومولانا محمد وعليٰ آلہ صحبہ اجمعين

---

[1] ماہنامہ "قائد" ملتان، شمارہ نومبر، دسمبر ۱۹۵۰ء

حدیث نمبر (۲۲)

سوتے میں بیداری، مشاہدہ غیب

"عن زید ابن اسلم انه قال عرس رسول الله ﷺ لیلة بطریق مکة، ووکل بلالاً ان یوقظهم للصلوٰة. فرقد بلال ورقدوا حتی استیقظوا وقد طلعت علیهم الشمس فاستیقظ القوم قد فزعوا فامرهم رسول الله ﷺ ان یرکبوا حتی یخرجوا من ذلك الوادی وقال ان هذا واد به شیطان فرکبوا حتی خرجوا من ذلك الوادی ثم امرهم رسول الله ﷺ ان ینزلوا وان یتوضوا وامر بلالاً ان ینادی بالصلوٰة او یویم فصلی رسول الله بالناس ثم انصرف الیهم وقد رای من فزعهم فقال یا ایها الناس ان الله قبض ارواحنا ولو شاء لردها الینا فی حین غیر هذا فاذا رقد احدکم عن الصلوٰة او نسیها ثم فزع الیها، فلیصلها کما کان یصلیها فی وقتها، ثم التفت رسول الله ﷺ الی ابوبکر فقال ان الشیطان اتی بلالا وهو قائم یصلی فاضجعه فلم یزل یهدئه کما یهدأ الصبی حتی نام ثم دعا رسول اللهﷺ بلالا فاخبر بلال رسول الله ﷺ مثل الذی اخبر رسول الله ﷺ ابابکر فقال ابوبکر اشهد انك رسول الله" [1]

"حضرت زید بن اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ

[1] موطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ مطبوعہ دار الغرب الاسلامی بیروت ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء حدیث ۲۶، ص ۴۶

معظمہ کے راستہ میں ایک جگہ رات گزاری، اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مقرر فرمایا کہ وہ صبح کی نماز کے لئے لوگوں کو بیدار کر دیں، پس لوگ بھی سو گئے اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی سو گئے، یہاں تک کہ لوگ اس وقت بیدار ہوئے جب ان پر اچھی طرح سورج طلوع ہو گیا، جب بیدار ہوئے تو نماز فجر قضاء ہو جانے کی وجہ سے بہت گھبرائے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں سوار ہونے اور وہاں سے نکل جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اس وادی میں شیطان ہے، صحابہ کرام سوار ہو کر وہاں سے نکل گئے۔ اس کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں اُترنے اور وضو کرنے کا حکم دیا، اور حضرت بلال کو اذان یا تکبیر کہنے کے لئے ارشاد فرمایا، اس کے بعد حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کو نماز پڑھائی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی گھبراہٹ کو دیکھ کر فرمایا کہ اے لوگو! بے شک اللہ تعالیٰ نے ہماری جانوں کو روک رکھا ہے، اگر وہ چاہتا تو اس وقت کے علاوہ کسی دوسرے وقت میں ہماری جانوں کو ہماری طرف پھیر دیتا لہذا تم میں سے کوئی اپنی نماز سے سو جائے یا نماز پڑھنا بھول جائے پھر وہ نماز کے لئے گھبرا کر اُٹھے تو اسے چاہیئے کہ وہ اس وقت اپنی نماز کو اسی طرح پڑھ لے جس طرح اس کے اصل وقت میں پڑھتا، اس کے بعد حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ شیطان بلال کے پاس آیا، اس حال میں کہ وہ کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے اس کے بعد انہیں لٹا دیا، پھر انہیں تھپکتا رہا، جیسے کسی بچے کو تھپکا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ سو گئے، یہ فرما کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلایا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اپنا سارا واقعہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے جس طرح ان کے آنے سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا واقعہ سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیان فرما چکے تھے سنایا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ معجزہ باہرہ مشاہدہ کیا تو بے ساختہ کہہ اُٹھے اشہد انک رسول اللہ میرے آقا! میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ جل شانہ کے رسول ہیں''۔

اس حدیث مبارکہ سے مندرجہ ذیل مسائل معلوم ہوئے۔

۱۔ نماز قضا ہو جانا اگرچہ غیر اختیاری طور پر ہو، مسلمان کے لئے طبعاً اور فطرتاً دہشت اور گھبراہٹ کا موجب ہوتا ہے، نماز کی طرف سے لا پرواہی کرنے والوں کو اس حدیث سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

۲۔ جن مقامات پر شیطانی اثرات نمایاں ہوں، مسلمانوں کو ان سے بچنا چاہیے، اس میں ان لوگوں کے لئے عبرت ہے جو لہو و لعب کے گناہ و معصیت کے مقامات پر بے دھڑک جانے اور وہاں ٹھہرنے سے اجتناب نہیں کرتے۔

۳۔ سو جانے یا بھول جانے سے اگر نماز قضا ہو جائے تو یاد آنے اور بیدار ہونے کے بعد وہ نماز اسی طرح پڑھنی چاہیے جس طرح اس کے وقت میں پڑھی جاتی ہے۔

۴۔ اپنے رفقاء کو ان کی سخت گھبراہٹ اور خوف زدہ ہونے کی حالت میں بتقاضائے مصلحت تسلی دینا مکارم اخلاق میں داخل ہے۔

۵۔ حضور سید عالم ﷺ بحالت خواب بیدار رہتے ہیں، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی چشمان مبارک سوتی ہیں اور قلب اطہر جاگتا رہتا ہے۔

۶۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اس رات جو واقعہ گزرا وہ سب کچھ سرکار دو عالم ﷺ کو معلوم تھا۔

۷۔ شیطان کا یہ حال ہے کہ وہ بنی آدم کے ساتھ اپنی دشمنی پوری کرنے کے لئے ہر وقت لگا رہتا ہے، دن، رات، بیداری خواب، سفر، حضر، وادی و صحرا ہر جگہ ہر وقت انسان کے ساتھ رہتا ہے اور اسے اپنی نظر میں رکھتا ہے۔

۸۔ حضور ﷺ کے غلاموں کو ورغلانے اور انہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت وعبادت سے روکنے کے لئے شیطان جو کچھ کرتا ہے اس کا کوئی داؤ پیچ اور کسی قسم کا کوئی کارنامہ ایسا نہیں جو نگاہ رسالت سے مخفی ہو۔

۹۔ حضور سید عالم ﷺ سوتے، جاگتے کسی وقت اپنے غلاموں کے حال سے بے خبر نہیں۔

۱۰۔ باوجود علم کے کسی بات کا ظاہر نہ کرنا حکمت اور مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔

۱۱۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس شیطان کا آنا اور انہیں بچے کی طرح تھپکنا اور بالآخر سلا دینا امور غیبیہ سے متعلق ہے، حضور ﷺ نے اس کا مشاہدہ کیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اپنے مشاہدے کو بیان فرمایا، صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس بیان مبارک کو سن کر حضور سید عالم ﷺ کے رسول اللہ ہونے کی گواہی دی، اس موقع پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس گواہی سے ثابت ہوا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا مشاہدۂ غیوب شرک نہیں بلکہ ان کی غیب دانی نبوت و رسالت کی چمکتی ہوئی دلیل ہے۔[1]

---

[1] ماہنامہ "السعید" ملتان، شمارہ فروری ۱۹۶۳ء

حدیث نمبر (۲۳)

شان مومن

''وعن ابي هريرة قال قال رسول الله ﷺ المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده والمومن من آمنه الناس علي دمائهم واموالهم رواه الترمذي والنسائي وزاد البيهقي في شعب الايمان بروایة فضالة والمجاهد من جاهد نفسه في طاعة الله والمهاجر من هجر الخطايا والذنوب''۔[1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان وہ ہے کہ سالم رہیں مسلمان اس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے، اور مومن وہ ہے جسے امین بنائیں لوگ اپنی جانوں اور اپنے مالوں پر، اس حدیث کو ترمذی، نسائی نے روایت کیا، اور زیادہ کیا بیہقی نے شعب الایمان میں بروایت حضرت فضالہ، اور مجاہد وہ ہے جس نے جہاد کیا اپنے نفس سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں، اور مہاجر وہ ہے جس نے چھوڑ دیا خطاؤں اور گناہوں کو۔

تشریح: حضور سید عالم ﷺ نے اس حدیث مبارک میں اسلام اور ایمان کی تعریف بیان نہیں فرمائی بلکہ اسلام اور ایمان کی خوبیوں اور کمال کو ذکر فرمایا ہے۔

اسی طرح مجاہد سے مجاہد بالسیف بمعنی معروف مراد نہیں، بلکہ یہاں وہ مجاہد حقیقی مراد ہے جو نفس کے ساتھ جہاد کرنے والا ہو۔

مسلمان کی زبان اور ہاتھ سے کسی مسلمان کو ناحق تکلیف پہنچنا اسلام کی شان سے بعید

---

[1] ترمذی شریف، باب ماجاء فی ان المسلم، حدیث ۲۶۲۷

ہے، اسلام سلامتی کا علمبردار ہے اور مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ ہر حال میں سلامتی کا حامل ہو، مضمونِ حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ زبان سے جتنی تکلیفیں پہنچائی جاسکتی ہیں، مثلاً کسی پر جھوٹی تہمت رکھنا، غیبت کرنا، گالی دینا، سختی اور درشتی کے کلمات ناحق کسی مسلمان کے حق میں ادا کرنا، کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں، اسی طرح جو تکلیفیں ہاتھ سے پہنچائی جاسکتی ہیں، مثلاً ناحق مارنا، ایذارسانی کے لئے ہاتھ سے اشارہ کرنا، ناحق ستانے کے لئے کسی کے حق میں کچھ لکھنا، سب اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، اور ایک مسلمان کے لئے ہرگز لائق نہیں کہ وہ کسی مسلمان کے ساتھ اس قسم کی ایذارسانی کا وطیرہ اختیار کرے۔

علیٰ ہذا القیاس مومن کی شان یہ ہے کہ لوگوں کو اس کے کمالِ ایمان اور تقویٰ کی بنا پر اس پر اتنا اعتماد ہو کہ لوگ اپنی جانوں اور مالوں کی امانتیں بلا تامل اس کو سپرد کردیں اور ان کے دل میں اس کے خائن ہونے کا گمان پیدا نہ ہو۔

یہ بات اسی وقت ہوسکتی ہے جب کسی شخص کا کردار اتنا بلند ہو کہ لوگوں کے ذہن میں اس کی طرف سے کسی قسم کی بداخلاقی اور خیانت کا شائبہ تک نہ ہونے پائے۔

مسلم اور مومن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کا یہ ارشاد گرامی اس قدر قیمتی، اہم اور جامع ہے کہ اسلامی معاشرہ کے ہر پہلو کی مکمل اصلاح اس میں موجود ہے، گھریلو زندگی، بیرونی تعلقات، آپس کے معاملات سب کو حاوی ہے، اور مسلمان کی زندگی کے ہر گوشے کے لئے اس میں نکوکاری اور پاکیزگی کی تعلیم پوری جامعیت کے ساتھ موجود ہے، خصوصاً مومن کے بارے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد تو بہت ہی اہم ہے، جس کی روشنی میں ہر شخص اپنے ایمان و اسلام کا صحیح جائزہ لے سکتا ہے، اور وہ اس طرح کہ جس شخص کی امانت و دیانت پر لوگوں کو جتنا قوی اعتماد ہو، اسی قدر اس کا ایمان و اسلام قوی ہوگا، جو شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ میں کس درجہ کا مومن ہوں وہ اپنے بارے میں لوگوں کے اعتماد کو دیکھے، اگر اس کو یہ معلوم ہوجائے کہ لوگ اپنی جانوں اور مالوں کی امانت بے دریغ مجھے سپرد کرنے

کرنے کے لئے آمادہ ہیں تو سمجھ لے کہ میرا ایمان فی الواقع قوی اور مضبوط ہے، اور اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ کوئی شخص اپنی جانوں اور مالوں کی امانت میرے حوالے کرنے کے لئے تیار نہیں تو وہ سمجھ لے کہ میرا ایمان کمزور ہے، اور میں جب تک اپنی اس کمزوری کا ازالہ نہ کرلوں اُس وقت تک مومن کامل نہیں ہوسکتا۔

بالکل اسی طرح مجاہد کی نشانی یہ ہونی چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرے، مقصد یہ ہے کہ نفس امارہ انسان کو برائی کی طرف لاتا ہے، اور گناہ ومعصیت کی رغبت دلاتا ہے، ایسی صورت میں حقیقی جہاد یہ ہے کہ انسان نفس امارہ کے ساتھ جنگ کرے اور اسے مغلوب کرکے اللہ تعالیٰ کی طاعت اور تقویٰ کی راہ اختیار کرے۔

یہ مرتبہ مراتب کمال میں بلندترین مقام رکھتا ہے اگر مسلمان اس ارشاد نبوی پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں تو انسانیت کے تمام مراحل اسی ایک نکتہ میں طے ہوسکتے ہیں۔

مہاجر کے بارے میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث پاک میں ارشاد فرمایا، وہ ظاہر کرتا ہے کہ یہاں لفظ مہاجر سے بمعنی معروف مہاجر مراد نہیں بلکہ وہ حقیقی مہاجر مراد ہے، جو صغیرہ کبیرہ گناہوں کو چھوڑ کر شیطان سے نجات حاصل کرلے، اور بارگاہ ربوبیت میں قرب کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہو۔

مسلم ومومن، مجاہد ومہاجر کی جو تعریف ان جامع اور مختصر الفاظ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہے وہ بنی نوع انسان کی فلاح ونجات اور تمام دینی ودنیوی فوز وفلاح کا ایسا جامع بیان ہے کہ مسلمان عملی طور پر اختیار کرلیں تو ان کی تمام مشکلات حل ہوسکتی ہیں اور دین ودنیا کی ہر حاجت پوری ہوسکتی ہے، کسی مرحلہ پر وہ ناکام ونامراد نہیں ہوسکتے، بلکہ ان کا ہر سانس شادکامی اور فائز المرامی پر منتج ہوسکتا ہے۔[1]

---

[1] ماہنامہ "السعید" ملتان، شمارہ جنوری ۱۹۶۳ء

حدیث نمبر (۲۴)

علم مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

"عن ابي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم بينا انا نائم اذا زمرةٌ حتىٰ اذا عرفتهم خرج رجل بيني وبينهم فقال هلم فقلت الىٰ اين قال الى النار والله قلت ماشانهم قال إنهم إرتدوا بعدك على ادبارهم القهقرى ثم اذا زمرةٌ حتي اذا عرفتهم خرج رجلٌ من بيني وبينهم قال هلم قلت الىٰ اَيْن قال الى النار والله قلت ماشانهم قال انهم ارتدوا على ادبارهم فلا أُراهم الا مثل همل النعم۔ رواه البخاري في صحيحه" ۔[1]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، اس حال میں کہ میں سو رہا تھا، ایک گروہ سامنے آیا، یہاں تک کہ میں نے انہیں پہچانا، میرے اور ان کے درمیان میں سے ایک شخص نکلا، اس نے کہا آؤ، میں نے کہا کس طرف؟ اس نے کہا بخدا دوزخ کی طرف! میں نے کہا ان کا کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ لوگ آپ کے بعد اُلٹے پاؤں اپنی پشتوں کی طرف لوٹ گئے تھے۔ یعنی اسلام سے مرتد ہو گئے تھے، پھر اچانک دوسرا گروہ ظاہر ہوا، یہاں تک کہ میں نے انہیں پہچانا، میرے اور ان کے درمیان میں سے ایک شخص نکلا، اس نے کہا آؤ، میں نے کہا کدھر؟ اس نے کہا بخدا دوزخ کی طرف، میں کہا کیا حال ان کا، اس نے کہا، یہ لوگ آپ کے بعد اُلٹے پاؤں اپنی پشتوں کی طرف لوٹ گئے تھے، یعنی اسلام سے مرتد ہو گئے تھے، تو میں گمان نہیں کرتا کہ ان میں سے کوئی نجات پائے، لیکن (بہت تھوڑے، جنہوں نے توبہ کر لی تھی پھر بھی گناہوں کے مرتکب ہوئے) چھوٹے ہوئے اونٹوں کی

---

[1] صحیح بخاری، باب فی الحوض، حدیث ۶۵۸۷ ص ۲۰۶، کتاب الرقاق

مثل یعنی جو رکھوالے اور نگہبان کے بغیر ہوں، اس حدیث کو امام بخاری نے اپنی صحیح بخاری میں روایت کیا"۔

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کئی ہزار نو مسلم مرتد ہو گئے تھے، جن پر سیدنا ابو بکر صدیق نے بمعیت فاروق اعظم، عثمان غنی، علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم اجمعین سخت جہاد فرمایا اور ان کا قلع قمع کر دیا، ان میں سے بعض نے پھر توبہ کر لی، مگر اس کے باوجود بھی ان کا اسلام کمزور رہا، اور وہ دین میں پختہ کار نہ ہوئے، ان ہی لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے رؤیا کے عالم میں یا کشف کی حالت میں اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اسی دنیا میں پہچان لیا۔

یہی وہ لوگ ہیں جو حوض کوثر پر وارد ہوں گے اور عدم التفات کی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اصیحابی فرمائیں گے، اس کے بعد فرشتے جب عرض کریں گے کہ سرکار کیا آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا؟ یہ تو مرتد ہو گئے تھے تو پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سحقاً سحقاً فرمائیں گے۔

بخاری کی اس حدیث میں "بینا انا نائم" میں ایک نسخہ "بینا انا قائم" بھی ہے، ہر تقدیر پر اس دنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انہیں دیکھنا اور پہچاننا ثابت ہوتا ہے اور یہ حدیث اس امر کی روشن دلیل ہے کہ تاجدار مدنی صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا ہی میں بحالت خواب یا کشف انہیں ملاحظہ فرما کر پہچان لیا تھا اور ان کا مرتد ہونا بھی اسی دنیا میں سرکار کو معلوم ہو چکا تھا، لہٰذا قیامت کے دن کے واقعہ کو لاعلمی پر محمول کرنا قطعاً باطل ہے، بلکہ اسے عدم التفات پر محمول کرنا واجب ہے، اسی طرح ان کا مصداق معاذ اللہ خلفاء راشدین کو قرار دینا بھی باطل محض ہے، کیونکہ وہ مرتدین کی جماعت ہوگی اور یہ مقدسین تو ان مرتدوں پر جہاد فرمانے والے ہیں، جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان مرتدین کے ساتھ قتال فرمایا، اور دوسرے حضرات اس قتال میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دوش بدوش رہے، لہٰذا ان خلفاء کرام وصحابہ عظام کا مقدس دامن اس ناپاک دھبہ سے قطعاً پاک ہے۔[1]

---

[1] ماہنامہ "السعید" ملتان، شمارہ نومبر، دسمبر ۱۹۶۲ء

حدیث نمبر (۲۵)

حدیث تابیر نخل: کھجوروں کی پیوند کاری

"عن رافع بن خدیج قال النبي ﷺ المدینة وهم یا برون النخل یقول یلحقون النخل فقال ما تصنعون قالوا کنا نصنعه قال لعلکم لولم تفعلوا کان خیرا قال فترکوه فنقضت او قال فنقصت قال فذکروا ذلك له فقال انما انا بشراً اذا امرتکم بشئ من دینکم فخذوا به واذا امرتکم بشئ من رأي فانما انا بشر......" الخ

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں آخری الفاظ یہ ہیں :

"قال انتم اعلم بامر دنیاکم" [۱]

خلاصہ حدیث یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے، اس وقت انصار کھجوروں کے باغات لگاتے تھے اور یہی ان کا ذریعہ معاش تھا. اور اس کام میں ان کو بڑی مہارت تھی، کھجوروں کی پیوندکاری ہوتی تھی اور اس کے لئے تلقیح اور تابیر کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔

حضور پُرنور ﷺ نے صحابہ کرام کو دیکھا کہ وہ تابیر نخل کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پھل کثرت سے آتا تھا اور بہت عمدہ قسم کا ہوتا تھا. ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "لولم تفعلوا کان خیرا" یہ جو تابیر و تلقیح اور پیوندکاری کا عمل تم اچھے پھل حاصل کرنے کے لئے کرتے ہو اور تمہارا اس بات پر اعتقاد ہوتا ہے کہ اگر ہم پیوندکاری کریں گے تو پھل زیادہ اور اچھا آئے گا، اور نہیں کریں گے تو پھل زیادہ اور اچھا نہیں آئے گا تو اس طرح پھل کے زیادہ اور اچھے ہونے میں تمہاری نظر پیوندکاری پر ہے اور یہ تمہارے

---

[۱] مسلم شریف، کتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ما، حدیث ۲۳۶۲

ص ۱۲۸۶

مطبوعہ دارالمغنی الریاض ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸ء

شایان شان نہیں ،تمہاری نظر تو اللہ تعالیٰ جل مجدہ کی عطا پر ہونی چاہئے ، پیوندکاری پر بھروسہ کرنا اورلوگوں کی شان ہوتو ہو میرے پیارو! یہ تمہاری شان کے لائق نہیں ۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد گرامی "لو لم تفعلوا کان خیرا " یعنی اگر تم اس کو ترک کردو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا ،اب بہتری کی کئی صورتیں ہیں ،ایک صورت تو یہ ہے کہ اگر تم پیوندکاری چھوڑ دو گے تو خواہ پھل تھوڑا ہی آئے تو اس قلیل پھل میں اللہ تعالیٰ اتنی برکت ڈال دے گا کہ وہ تمہارے لئے خیر کا باعث ہو جائے گا ۔اور بہتری کا ایک واضح مفہوم یہ بھی ہے کہ اگر تم پیوندکاری کا عمل چھوڑ دو اور فقط اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرلو کہ پروردگار جتنی کھجوروں کا پھل ہمیں دے گا ہم اس پر راضی ہیں ،اور جیسے پھل عطا کرے گا ہم اس پر خوش ہیں ،اور اگر تم اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو اور راضی برضا ہو جاؤ تو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا ،اگرچہ پہلے سال یا دوسرے سال پھلوں میں کمی ہو جائے ،کیونکہ درخت تلقیح کے عادی ہیں اور اس عادت کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ پہلے ایک دو سال میں پھل کم آئیں ،لیکن اگر تم اس طرح پر قائم رہو تو ایک دو سال کے بعد اللہ تعالیٰ ایسی صورت پیدا فرمائے گا کہ تمہاری پیوندکاری کے بغیر اس سے زیادہ پھل آئیں گے اور اس سے بہتر پھل آئیں گے ۔

اب ہوا کیا چونکہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سب ایک معیار کے نہ تھے ، اُن کے درجات مختلف تھے ،اگر ان کے معیار مختلف نہ ہوتے تو خلفاء راشدین کی فضیلت کا قول ہم کیسے کرتے ،کیونکہ خلفائے راشدین میں خلیفہ اول حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ،خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ،خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور خلیفہ رابع حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں ،تو اس ترتیب کو ہم کیسے تسلیم کرتے ،بہرحال صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مراتب میں تفاوت ہے ،تو اونچے درجہ کے صحابہ تھے وہ تو کچھ نہ بولے ،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق اسی سال انصار نے پیوندکاری کا عمل تو نہ کیا مگر وہ اپنے خیال میں کچھ اور ہی سمجھ بیٹھے تھے ،ان کا خیال تھا کہ

پیوندکاری کا عمل ترک کرنے سے ہمیں اسی سال اتنے پھل ملیں گے کہ پہلے کبھی ہوئے ہی نہیں، وہ تو اپنی جگہ یہ تصور لئے بیٹھے تھے لیکن ان کا یہ منشا پورا نہ ہوا، کیونکہ پہلا سال تھا اس لئے پھل تھوڑے آئے اور وہ اتنے زیادہ اچھے بھی نہ تھے، تو بعض صحابہ کرام جن کی عقل فرمان نبوی ﷺ کی تہہ کو ابھی نہیں پہنچی تھی، مومن تو تھے مگر انہوں نے بے صبری کا مظاہرہ کیا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں شکایت لے کر حاضر ہوئے کہ یارسول اللہ! ہم نے تو پیوندکاری چھوڑ دی تھی مگر پھل تو بالکل آئے ہی نہیں، آئے تو بہت کم اور بالکل ناقص، جب انہوں نے شکایت کی تو اب دو ہی راستے تھے، ایک راستہ تو یہ تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کو زجروتوبیخ فرماتے کہ خبردار تم نے شکایت کیوں کی؟ بہرحال اسی پر قائم رہو اور بالکل تلقیح نہ کرو، میں تمہارے لئے پیوندکاری کی بالکل اجازت نہیں دیتا، اگر حضور ﷺ یہ راستہ اختیار فرماتے تو قیامت تک پیوندکاری کا عمل حرام ہو جاتا اور رحمۃ اللعالمین یہ نہیں چاہتے تھے۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ پیوندکاری کا عمل بے شک جاری رہے مگر پیوندکاری کے عمل پر تمہارا توکل نہ ہو، توکل تمہارا ذات باری پر رہے۔

چونکہ ابھی ان کے اذہان اس قابل نہ تھے اس لئے حضور تاجدار مدنی ﷺ نے ان پر سختی تو نہ فرمائی ہاں اتنا فرمادیا کہ:

"انتم اعلم بامر دنیاکم" اپنے دنیا کے کاموں کو تم خود ہی زیادہ جانو۔

منکرین علم رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ کو پڑھ کر آسمان سر پر اٹھالیا کہ لو بھئی دنیا کے کاموں کا تو رسول اللہ ﷺ کو علم ہی نہیں۔

حالانکہ حدیث کا یہ مطلب بالکل نہیں۔ "اَعْلَمُ" یہاں تفضیل کے معنوں میں نہیں بلکہ صفت کے صیغے کے معنی میں ہے، فرمانا یہ ہے کہ تم اپنے دنیا کے کاموں کو خود ہی جانو، کیونکہ یہاں نہ "لام" ہے نہ "من"، یہ تو صفت کا صیغہ ہے اور صفت کے معنی میں ہے، کہ تم اپنے دنیا کے کاموں کو خود ہی جانو، تو اس بات میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نہایت نفیس

قسم کی ہلکی سی ناراضگی ظاہر فرمائی کہ تم نے ہماری بات کو سمجھا نہیں، ہمارا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم تم سے یہ تلقیح کا عمل چھڑوائیں، ہمارا مقصد یہ تھا کہ تمہارا توکل تلقیح کے عمل پر نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ پر ہو، صرف اللہ پر۔

اگر تم اس عمل کو دو چار سال چھوڑ دیتے تو پھر اس کی تمہیں حاجت ہی نہ ہوتی، مگر تم نے بڑی جلدی اور عجلت سے کام لیا فوراً ہی شکایت لے کر آگئے، تو فوری شکایت پر حضور ﷺ نے کچھ ہلکی سی ناراضگی کا اظہار فرمایا، اور انتم اعلم کے الفاظ ارشاد فرمائے۔

انتم اعلم کے الفاظ سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ حضور ﷺ نے اپنے علم کی نفی کی اور صحابہ کرام سے کہا کہ تم دنیا کے کام مجھ سے بہتر جانتے ہو۔

یہ بالکل غلط بات ہے، وہ دنیا کے کام بھی ہم سے بہتر جانتے ہیں اور دین کے کام بھی، بلکہ ہماری دنیا کو دین بنانے والے بھی وہی ہیں، اور انتم اعلم یہ ایک ایسا جملہ ہے کہ جس کو علم کی کمی یا بیشی کے معنی میں کسی نے استعمال نہیں کیا، بلکہ لوگوں نے اس جملے کے بولنے والے کی ناراضگی کے معنی میں اس کو استعمال کیا ہے۔

چنانچہ فقہاء نے اس بات سے ایک مسئلہ نکالا اور اس جملے کو ناراضگی کے ظاہر کرنے کی دلیل قرار دیا، چنانچہ "فتح القدیر" جو کہ "ہدایہ" کی مشہور شرح ہے اور فقہ حنفی کی بڑی معتبر و مستند کتاب ہے، صاحب فتح القدیر نے اس انتم اعلم کے لفظ کو ایک فقہی مسئلے میں استعمال کیا ہے، اور وہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ جب کسی بالغ عورت خواہ وہ کنواری ہو یا مطلقہ ہو یا بیوہ، کا نکاح کرنا ہو تو اس سے اجازت لینا ضروری ہے، خواہ وہ زبان سے کہے یا خاموش رہے، دونوں صورتوں میں اجازت ہوگی، مگر اتنا فرق ہے کہ بالغ کنواری کا خاموش رہنا ہی کافی ہوگا جب کہ مطلقہ اور بیوہ کا زبان سے اقرار کرنا ضروری ہوگا، تو فقہاء نے یہ مسئلہ نکالا کہ اگر کسی عورت سے نکاح کے لئے اجازت طلب کی اور کہا کہ ہم فلاں آدمی سے تمہارا نکاح کرنا چاہتے ہیں تم راضی ہو اور اس نے اتنا کہہ دیا "انت اعلم" (تو جان) تو اس کا یہ کہنا اس کی طرف سے ناراضگی

کا اظہار ہوگا، پھر کوئی نکاح نہیں کرسکتا اگر کرے گا تو نکاح نہیں ہوگا، کیونکہ اس جملے کو فقہاء نے اس کی ناراضگی کی دلیل قرار دیا۔[١]

(یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال ہو کہ حدیث میں الفاظ "انتم اعلم" ہیں اور فقہ کی کتاب میں الفاظ "انت اعلم" ہیں، تو بات یہ ہے کہ "انتم اعلم" جمع کا صیغہ ہے اور "انت اعلم" واحد کا صیغہ ہے، بس اتنا فرق ہے اور کوئی فرق نہیں، ایک ہی بات ہے۔)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ "انتم اعلم" یہ اپنے علم کی نفی کے لئے نہیں فرمایا تھا بلکہ اپنی ناراضگی کے لئے فرمایا تھا، اور ناراضگی صرف اتنی ہی تھی کہ ہم نے تم کو توکل کی تعلیم دی تھی اور تم سمجھے ہی نہیں، اس کلمہ کے ناراضگی کے معنی کیوں ہوئے، اس لئے ہوئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی ناراضگی کے اظہار کے لئے یہ کلمات فرمائے علم کی نفی کے لئے نہیں، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی اُمت پر رؤف اور رحیم ہیں لہذا سختی اس لئے نہیں فرمائی کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سختی فرماتے تو یہ عمل تلقیح خواہ وہ پیوندکاری آموں کی ہو یا لیموں کی یا دیگر پھلوں کی ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتی، اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی اُمت پر شفیق و مہربان ہیں اس لئے نہیں چاہتے تھے کہ ہم اس کو حرام قرار دیں بلکہ یہ چاہتے تھے کہ اگر کوئی پیوندکاری کرتا ہے تو وہ اس بات پر بھروسہ نہ رکھے کہ اگر پیوندکاری کروں گا تو یہ فائدہ ہوگا، پیوندکاری کرو مگر توکل اس بات پر رکھو کہ اللہ تعالیٰ دے گا ورنہ کچھ نہیں ملے گا، توکل کو کسی بھی صورت ہاتھ سے نہ جانے دو، اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس جملہ (انتم اعلم) کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم کی نفی کے لئے استعمال کرنا سراسر جہالت اور نادانی ہے۔[٢]

---

[١] فتح القدیر، جلد ٣، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ص ٢٦٠

[٢] درس قرآن، رمضان المبارک ١٩٨٣ء، بمقام شاداب کالونی ملتان، قلمی ذخیرہ ڈاکٹر محمد حنیف سعیدی ایم بی بی ایس، لاہور

حدیث نمبر (۲۶)

مسئلہ باغ فدک

"عن عائشه أن فاطمة عليها السلام ارسلت الى ابي بكر تسأله ميراثها من النبي ﷺ مما افاء الله على رسوله ﷺ تطلب صدقة النبي ﷺ التي بالمدينة وفدك، وما بقي من خمس خيبر" ۔[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آدمی بھیجا اور حضور ﷺ کی میراث کا مطالبہ کیا۔

"فقال ابو بكر إنّ رسول الله ﷺ قال لا نورث ما تركنا فهو صدقة انما ياكل آل محمد من هذا المال ...... واني والله لا اغير شيئاً من صدقات النبي ﷺ التي كانت عليها في عهد النبي ﷺ، ولا عملن فيها بما عمل فيها رسول الله ﷺ فتشهد علي ثم قال: انا قد عرفنا يا ابا بكر فضيلتك، وذكر قرابتهم من رسول الله ﷺ وحقهم، فتكلم ابو بكر قال، والذي نفسي بيده لقرابته رسول الله ﷺ احب الي ان اصل من قرابتي" ۔[2]

حضرت سیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے جواب میں حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہماری مالی وراثت نہیں ہوتی، جو مال ہم چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے اور آل محمد ﷺ اس مال سے کھا سکتی ہے۔ (ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا) بخدا میں حضور ﷺ کے صدقات میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گا جس طرح وہ عہد نبوت میں تھے، ویسے ہی رہیں گے اور میں ان میں ایسا ہی کروں گا جس طرح ان میں رسول

---

[1] صحیح بخاری : باب مناقب قرابۃ رسول، حدیث ۳۷۱۱ جلد نمبر ۲، جزء الثالث، مکتبۃ السلفیۃ، قاہرہ ۱۴۰۰ھ

[2] صحیح بخاری : باب مناقب قرابۃ رسول، حدیث ۳۷۱۲

اللہ ﷺ کیا کرتے تھے، سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان اسباب کی تصدیق کی اور فرمایا اے ابوبکر! ہم آپ کی فضیلت و بزرگی کو جانتے ہیں، پھر آپ نے اس رشتہ داری کا ذکر کیا جو انہیں حضور ﷺ کے ساتھ تھی، اور ان کے حق کا ذکر کیا، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سن کر فرمایا کہ اس ذات پاک کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی سے کہیں یہ زیادہ محبوب ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کروں۔

بعض لوگوں نے حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر طعن کیا ہے کہ انہوں نے اہل بیت کی حق تلفی کی ہے، اور باغ فدک حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو نہیں دیا حالانکہ انہوں نے اس کا مطالبہ کیا تھا اور جو اہل بیت کو ان کا حق نہ دے بتائیے وہ کون ہے؟

میں ایسے حضرات سے پوچھتا ہوں کہ تم نے سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ذات مقدسہ کے بارے میں یہ تصور کیسے کرلیا کہ وہ حدیث رسول ﷺ سن کر حدیث سنانے والے پر ناراض ہوجائیں؟ کیونکہ حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تو یہ حدیث بیان فرمائی "إنَّ رسول اللہ ﷺ قال لا نورث ما ترکنا فھو صدقۃ... الخ"۔ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا! ہماری مالی وراثت نہیں ہوتی جو مال ہم چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ تو پھر حدیث سن کر کیا حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حدیث کا انکار فرمایا اور یہ کہا کہ یہ میرے والد ماجد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ارشاد گرامی نہیں ہے؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود مولائے کائنات حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے اقرار کیا کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ہماری مالی وراثت نہیں ہوتی جو مال ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے"۔

تو بتائیے یہ کہنا کس قدر غلط ہے کہ سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت ابوبکر

صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محض اس وجہ سے ناراض ہوگئیں اور وصال تک انہوں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کلام ہی نہیں کیا، کیونکہ انہوں نے باغ فدک نہ دے کر اور یہ حدیث سنا کر حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ کی حق تلفی کی تھی۔ نعوذ باللہ

میں کہتا ہوں کہ حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہ الفاظ تو قیامت تک آفتاب سے زیادہ چمکتے رہیں گے "قرابتہ رسول اللہ ﷺ احب الیَّ ان اصل من قرابتی" اللہ کے رسول کی قرابت میرے نزدیک میری قرابت سے بہت زیادہ عزیز ہے۔

اے صدیق اکبر! آپ پر کروڑوں رحمتیں ہوں، آپ نے تو ارشاد فرمایا کہ میری قرابتیں قربان ہو جائیں اللہ کے رسول کی قرابت پر، لیکن یہ کہتے ہیں کہ سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ناراض ہوگئیں، معاذ اللہ ثم معاذ اللہ، میں کہتا ہوں کہ حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تو آپس میں کوئی ناراضگی باقی نہ رہی لیکن آج لوگ ان پر ناراض ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ پتا چلا کہ حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کچھ کبیدہ خاطر ہیں، اس لیے نہیں کہ میں نے ان کو حدیث رسول سنائی ہے بلکہ اس لئے کہ میرا اجتہاد ان کے اجتہاد سے بہتر ہے، تو آپ نے مولائے کائنات حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ساتھ لیا اور سیدہ رضی اللہ عنہا کے دروازے پر کھڑے ہوگئے، آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قاصد بنا کر یہ پیغام دے کر بھیجا کہ آپ عرض کر دیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کی پاک وطیبہ وطاہرہ بیٹی کے مقدس دروازے پر ان کا بوڑھا غلام حاضر ہے اور جب تک رسول اللہ ﷺ کی پیاری بیٹی راضی نہیں ہوں گی ابو بکر دروازے سے واپس نہیں جائے گا، حدیث پاک میں آتا ہے:

"فترضاها حتى رضيت وهو" یعنی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو

راضی کیا یہاں تک کہ وہ راضی ہو گئیں۔[1]

یہ تو سب راضی ہو گئے لیکن بعض لوگ آج تک ان پر ناراض ہیں اور سچ پوچھئے تو وہ ناراض تھیں بھی نہیں، وہ تو صرف اجتہاد کے اختلاف کی بنا پر بمقتضائے بشریت کچھ کبیدہ خاطر تھیں، کیونکہ سیدہ فاطمۃ الزاہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا اجتہاد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اجتہاد سے کچھ مختلف تھا اور اس قسم کے اجتہادی اختلاف کی بنا پر انبیاء کرام میں بھی اس قسم کی کبیدہ خاطری وقتی طور پر پیدا ہو جاتی تھی، اور اگر یہ وہاں کسی سزا کا مستوجب نہیں تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے معاملے میں کیونکر سزا اور طعن کا باعث ہو سکتی ہے۔

مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام جب قوم کو حضرت ہارون علیہ السلام کے حوالے کر کے کوہ طور پر تشریف لے گئے اور جب واپس آئے تو دیکھا کہ قوم بچھڑے کی پوجا میں مبتلا تھی، انہوں نے یہ حال دیکھا تو جلال میں آ گئے، ابھی ہارون علیہ السلام کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی داڑھی پکڑی اور ان کے سر کے بال نوچ لئے، حضرت ہارون علیہ السلام نے عرض کیا! حضور میری داڑھی نہ پکڑیئے، میرے سر کے بال نہ نوچئے، تب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جلال رفع ہوا۔ (سورہ طٰہٰ، پ ۱۶)

اب بتائیے کہ حضرت ہارون علیہ السلام، اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں یا نہیں؟ تو اس وقتی ناراضگی کی بنا پر کس پر فتویٰ لگائیں گے، حضرت ہارون علیہ السلام پر یا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر؟ بات اتنی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے محض اجتہادی طور پر یہ سمجھا کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی غلطی ہے، حالانکہ حضرت ہارون علیہ السلام کی واقعی کوئی غلطی نہ تھی، چنانچہ جب معاملہ صاف ہوا تو دونوں میں کوئی ناراضگی نہ رہی۔[2]

---

[1] حاشیہ صحیح بخاری، مطبوعہ قدیمی کتب خانہ، کراچی، ج ا، ص ۴۳۵۔ فتح الباری شرح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب فرض الخمس، حدیث ۳۰۹۴

[2] خانیوال شہر میں کی گئی تقریر کا خلاصہ

حدیث نمبر (۲۷)

حدیث قرطاس

''عن عبید الله بن عبدالله عن ابن عباس قال: لما اشتد بالنبي ﷺ وجعه قال: ائتوني بكتاب اكتب لكم كتاباً لا تضلوا بعده، قال عمر: ان النبي ﷺ غلبه الوجع، وعندنا كتاب الله حسبنا. فاختلفوا، وكثر اللغط، قال: قوموا عني، لا ينبغي تنازع، فخرج ابن عباس يقول: ان الرزية كل الرزية ما حال بين رسول الله وبين كتابه'' [1]

عبید اللہ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا جب نبی کریم ﷺ کی علالت بڑھ گئی تو فرمایا! میرے پاس لکھنے کی چیز لاؤ تاکہ میں تحریر لکھ دوں جو تم میرے بعد گمراہ نہ ہوسکو، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا نبی کریم ﷺ پر مرض کا غلبہ ہے اور اللہ کی کتاب ہمارے پاس موجود ہے جو کافی ہے، اس پر اختلاف کیا گیا اور بڑا شور و غل ہوا، فرمایا کہ میرے پاس سے اٹھ جاؤ اور میرے پاس جھگڑا مناسب نہیں ہے، حضرت ابن عباس یہ کہتے ہوئے باہر نکلے، ہائے مصیبت، ایسی مصیبت جو رسول اللہ ﷺ اور آپ کی تحریر کے درمیان حائل ہوگئی۔

حضرت غزالئی زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ایک تقریر کے دوران ایک معترض نے سوال کیا کہ آپ نے نماز ظہر کے بعد کی نشست میں خطاب کرتے ہوئے "وما ینطق عن الھوی" آیہ کریمہ پڑھی تھی اور اس کی روشنی میں یہ کہا تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہر قول وحی الٰہی ہے، اگر یہ بات اسی طرح درست ہے تو حضور علیہ الصلوٰۃ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب العلم، حدیث ۱۱۴

والسلام کے ہر امر کی تعمیل لازم قرار پائے گی، جب کہ حدیث قرطاس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اس موقع پر حضور ﷺ کے فرمان کی تعمیل نہیں کی گئی بلکہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا حسبنا کتاب اللہ، آپ مہربانی فرما کر اس آیت کریمہ کی روشنی میں اس حدیث کی وضاحت فرمائیں۔

حضرت علامہ کاظمی علیہ الرحمہ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا کہ حضور ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ مجھے کاغذ دو، میں تمہیں ایک ایسی چیز لکھ دوں جو تمہیں گمراہی سے بچائے گی، یہ فرمان کسی خاص شخص سے نہیں تھا، بلکہ اس وقت جو لوگ بھی، جتنے صحابی اور اہل بیت میں سے جتنے مقدس نفوس وہاں موجود تھے، ان سب سے خطاب تھا، حضور ﷺ پر اس وقت بتقاضائے بشریت بیماری کا غلبہ تھا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور ﷺ کی تکلیف کا خیال کرتے ہوئے عرض کی وعندنا کتاب اللہ حسبنا اور ہمارے پاس اللہ کی کتاب (قرآن مجید) موجود ہے اور وہ ہمارے لئے کافی ہے، یہ گذارش حضور ﷺ کی نافرمانی نہ تھی، بلکہ کسی شخص کو مخاطب کئے بغیر یہ فرمان دراصل مخاطبین کا امتحان تھا، حضور ﷺ چونکہ چشم عالم سے روپوش ہونے والے تھے، اور سفر آخرت پر روانہ ہونے کو تھے، اس لئے یہ امتحان ضروری تھا کہ وہ حضرات صحابہ کرام جو ہر مشکل کے حل کے لئے سرکار ﷺ سے رجوع کیا کرتے تھے، سرکار ﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد اپنے مسائل کے حل اور مشکلات کی آسانی کے لئے الہامی تعلیمات اور فرامین نبوی کی روشنی میں امت مسلمہ کی راہنمائی کرسکیں گے، حضور ﷺ کے فیض صحبت سے ان میں یہ استعداد اور صلاحیت پیدا ہوئی ہے یا نہیں کہ وہ قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ سے تمام پیش آنے والے مسائل حل کرسکیں، اس وقت آپ کے پاس موجود افراد میں وہ لوگ بھی موجود تھے جو آپ کی نیابت کرنے والے اور مسند خلافت پر جلوہ فگن ہونے والے تھے، آپ کی صحبت اور انوار نبوت نے ان کے سینوں کو چمکا دیا تھا، اور انہی انوار کی روشنی میں انہوں نے غلبہ دین کے لئے آئندہ کوشاں رہنا تھا، اگر

آپ کی نیابت کرنے والے اس اہل نہ ہوتے کہ آئندہ پیش آنے والے جملہ معاملات ومسائل کو قرآن وسنت کی روشنی میں حل کرسکیں تو اس کا مطلب تو معاذ اللہ یہ ہوگا کہ آپ دین کو ختم کرنے جارہے تھے، چنانچہ اس کی وضاحت کے لئے آپ نے خدا کے فرمان کے مطابق کہا کہ کاغذ لاؤ میں تمہیں ایسا نوشتہ دوں جو تمہیں گمراہی سے بچائے گا، تاکہ آپ کے اس فرمان کے جواب میں آپ صحابیوں میں سے کوئی بول اُٹھے گا اور عرض کرے گا کہ سرکار آپ ہم سے اس عالم میں رخصت نہیں ہو رہے کہ جب ہمیں اپنی آئندہ زندگی اور بنی نوع آدم کی فلاح کے لئے کسی مزید حکم کی ضرورت ہو، بلکہ آپ نے ہم میں وہ نور بصیرت پیدا فرمادیا ہے اور ہمیں اپنے حسن تربیت سے وہ مقام عطا فرمادیا ہے کہ اللہ کی کتاب ہمارے لئے کافی ہے، مقصود وحی اور منشائے نبوت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حسبنا کتاب اللہ کہنے سے پورا ہوگیا، وگرنہ حضرت عمر کی اس گزارش کے بعد سرکار مزید اصرار فرماتے اور ان کو جھڑک دیتے کہ میں تم سے کاغذ مانگ رہا ہوں اور تم میرے حکم کی بجائے اپنی لیاقت وقابلیت بتارہے ہو، میں نبی ہوں مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے، جو کچھ میں تمہیں بتانے والا ہوں وہ تم از خود کیسے جان سکتے ہو، اور پھر اس مقام پر سیدنا صدیق اکبر، سیدنا عثمان غنی اور مولائے کائنات سیدنا علی مرتضی کا حضرت عمر کی بات کے جواب میں سکوت اختیار کرنا اور تکرار نہ کرنا اس بات کو مزید تقویت پہنچاتا ہے کہ یہ عالی مرتبت ہستیاں بھی منشائے رسالت کو پاچکی تھیں اور گویا حضرت عمر نے ان سب کی ترجمانی کی تھی، کیونکہ سرکار کا فرمان ہے: "ان الحق ینطق علی لسان عمر"، اگرچہ چند صحابہ نے حضرت عمر سے اختلاف ضرور کیا لیکن وہ عظمت وشان کے حامل ہونے کے باوجود اس مقام پر نہ پہنچے تھے جو ان اکابر صحابہ کرام کا مقام تھا، اس لئے ان کا اختلاف دراصل مشورے پر مبنی سمجھا جائے گا، اور اکابر صحابہ کا سکوت حضرت عمر کے قول کی تصدیق متصور ہوگا، نہ تو ان اکابر صحابہ نے حضرت عمر کے اس قول پر احتجاج کیا اور نہ خود سرکار دو عالم ﷺ نے انہیں سرزنش فرمائی، اس لئے بعض صحابہ کے اختلاف کا وہ مفہوم نہیں ہوگا جو

معترض نے سمجھا ہے۔

معترض خواہ حضور ﷺ کے ہر فرمان کو وحی سمجھے یا نہ سمجھے، اس بات کا قائل تو ضرور ہوگا کہ حضور ﷺ جب دینی امور کی تشریح وتعبیر سے آگاہ فرماتے تھے اور دین سے متعلق احکامات کی تبلیغ فرماتے تھے تو وہ فرمودات تو یقیناً وحی الہی کے تابع ہوتے تھے، اب یہ سوچئے کہ یہ معاملہ دین سے متعلق تھا یا نہیں؟ ضلالت وگمراہی سے بچنا اور صراط مستقیم کو اختیار کرنا تو دین کا مقصود ومدعا ہے، اس لئے یہ فرمان یقیناً وحی الہی ہوگا کہ من حیث الرسول ارشاد ہے، اب اگر یہ تشریح جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے، نہ تسلیم کی جائے تو پھر یہ کہا جائے گا کہ ایک ایسی تحریر جو دین سے متعلق تھی اور بحکم خداوندی سرکار ﷺ وہ تحریر عطا فرمانے والے تھے، حضرت عمر کے کہنے پر سرکار ﷺ نے عطا نہ فرمائی، تو اس کا مفہوم تو یہ ہوگا کہ معاذ اللہ حضور ﷺ خود بھی امر الہی کی تکمیل سے پہلوتہی کے مرتکب ہوئے، اور ایسا ممکن نہیں ہے، وہ اس لئے کہ قرآن نے کہا، یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ۔ (اے رسول پہنچا دیجئے جو اتارا گیا آپ پر آپ کے رب کی طرف سے، اور اگر آپ نے (ایسا) نہ کیا تو اپنے رب کا پیغام آپ نے نہ پہنچایا) گویا ماننا پڑے گا کہ دین کے مسائل، گمراہی سے بچنے اور صراط مستقیم اختیار کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ آپ ﷺ نے اپنی اُمت تک یقیناً پہنچائی، اور اس حدیث مبارکہ میں حضرت عمر کے عرض گزار ہونے کے بعد آپ نے کوئی شئے تحریر نہ فرمائی اس لئے ماننا پڑے گا کہ حضرت عمر کے قول سے آپ کے فرمان کا مقصد پورا ہوگیا تھا۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ وہ وقت ایسا تھا جب تعلیم عام نہ تھی، ہر شخص پڑھنا لکھنا نہ جانتا تھا، اور کاغذ قلم بھی عام نہ تھے اور ہر شخص کے پاس نہ ہوتے تھے، اور یہ بات بھی تمام اہل علم جانتے ہیں کہ سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا حجرہ مسجد نبوی سے متصل تھا، اور

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کاتبین وحی میں سے تھے، اس لئے جب سرکار ﷺ نے کاغذ مانگا تو سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے گھر سے جو سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرے سے بہت قریب تھا، فوراً کاغذ قلم لا کر سرکار کی خدمت میں پیش کر دیتے، ان کا ایسا نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بات سے متفق تھے۔

اس ضمن میں نہایت قابل ذکر بات یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز جس کے باعث امت مسلمہ گمراہی سے بچتی اور ہمیشہ صراط مستقیم پر رہتی اور جو ہماری ہدایت کے لئے بے حد ضروری تھی، اگر ہم تک نہیں پہنچی تو یقیناً دین نامکمل رہ گیا ہے، کیونکہ وہ بات تو ہمیں معلوم ہی نہیں جو سرکار تحریر فرمانا چاہتے تھے اور وہ گمراہی سے بچنے میں ہماری راہنما ثابت ہوتی، لیکن قرآن مجید اعلان کر رہا ہے کہ "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی" دین تو مکمل ہو گیا ہے، اور اس کی وضاحت عمر فاروق کر رہے ہیں کہ سرکار ﷺ کے رب نے دین کی تکمیل کر دی ہے اور آپ کی زبان اقدس سے ہمیں یہ بشارت سنائی جا چکی ہے اور آپ نے ہماری تربیت فرمائی ہے، اس لئے سرکار ﷺ آپ کے فرمان کے مقصد کی تکمیل کرتے ہوئے میں عرض کرتا ہوں کہ آپ کی نظر اور صحبت کی برکت سے آپ کے غلام اس قابل ہو چکے ہیں کہ وہ کتاب اللہ کی روشنی میں صراط مستقیم تلاش کر سکیں اور گمراہی سے محفوظ رہ سکیں۔[1]

---

[1] ماہنامہ "السعید" ملتان، شمارہ اپریل ۱۹۹۵ء

حدیث نمبر (۲۸)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت کب ملی؟

''عن ابي هريرة قال سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم متي وجبت لك النبوة؟ قال بين الخلق آدم ونفخ الروح فيه''۔ [1]

''عن ابي هريرة قال قالوا يارسول الله متي وجبت لك النبوة قال وآدم بين الروح والجسد''۔ [2]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کو نبوت کب ملی؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسم کے درمیان تھے یعنی ان کے جسم میں جان نہیں ڈالی گئی تھی۔

حضور علیہ السلام کا بتقاضائے بشریت زمین پر چلنا یقیناً حق ہے لیکن بتقاضائے نورانیت آسمانوں پر تشریف فرما ہونا بلکہ عرش الٰہی پر خرام ناز فرمانا بھی ثابت ہے، بے شک مناسبات بشریہ کی وجہ سے حضور علیہ السلام توالد و تناسل کی صفت سے متصف ہیں اور آدم علیہ السلام کی اولاد میں یقیناً شامل ہیں، لیکن بتقاضائے نورانیت اول خلق بھی حضور ہی ہیں، اور آدم علیہ السلام و دیگر تمام انبیاء علیہم السلام سے قبل حضور علیہ السلام کی خلقت واقع ہوئی جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہوا، ''انا اولهم خلقاً'' یعنی میں تمام انبیاء علیہم السلام سے پہلے پیدا ہوا ہوں، ترمذی شریف کی ایک حدیث میں وارد ہے کہ میں اس وقت نبی تھا، جب آدم علیہ السلام جسم اور روح کے درمیان تھے، گویا بشریت کے اعتبار سے حضور علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور اپنے والد ماجد حضرت عبداللہ اور اپنی والدہ ماجدہ حضرت

---

[1] دلائل النبوۃ امام ابی نعیم اصبہانی، فصل اول، حدیث ۸، ص ۸۸، مطبوعہ دار النفائس بیروت ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء

[2] ترمذی، باب فضل النبی، حدیث ۳۶۰۹

مکتبہ المواہب الجزء خامس
مطبوعہ مصطفیٰ البابی الحلبی مصر ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء، ص ۵۸۵

آمنہ کے بیٹے ہیں، لیکن اپنی نورانیت کے لحاظ سے آدم و اولاد آدم سب کی اصل ہیں لا ریب!
حضور ﷺ جہاد کے موقع پر بار ہا زخمی ہوئے اور بتقاضائے بشریت بدن مبارک سے خون اقدس کے قطرے بھی ٹپکے، لیکن کئی بار شق صدر مبارک ہوا اور بتقاضائے نورانیت خون کا ایک قطرہ بھی جسم شریف سے نہیں نکلا نہ زخم ہوا نہ تکلیف ہوئی نہ دوا دارو کی حاجت واقع ہوئی۔

علیٰ ہذا القیاس حضور سرور عالم ﷺ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ شریفہ میں شب کی نماز پڑھتے تھے، حجرہ مبارکہ میں چراغ نہ ہونے کی وجہ سے اندھیرا ہوتا تھا، حضور علیہ السلام جب سجدہ فرماتے تو حضرت اُم المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے جسم اقدس کو اپنے دست مبارک سے ذرا دبا دیتے تو اُم المومنین حضور کے سجدہ کے لئے جگہ چھوڑ دیتیں، ذات مقدسہ میں باوجود نورانیت ہونے کے اجالا نہ ہوتا بشریت کا مقتضا تھا لیکن حضور سید عالم شب کی تاریکی میں جب راستہ پر چلتے تو حضور ﷺ کے نور سے دیواریں روشن ہو جاتیں دیکھئے بیہقی شریف کی حدیث میں ہے :

”وقال ابو هريرة رضي الله تعاليٰ عنه واذا ضحك صلي الله عليه وسلم يتلألؤ في الجدر رواه البزار والبيهقي اي يضيُ في الجدر بضم الجيم والدال جمع جدار وهو الحائط اَي يشرق نوره عليها اشراقاً كاشراق الشمس عليها انتهي“[1]

ترجمہ : حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا حضور ﷺ جب ہنستے تھے تو حضور کا نور دیواروں پر چمکتا تھا اس حدیث کو امام بزار اور بیہقی نے روایت کیا، امام قسطلانی حدیث کے معنی بیان فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا نور دیواروں پر ایسا چمکتا اور روشن ہوتا تھا جیسے سورج کی روشنی دیواروں پر پڑتی ہے اور چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

---

[1] مواہب اللدنیہ، جلد اول، ص ۲۷۱

مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۶ء جلد ۲، ص ۳۰۳

رات کی تاریکی میں حضور علیہ السلام کے نور سے دیواروں کا روشن ہوتا نورانیت کا مقتضا تھا، رہا یہ امر کہ ام المومنین کے حجرہ میں اُجالا ظاہر نہ ہونے میں کیا حکمت تھی؟ تو میں عرض کروں گا کہ حضور علیہ السلام کے تمام مقتضیات بے شمار حکمتوں پر مبنی ہیں بالخصوص مقتضیات بشریہ میں جو چیز سب سے زیادہ واضح اور روشن ہے، وہ تبلیغ و تعلیم اور تکمیل دین کی حکمت ہے، اُم المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ شریفہ میں اگر اُجالا ظاہر ہوتا تو وہ حضور ﷺ کے سجدہ کے لئے خود بخود جگہ چھوڑ دیتیں اور حضور ﷺ کو بحالت نماز ان کے بدن کو چھونے کی نوبت نہ آتی، جب حجرہ شریفہ میں اُجالا نہ ہوا تو حضور علیہ السلام کے لئے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بدن کو مس فرمانے کا موقع بہم پہنچا، اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس عمل مبارک سے بادی النظر میں دین کے پانچ مسئلے مکمل ہو گئے اور اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو نہ معلوم اور کتنے مسائل نکلیں گے، وہ مسائل خمسہ حسب ذیل ہیں :

(۱) نماز میں عمل قلیل جائز ہے۔

(۲) عورت کے بدن کو ہاتھ لگنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

(۳) عورت کو چھونا مفسد صلوٰۃ نہیں۔

(۴) وقت ضرورت اندھیرے میں نماز پڑھنا بلا کراہت جائز ہے۔

(۵) نمازی کے آگے عورت کے ہونے سے نماز میں فتور نہیں آتا۔

شاید کوئی کہے کہ آپ نے جو امور مقتضیات بشریت کے خلاف بیان کئے ہیں وہ سب حضور ﷺ کے معجزات ہیں، تو میں عرض کروں گا کہ بے شک وہ جملہ امور بشریت کے اعتبار سے معجزات ہیں، لیکن جس طرح یہ امور معجزہ ہیں اسی طرح تمام مقتضیات بشریت حضور علیہ السلام کے حق میں معجزہ قرار پائیں گے، کیونکہ ہر وصف خارق عادت نبی کے حق میں معجزہ کی شان رکھتا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ اوصاف بشریہ حضور ﷺ کی نورانیت کے لئے یقیناً خارق عادت ہیں، لہٰذا اچھی طرح واضح ہو گیا کہ جس طرح حضور ﷺ کا عرش پر جانا

بشریت کے اعتبار سے معجزہ ہے اسی طرح فرش پر رہنا نورانیت کے لحاظ سے معجزہ ہے، حضور علیہ السلام کا صوم وصال کے وقت مسلسل کئی دن اور کئی راتوں تک کھانے پینے سے لاتعلق رہنا بشریت کی نسبت سے معجزہ ہے اور حکمت تعلیم کے لئے کھانا پینا نورانیت کے اعتبار سے معجزہ ہے، شق صدر مبارک کے اوقات میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم اقدس سے خون مبارک کا نہ نکلنا بشریت کے حق میں معجزہ ہے اور جہاد کے مواقع میں خون اقدس کا نکلنا نورانیت کے لئے معجزہ ہے، پسینہ مبارک و دیگر فضلات شریفہ کا خوشبو دار و معطر ہونا اور جسم اقدس کے جمیع متعلقات شریفہ کا طیب و طاہر ہونا حضور علیہ السلام کی بشریت کا معجزہ ہے اور نفس فضلات شریفہ کا پایا جانا نورانیت کا معجزہ ہے، لعاب دہن مبارک سے لوگوں کی بھوک پیاس کا زائل ہو جانا اور جُبہ مبارکہ سے بیماروں کا شفایاب ہونا بشریت کی جہت سے معجزہ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر خود بھوک پیاس اور بیماری کا عارض ہونا نورانیت کی نسبت سے معجزہ ہے، یہ علیحدہ امر ہے کہ اس عالم میں بشریت مطہرہ کے غلبہ اور ظہور تام کے باعث ان مقتضیات بشریہ کا بلحاظ نورانیت معجزہ ہونا غیر ظاہر ہو، لیکن حقیقت واقعیہ کے پیش نظر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام اوصاف بشریہ معجزانہ شان رکھتے ہیں، علیٰ ہذا آدم و اولاد آدم علیہ السلام کی اصل ہونا بشریت کے لئے خرق عادت ہونے کی وجہ سے حسن و جمال ہے اور نسل بنی آدم میں پیدا ہو کر والدین ماجدین کا بیٹا ہونا نورانیت کے باعث خوبی و کمال ہے۔ مختصر یہ کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خواص نورانیت بالنسبتہ الی البشریت معجزات و کمالات ہیں اور اوصاف بشریت بالنسبتہ الی النورانیت کمالات و معجزات ہیں اور ذات محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جب بشریت اور نورانیت دونوں جمع ہو گئیں تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مجسم معجزہ اور کمال ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

فرشتہ نور ہے اور قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مقدسہ سے فرشتہ ہونے کی نفی وارد ہے چنانچہ ارشاد فرمایا۔ "ولا اقول لکم انی ملک" یعنی کہہ دو کہ میں تم سے نہیں

کہتا کہ میں فرشتہ ہوں، جب حضور علیہ السلام سے ملک ہونے کی نفی ہوگئی تو نورانیت کی بھی نفی ہوگئی، اس کا ازالہ یہ ہے کہ ملک اور نور کے مابین تساوی کی نسبت نہیں کہ ایک کی نفی سے دوسرے کی نفی ہو جائے، دوسرے یہ کہ حقیقت قول کی نفی وجود مقول کی نفی کو مستلزم نہیں، تیسرے یہ کہ ملک ایک خاص نوری مخلوق کو کہا جاتا ہے جس میں بشریت نہیں ہوتی، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ملک کہا جائے تو حضور علیہ السلام کی ذات مقدسہ سے حقیقت بشری منتفی ہو جائے گی، حالانکہ حضور علیہ السلام تمام حقائق کائنات کے جامع ہیں، اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ملک کہنا جائز نہیں لیکن ملک نہ ہونے سے نور نہ ہونا لازم نہیں آتا، فرشتوں کے علاوہ بے شمار نوری افراد ہیں جو ملک نہیں مگر نور ہیں اسی طرح حضور علیہ السلام بھی ملک نہیں مگر نور ہیں [1]

---

[1] ماہنامہ "السعید" ملتان، شمارہ دسمبر ۱۹۶۰ء

حدیث نمبر (۲۹)

حدیث نور

''وروي عبدالرزاق بسنده عن جابر بن عبدالله انصاري قال: قلت يارسول الله، بابي انت وأمي، اخبرني عن اوّل شئي خلقه الله تعاليٰ قبل الاشياء، قال: يا جابر، ان الله تعاليٰ خلق قبل الاشياء نور نبيك من نوره، فجعل ذلك النور يدور بالقدرة حيث شاء الله تعالي، ولم يكن في ذلك الوقت لوح ولا قلم، ولا جنة ولا نار، ولا ملك ولا سماء، ولا ارض ولا شمس ولا قمر، ولا جني ولا انسي. فلما اراد الله تعاليٰ أن يخلق الخلق قسم ذلك النور أربعة اجزاء، فخلق من الجزء الاوّل القلم، ومن الثاني اللوح، ومن ثالث العرش، ثم قسم الجزء الرابع أربعة اجزاء، فخلق من الجزء الاول حملة العرش، ومن الثاني الكرسي، ومن الثالث باقي الملائكة، ثم قسم الجزء الرابع أربعة اجزاء، فخلق من الاول السماوات، ومن الثاني الارضين ومن الثالث الجنة والنار، ثم قسم الرابع اربعة اجزاء، فخلق من الاول نور ابصار المؤمنين، ومن الثاني نور قلوبهم، وهي المعرفة بالله، ومن الثالث نور أنسهم، وهو التوحيد لا اله الا الله محمد رسول الله''۔[1]

---

[1] مواہب اللدنیۃ بالمنح المحمدیۃ، احمد بن محمد قسطلانی طبع قدیم مصر، ص ۱۲
سیرت حلبیہ، ج ۱، ص ۵۰) (زرقانی شرح مواہب، ج ۱، ص ۴۶

حضرت امام عبدالرزاق صاحب مصنف عبدالرزاق نے اپنی سند کے ساتھ سیدنا جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت جابر فرماتے ہیں، میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ مجھے خبر دیں کہ وہ پہلی چیز کون سی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء سے پہلے پیدا فرمایا، حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا! اے جابر! بے شک اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء سے پہلے تیرے نبی کا نور اپنے نور سے پیدا فرمایا، پھر یہ نور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے موافق جہاں اس نے چاہا سیر کرتا رہا، اس وقت نہ لوح تھی نہ قلم تھا، نہ جنت تھی، نہ دوزخ تھی، نہ فرشتہ تھا نہ آسمان نہ زمین نہ سورج نہ چاند نہ جن نہ انسان، جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ مخلوقات کو پیدا کرے تو اس نور کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا، پہلے حصے سے قلم بنایا، دوسرے سے لوح، تیسرے سے عرش پھر چوتھے کو چار حصوں میں تقسیم کیا، تو پہلے حصے سے عرش اُٹھانے والے فرشتے بنائے اور دوسرے سے کرسی اور تیسرے سے باقی فرشتے، پھر چوتھے حصے کو چار حصوں میں تقسیم کیا، پہلے سے آسمان بنائے، دوسرے سے زمین اور تیسرے سے جنت اور دوزخ، پھر چوتھے حصے کو چار حصوں میں تقسیم کیا، تو پہلے مومنین کی آنکھوں کا نور بنایا اور دوسرے سے ان کے دلوں کا نور پیدا کیا، جو معرفت الٰہی ہے، اور تیسرے سے ان کا نور انس پیدا کیا اور وہ توحید ہے، جس کا خلاصہ ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

یہ حدیث مصنف عبدالرزاق سے جلیل القدر محدثین جیسے امام قسطلانی شارح بخاری و امام زرقانی اور امام ابن حجر مکی اور علامہ دیار بکری نے اپنی تصانیف جلیلہ افضل القریٰ، مواہب اللدنیہ، مطالع المسرات، تاریخ الخمیس اور زرقانی علی المواہب میں نقل فرما کر اس پر اعتماد اور اس سے مسائل کا استنباط کیا۔

امام عبدالرزاق صاحب مصنف جو اس حدیث کے مخرج ہیں، امام احمد بن حنبل جیسے اکابر ائمہ دین کے استاذ ہیں، تہذیب التہذیب ان کے متعلق لکھا ہے:

"وقال احمد بن صالح المصري قلت لاحمد بن حنبل رايت احدا احسن حديثا من عبد الرزاق قال لا"۔ [1]

ترجمہ: احمد بن صالح مصری کہتے ہیں، میں نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا، کیا آپ نے حدیث میں کوئی شخص عبدالرزاق سے بہتر دیکھا؟ انہوں نے فرمایا "نہیں"۔

امام عبدالغنی نابلسی فلسطینی رضی اللہ عنہ "حدیقہ ندیہ" میں اس حدیث کی تصحیح فرماتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں "قد خلق کل شئی من نورہ ﷺ کما ورد بہ الحدیث الصحیح"۔ اسی حدیث کو امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی دلائل النبوۃ میں تقریباً اسی طرح روایت فرمایا ہے۔

مطالع المسرات شرح دلائل الخیرات میں علامہ فاسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"قد قال الاشعري انه تعالىٰ نور ليس كالانوار والروح النبوية القدسية لمعة من نوره والملائكة شرر تلك الانوار وقال ﷺ اوّل ما خلق الله نوري ومن نوري خلق كل شئي وغيره مما في معناه"۔ [2]

یعنی عقائد میں اہل سنت کے امام سیدابوالحسن اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسا نور ہے کہ کسی نور کی مثل نہیں اور حضور ﷺ کی روح مقدسہ اسی نور کی چمک ہے، اور فرشتے انہی انوار سے جھڑے ہوئے پھول ہیں، اور رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے میرا نور پیدا فرمایا، اور میرے ہی نور سے ہر چیز پیدا فرمائی۔

اس کے علاوہ اور بھی حدیثیں اس مضمون میں وارد ہیں۔

---

[1] تہذیب التہذیب طبع حیدرآباد دکن ج ۶ ص ۳۱۱

[2] مطالع المسرات طبع مصر ۱۲۹۸ھ ص ۲۲۵

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مدارج النبوۃ میں فرمایا !

"در حدیث صحیح وارد شد کہ اوّل ما خلق اللہ نوری"[۱]

پھر حدیث جابر کا مضمون بیان فرمایا، کثیر التعداد، جلیل القدر ائمہ کا اس حدیث کو قبول کرنا اور تصحیح فرمانا، اس پر اعتماد کر کے اس سے مسائل استنباط کرنا، اس کے صحیح ہونے کی روشن دلیل ہے، خصوصاً سیدنا عبدالغنی نابلسی رضی اللہ عنہ کا "حدیقہ ندیہ" کے مبحث کے نوع ستین من آفات اللسان فی مسئلہ ذم الطعام (طبع فیصل آباد ص ۳۷۵) میں اس حدیث کے متعلق الحدیث الصحیح فرمانا صحت حدیث کو زیادہ واضح کر دیتا ہے، ان مختصر جملوں سے ان حضرات کو مطمئن کرنا مقصود ہے جو اس حدیث کی صحت میں متردد رہتے ہیں۔

اس حدیث میں نورہ کی اضافت بیانیہ ہے، اور نور سے مراد ذات ہے (زرقانی، جلد اول، ص ۴۶ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت، ص ۹۰) حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کے نور پاک یعنی ذات مقدسہ کو اپنے نور یعنی اپنی ذات مقدسہ سے پیدا فرمایا، اس کے یہ معنی نہیں کہ معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ حضور علیہ السلام کی ذات کا مادہ ہے، نعوذ باللہ۔

حضور ﷺ کا نور، اللہ تعالیٰ کے نور کا کوئی حصہ یا ٹکڑا ہے، تعالی اللہ من ذلك علوا كبيرا، اگر کسی ناواقف شخص کا یہ اعتقاد ہے، تو اسے توبہ کرنا فرض ہے، اس لئے کہ ایسا ناپاک عقیدہ خالص کفر و شرک ہے، اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے، بلکہ اس حدیث کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی ذاتی تجلی فرمائی جو حسن الوہیت کا ظہور اول تھی، بغیر اس کے ذات خداوندی نور محمدی کا مادہ یا حصہ اور جز قرار پائے، یہ کیفیت متشابہات میں سے ہے، جس کا سمجھنا ہمارے لئے ایسے ہی ہے، جیسا کہ قرآن و حدیث کے دیگر متشابہات کا سمجھنا، البتہ

[۱] مدارج النبوۃ طبع نول کشور ج ۲ ص ۲

نکتے اور لطیفے کے طور پر اتنا کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح شیشہ آفتاب کے نور سے روشن ہوجاتا ہے، لیکن آفتاب کی ذات یا اس کی نورانیت اور روشنی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، اور ہمارا یہ کہنا بھی صحیح ہوتا ہے کہ شیشے کا نور آفتاب کے نور سے ہے۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نور اللہ تعالیٰ کے نور سے پیدا ہوا، اور آئینۂ محمدی نورِ ذاتِ احدی سے اس طرح منور ہوا کہ نورِ محمدی کو نورِ خداوندی سے قرار دینا صحیح ہوا، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک یا اس کی کسی صفت میں کوئی نقصان اور کمی واقع نہیں ہوئی، شیشہ سورج سے روشن ہوا، اور اس ایک شیشے سے تمام شیشے روشن ہوگئے، نہ پہلے شیشے نے آفتاب کے نور کو کم کیا اور نہ دوسرے شیشوں نے پہلے شیشے کے نور سے کچھ کمی کی، حقیقت یہ ہے کہ فیضانِ وجود اللہ تعالیٰ کی ذات سے حضور کو پہنچا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے تمام ممکنات کو وجود کا فیض حاصل ہوا۔

اس کے بعد اس شبہ کو بھی دور کرتے جائیے، کہ جب ساری مخلوق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے موجود ہوئی، تو ناپاک، خبیث اور قبیح اشیاء کی برائی اور قباحت معاذ اللہ حضور علیہ السلام کی طرف منسوب ہوگی، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید توہین ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آفتابِ وجود ہیں، اور کل مخلوقات حضور علیہ السلام کے آفتابِ وجود سے فیضانِ وجود حاصل کر رہی ہے، جس طرح اس ظاہری آفتاب کی شعائیں تمام کرۂ ارضی میں جمادات و نباتات اور کل معدنیات، جملہ موالید اور جواہر اجسام کی حقائق لطیفہ اور خواص و اوصاف مختلفہ کا اضافہ کر رہی ہے، اور کسی کی اچھی بری خاصیت کا اثر شعاعوں پر نہیں پڑتا، نہ کسی چیز کے اوصاف و اثرات سورج کے لئے قباحت اور نقصان کا موجب ہوسکتے ہیں۔

دیکھئے زہریلی چیزوں کا زہر اور مہلک اشیاء کی یہ تاثیرات معدنیات و نباتات وغیرہ کے الوان طعوم و روائح، کھٹا، میٹھا مزا، اچھی بری بو، سب کچھ سورج کی شعاعوں سے برآمد

ہوتی ہے، لیکن ان میں سے کسی چیز کی کوئی صفت سورج کے لئے عار کا موجب نہیں، کیونکہ یہ تمام حقائق آفتاب اور اس کی شعاعوں میں انتہائی لطافت کے ساتھ پائے جاتے ہیں، اور اس لطافت کے مرتبے میں کوئی اثر برا نہیں کہا جاسکتا، البتہ جب وہ لطیف اثرات اور حقائق سورج اور اس کی شعاعوں سے نکل کر اس عالم اجسام میں پہنچتے اور رفتہ رفتہ ظہور پذیر ہوتے ہیں تو ان میں بعض ایسے اوصاف وخواص پائے جاتے ہیں، جن کی بنا پر انہیں قبیح ناپاک اور برا کہا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ ان برائیوں کا کوئی اثر سورج یا اس کی شعاعوں پر نہیں پڑ سکتا، اسی طرح عالم اجسام میں کثیف اور نجس چیزوں کا کوئی اثر حضور علیہ السلام کی ذات پاک پر نہیں پڑ سکتا۔

اس کے بعد یہ بات بھی سمجھنے کے قابل ہے کہ سورج کی شعاعیں ناپاک گندی چیزوں پر پڑنے سے ناپاک نہیں ہوسکتیں، تو انوار محمدی کی شعاعیں عالم موجودات کی برائیوں اور نجاستوں سے معاذ اللہ کیوں کر متاثر ہو سکتی ہیں، نیز یہ کہ حضور علیہ السلام کے نور میں حقائق اشیاء پائی جاتی ہیں اور حقیقت کسی چیز کی نجس اور ناپاک نہیں ہوتی، نجاستیں مٹی میں دب کر مٹی ہو جانے کے بعد پاک ہو جاتی ہیں، نجاستوں کا جو کھاد کھیتوں میں ڈالا جاتا ہے، اسی کے نجس اجزاء پودوں کی غذا بن کر اناج، پھول اور پھل سبزیوں اور ترکاریوں کی صورت میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں، اور وہی اجزائے غلیظہ غلہ اور پھل بن کر ہماری غذا بن جاتے ہیں، جنہیں پاک سمجھ کر ہم کھاتے پیتے اور کسی قسم کا تردد دل میں نہیں لاتے۔ ثابت ہوا کہ ناپاکی کے اثرات صور وتعینات پر آتے ہیں، جو محض امور اعتباریہ ہیں، حقیقتیں ناپاک نہیں ہوا کرتیں اس لئے کل مخلوقات کا نور محمدی سے موجود ہونا کسی اعتراض کا موجب نہیں۔

تقسیم نور

حدیث جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں جو بار بار تقسیم نور کا ذکر آیا ہے، اس کے یہ معنی نہیں کہ معاذ اللہ نور محمدی تقسیم ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے جب نور محمدی کو پیدا فرمایا تو اس میں شعاع در شعاع بڑھتا گیا اور وہی مزید شعاعیں تقسیم ہوتی رہیں، اس مضمون کی طرف علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اشارہ فرمایا، دیکھئے زرقانی علی المواہب، جلد اوّل، ص ۴۶، رہا یہ شبہ کہ نور محمدی سے روح محمدی مراد ہے، لہٰذا حضور علیہ السلام کا نور ہونا ثابت نہ ہوا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث شریف میں نور نبیك من نورہ وارد ہے، جس طرح نورہ میں اضافت بیانیہ ہے اور لفظ نور سے اللہ تعالیٰ مراد ہے، اسی طرح نور نبیک میں اضافت بیانیہ ہے اور لفظ نور سے ذات پاک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ مراد ہے، لہٰذا ذات محمدی کو لفظ نور سے تعبیر فرمایا گیا ہے، اس مقام پر یہ کہنا کہ صرف روح پاک نور ہے جسم اقدس نور نہیں بے خبری پر مبنی ہے، جسم اقدس کی لطافت اور نورانیت پر ان شاء اللہ ہم آئندہ گفتگو کریں گے، سردست اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ حدیث جابر میں تمام اشیاء سے پہلے جس نور محمدی کی خلقت کا بیان ہے وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات پاک کا نور ہے اور وہ اس لطیف حقیقت کو بھی شامل ہے جسے حضور ﷺ کے نورانی اور پاکیزہ اجزائے جسمیہ کا جوہر لطیف کہا جا سکتا ہے، اس لئے کہ وہ نور پاک حضرت آدم علیہ السلام کی پشت مبارک میں بطور امانت رکھا گیا، علامہ زرقانی فرماتے ہیں:

''(وفي الخبر لما خلق الله تعالیٰ آدم جعل) اودع (ذلك النور) نور المصطفیٰ (في ظهره فكان) لشدة (يلمع في جبينه فيغلب علی سائر) باقي (نوره)'' الخ۔[1]

ترجمہ: حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو نور مصطفیٰ ﷺ کو ان کی پشت مبارک رکھ دیا، وہ نور پاک ایسا شدید چمک والا تھا کہ باوجود پشت

---

[1] زرقانی علی المواہب، جلد اوّل، ص ۴۹۔ مواہب لدنیہ، جلد اوّل، ص ۱۰

آدم نہیں ہونے کے پیشانی آدم میں چمکتا تھا، اور آدم علیہ السلام کے باقی انوار پر وہ غالب ہو جاتا تھا۔

یہ حقیقت آفتاب سے زیادہ روشن ہے کہ پشت آدم علیہ السلام میں ان کی تمام اولاد کے وہ لطیف اجزائے جسمیہ تھے جو انسانی پیدائش کے بعد اس کی ریڑھ کی ہڈی کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں، اور وہی اس کے اجزائے اصلیہ کہلائے جاتے ہیں، نہ صرف آدم علیہ السلام بلکہ ہر باپ کے صلب میں اس کی اولاد کے ایسے ہی لطیف اجزائے بدنیہ موجود ہوتے ہیں جو اس سے منتقل ہو کر اس کی نسل کہلاتی ہے، اولاد کے ان ہی اجزائے جسمیہ کا آباء کے اصلاب میں پایا جانا باپ بیٹے کے درمیان ولدیت اور ابنیت کے رشتہ کا سنگ بنیاد اور سبب اصلی ہے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں قیامت تک پیدا ہونے والی اولاد کے اجزائے اصلیہ رکھ دیئے، یہ اجزاء روح کے اجزاء نہیں، نہ روح کا کل ہیں، کیونکہ ایک بدن میں ایک ہی روح سما سکتی ہے۔ ایک سے زیادہ ایک بدن میں روح کا پایا جانا بداھۃً باطل ہے، لہذا حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روح مبارک نہیں رکھی تھی بلکہ جسم اقدس کے جوہر لطیف کی نورانی شعاعیں رکھی گئی تھیں، جو نور ذات محمدی کی شعاعیں تھیں۔

ارواح بنی آدم کا ان کے آباء کے اصلاب میں نہ رکھا جانا صحیحین کی اس حدیث سے ثابت ہے کہ استقرار حمل سے چار مہینے بعد اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو چار باتیں لکھنے کے لئے بھیجتا ہے اور چار باتیں لکھ دیتا ہے، اس کا عمل، عمر، رزق اور دوزخی یا جنتی ہونا، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے، (مشکوٰۃ، ص ۲۰) معلوم ہوا کہ اولاد کی روحیں باپ کے صلب میں نہیں رکھی جاتیں بلکہ شکم مادر میں پھونکی جاتی ہیں۔

ایک شبہ کا ضروری ازالہ

شاید کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ عالم ارواح میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت مبارک سے ان کی قیامت تک پیدا ہونے والی تمام اولاد کو باہر نکال کر ان سے اپنی ربوبیت کا عہد لیا تھا، معلوم ہوا کہ تمام بنی آدم کی ارواح آدم علیہ السلام کی پشت میں تھیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ پشت آدم علیہ السلام سے ان کی اولاد کی ارواح نہیں نکالی گئی تھیں، بلکہ وہ ان کے اشخاص مثالیہ تھے، جو مثالی صورتوں میں ان کی پشت مبارک سے بہ قدرت ایزدی ظاہر کئے گئے تھے۔ کیونکہ ہم ابھی حدیث صحیحین سے ثابت کر چکے ہیں کہ ماں کے پیٹ میں نفخ روح کیا جاتا ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ نور محمدی اپنی عزت وکرامت کے مقام میں جلوہ گر رہا اور پشت آدم علیہ السلام میں اجزائے جسمانیہ کے جوہر لطیف کے انوار رکھے گئے تھے جو اصلاب طاہرہ اور ارحام طیبہ میں منتقل ہوتے رہے۔

تطبیق

بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ نور محمدی آدم علیہ السلام کی پشت مبارک میں رکھا گیا، اور بعض روایات میں وارد ہے کہ نور محمدی ﷺ پیشانی آدم علیہ السلام میں جلوہ گر تھا، جیسا کہ تفسیر کبیر، جلد ۶، ص ۲۱۵ (زیر آیت تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض) میں ہے۔ دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ جب نور مبارک پشت آدم ہی میں تھا لیکن اپنے کمال نورانیت اور شدت چمک کی وجہ سے پیشانی آدم علیہ السلام میں چمکتا تھا۔

الحمد للہ! ہمارے اس بیان سے اچھی طرح واضح ہوگیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بدن مبارک بھی نور تھا۔

صاحب روح المعانی، حضور ﷺ کے اول خلق ہونے کے بارے میں ارقام فرماتے

ہیں "ولذا کان نورہ ﷺ اوّل المخلوقات ، ففی الخبر اول ما خلق اللہ تعالیٰ نور نبیک یا جابر "[1]

ترجمہ: چونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام وصول فیض میں واسطہ عظمیٰ ہیں، اسی لئے حضور ﷺ کا نور اول مخلوقات ہے، چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے "سب سے پہلی وہ چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی وہ تیرے نبی کا نور ہے اے جابر"۔

اس حدیث جابر مذکورہ کو مولوی اشرف علی صاحب تھانوی نے اپنی کتاب نشر الطیب میں ص ۶ پر تفصیل سے لکھا ہے۔[2]

---

[1] تفسیر روح المعانی، پارہ ۱۷، ص ۱۰۵، مطبوعہ احیاء التراث العربی، بیروت

[2] ماہنامہ "السعید" ملتان، شمارہ اگست، ستمبر ۱۹۶۰ء

حدیث نمبر (۳۰)

ظل کا معنیٰ

عن عائشة قالت کان رسول الله صلي الله عليه وسلم في سفر ونحن معه فاعتل بعير لصفية وكان مع زينب فضل فقال لها رسول الله صلي الله عليه وسلم ان بعير صفية قد اعتل فلو اعطيتها بعيرا لك قالت انا اعطي هذه اليهودية فغضب رسول الله صلي الله عليه وسلم وهجرها بقية ذي الحجة ومحرم وصفر واياماً من شهر ربيع الاول حتي رفعت متاعها وسريرها فظننت انه لا حاجة له فيها فبينما هي ذات يوم قاعدة بنصف النهار اذ رأت ظله قد اقبل فاعادت سريرها ومتاعها۔[1]

یہ حدیث آٹھویں صدی کے مشہور محدث حافظ نورالدین علی ابن ابی بکر الہیثمی نے اپنی کتاب مجمع الزوائد، جلد چہارم، طبع قاہرہ کے صفحہ ۳۲۳ پر نقل کی ہے اور اس کے تمام راویوں کی توثیق فرمائی ہے۔ مسند امام احمد، جلد ۶، ص ۱۳۲ پر بھی اسی مضمون کی حدیث ہے۔

مجمع الزوائد، جلد چہارم، ص ۳۲۳ اور مسند امام احمد، جلد ۶، ص ۱۳۲ سے منقولہ دونوں روایتوں کا مضمون واحد ہے اور ان دونوں روایتوں میں حجۃ الوداع کے سفر میں حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا وہی ایک واقعہ مذکور ہے۔ جس کا خلاصہ ترجمہ درج ذیل ہے۔

''حضرت عائشہ سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے اور

[1] مجمع الزوائد، کتاب النکاح، باب غیرۃ النساء، مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت، ج ۴، ص ۳۲۳

ہم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ تھے، راستہ میں (اُم المومنین حضرت) صفیہ کا اونٹ بیمار ہوگیا، (اُم المومنین حضرت) زینب کے پاس فالتو اونٹ تھا، حضور علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ صفیہ کا اونٹ بیمار ہوگیا ہے اور تمہارے پاس زیادہ اونٹ موجود ہے، اگر تم اپنا ایک اونٹ صفیہ کو دے دو تو بہتر ہے، حضرت زینب نے کہا حضور! اس یہودیہ کو میں اپنا اونٹ دے دوں؟ حضور علیہ السلام ناراض ہوگئے اور ان سے بات چیت کرنا چھوڑ دیا (حجۃ الوداع کے سفر میں بماہ ذی الحجہ یہ واقعہ پیش آیا تھا) حضرت زینب کو چھوڑے رکھنے کا زمانہ اتنا طویل ہوا کہ ذی الحجہ کا بقیہ مہینہ گذر گیا، محرم اور صفر کے دونوں مہینے گذر گئے اور ماہ ربیع الاول کے چند دن بھی اسی حال میں گذرے، حتیٰ کہ حضرت زینب نے اپنا بستر اور چارپائی وغیرہ سامان بھی اٹھا دیا اور یہ سمجھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اب ان کی کوئی ضرورت نہیں رہی ہے، وہ اسی حال میں ایک دن بیٹھی ہوئی تھیں، دوپہر کا وقت تھا، ناگہاں انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظل کریم کو سامنے سے آتے ہوئے دیکھا تو اسی وقت اپنے بستر وغیرہ کو واپس لوٹا دیا''۔

مخالفین کے مبلغ علم پر حیرت ہوتی ہے کہ انہیں جہاں لفظ ظل نظر آیا فوراً اس کے معنی جسم کے تاریک سایہ کے سمجھ لئے، ایسی ذہنیت والوں سے تعجب نہیں کہ وہ حدیث مبارک سبعة يظلهم الله بظله (سات آدمی ایسے ہوں گے جن پر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنا سایہ ڈالے گا) اور اسی طرح دوسری حدیث یوم لا ظل الا ظلہ (قیامت کے دن اللہ کے سایہ کے سوا کسی کا سایہ نہ ہوگا) پڑھ کر اللہ تعالیٰ کے لئے بھی جسمانی تاریک سایہ ثابت کردیں۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

امر اوّل

''ظل'' کے معنی کا بیان اور اس بات کا ثبوت کہ لفظ ''ظل'' لغت عرب میں ''شخص'' اور ''جسم'' کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔

امر دوم

ظل اور فیئ کے معنی میں فرق ہے۔

امر سوم

جس دن حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ٹھیک نصف النہار (دوپہر) کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظل کریم کو دیکھا تھا وہ دن گرمی کے موسم میں تھا۔

امر چہارم

موسم گرما میں نصف النہار کے وقت ظل اور فیئ کا وجود نہیں ہوتا۔

امر اوّل

ظل کے معنی کا بیان اور "ظل" بمعنی شخص اور جسم کا ثبوت

۱۔ منتہی الارب لفظ ظل کے تحت فرماتے ہیں:

(۱) راحت و (۲) نعمت و خیال کہ از دیو و پری وجز آں پیدا شد۔ و (۳) اسپ مسلمہ بن عبد الملک و (۴) ارجمندی و (۵) استواری، و (۶) ریشہ و پرزہ (۷) جامہ و (۸) شب یا (۹) بہرہ از شب، و (۱۰) کالبد، (۱۱) شخص ہر چیزے یا (۱۲) پوشش آں، و (۱۳) اول جوانی۔ [۱]

۲۔ اسی طرح تاج اللغت میں لفظ ظل کے معنی بیان کرتے ہوئے ارقام فرمایا:

و نیز خیالے کہ (۱) دیدہ میشود از جن وجز آں، و نام (۲) اسپ مسلم بن عبد الملک و (۳) عزت و (۴) غلبہ و (۵) ریشہ و (۶) تار جامہ کہ از دو ختن دو طرف جامہ ظاہر شود زمخشری گوید ھذا ثوب مالہ ظل۔ آگے چل کر فرماتے ہیں ظل کل شئی (۷) شخص آں چیز یا (۸) پردہ آں۔ انتہی۔ [۲]

---

[۱] منتہی الارب، جلد ۳، ص ۷۸ [۲] تاج اللغت، فصل الزاء

۳۔ القاموس المحیط میں ہے :

الظلُّ ، بالكسر : نقيض الضحِ ، أَهو الفيْءُ ، أَهو بالغداة ، والفيْ بالعشي ، جمع ظلالٌ وظلولٌ وأَظلالٌ ، والجنة ۔ ومنه : (ولا الظلُّ ولا الحرور) ، والخيال من الجن وغيره يري ، وفرس مسلمة بن عبد الملك ، والعز والمنعة ، والزئبرُ ، والليل او جنحه ، ومن كل شيء : شخصه ، او كنه ، او من الشباب اوله ، ومن القيظ : شدته ، ومن السحاب : ماواري الشمس منه ، أسواده ، ومن النهار : لونها اذا غلبته الشمس ، وهو في ظله : كنفه ۔ انتهى۔[1]

ترجمہ: ظل بالکسر روشنی کی نقیض ہے یا ظل بمعنی فیئ (سایہ) ہے یا ظل صبح کو ہوتا ہے اور فیئ شام کو ہوتا ہے، جمع ظلال ظلول اور اظلال ہے اور ظل جنت کو بھی ظل کہتے ہیں اور اسی سے ہے **ولا الظل ولا الحرور** اور ظل جن وغیرہ کے خیال کو بھی کہتے ہیں اور مسلمہ بن عبد الملک کے گھوڑے کو بھی ظل کہتے ہیں ظل کے معنی عزت بھی ہیں اور ظل کے معنی قوت اور غلبہ کے بھی ہیں اور ظل کپڑے کے تاگے کو بھی کہتے ہیں جو سینے کی وجہ سے دونوں طرف نظر آتا ہے، ظل کے معنی رات بھی ہیں اور ظل رات کی تاریکی کو بھی کہتے ہیں اور ہر چیز کے شخص اور بدن کو بھی ظل کہا جاتا ہے، یا کسی شئے کے پردے اور لباس کو بھی ظل کہتے ہیں، اوّل جوانی کو بھی ظل کہا جاتا ہے اور گرمی کی شدت کو بھی ظل کہتے ہیں اور بادل کے اس حصے کو بھی ظل کہتے ہیں جو سورج کو ڈھانک لے، اور بادل کی سیاہی کو بھی ظل کہا جاتا ہے اور دن کے رنگ کو بھی ظل کہتے ہیں جب سورج اس پر غالب ہو جائے، عرب کا محاورہ ہے **وهو في**

---

[1] القاموس المحیط، جلد رابع ص ۲ فصل الزاء، مطبوعہ فتح الکریم بمبئی
طبع موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۲۰۰۵، ص ۱۰۲۸

ظلہ اس کے معنی ہیں فی کنفہ یعنی فلاں شخص کے ظل میں ہے اس کی پناہ اور حفاظت میں ہے۔ انتہی۔

۴۔ اسی طرح اقرب الموارد میں بھی تمام معانی مرقومہ بالا لکھے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے و من کل شئی شخصہ ہر چیز کے شخص اور بدن کو بھی ظل کہتے ہیں۔[1]

۵۔ مجمع بحار الانوار میں علامہ شیخ محمد طاہر پٹنی رحمۃ اللہ علیہ ص ۳۳۳ پر ظل کے معنی جسم لکھ کر اس کے آگے ص ۳۳۴ پر فرماتے ہیں وظلالھم شخوصھم یعنی ان کے ظلال سے ان کے اشخاص یعنی اجسام مراد ہیں۔[2]

ناظرین کرام کو معلوم ہو گیا کہ کتب لغت میں ظل بمعنی سایہ ہی نہیں بلکہ اس کے اور بھی بہت سے معنی ہیں اور ان معانی میں ظل بمعنی شخص بھی وارد ہے۔ یعنی شخص اور جسم کو بھی لغت عرب میں ظل کہا جاتا ہے اور ان معنی کی تائید میں بعض مفسرین کی عبارات بھی ہدیہ ناظرین کی جاتی ہیں، دیکھئے تفسیر مظہری میں ہے۔

"ویمکن ان یقال المراد بمن في السموات والارض حقائق من فیها وارواح الملٰئکة والمومنین وبظلولهم اشخاصهم وقوالبهم کما عبر رسول الله ﷺ في دعائه الظاهر بالسواد والباطن بالخیال حیث قال في سجوده سجدلك سوادي وخیالي وهذا التاویل اولیٰ مما سبق لان الظلال التي یري ضح الشمس عبارة عن سواد موضع لم یصل الیه ضوء الشمس لحجاب جثة الشئي وذلك امر عدمي لا وجود لها فکیف یسند الیه السجود"۔[3]

---

[1] اقرب الموارد، جلد دوم ص ۷۳۱

[2] مجمع بحار الانوار، جلد ۲، ص ۳۳۳، ۳۳۴، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ

[3] تفسیر مظہری، جلد ۵، پارہ ۱۳، سورہ رعد، ص ۱۷

ترجمہ: اور ممکن ہے کہ کہا جائے کہ من فی السموات والارض سے وہ حقائق مراد ہیں جو آسمانوں اور زمینوں میں پائے جاتے ہیں اور فرشتوں اور مومنین کی روحیں، اور ان کے ظلال سے ان کے اشخاص اور قوالب مراد ہیں جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں ظاہر کو سواد اور باطن کو خیال سے تعبیر فرمایا، چنانچہ حضور علیہ السلام نے اپنے سجدے میں یہ الفاظ فرمائے سجد لك سوادی وخیال (اے اللہ تیرے لئے میرے سواد اور خیال (ظاہر وباطن) نے سجدہ کیا) اور یہ تاویل یعنی ظلال سے اشخاص اور قوالب مراد لینا پہلی تاویل سے اولیٰ ہے، اس لئے کہ وہ سائے جو سورج کی روشنی میں نظر آتے ہیں وہ عبارت ہیں اس جگہ کی سیاہی سے جہاں کسی جسم کثیف کے حاجب ہونے کی وجہ سے سورج کی روشنی نہیں پہنچتی اور ظاہر ہے کہ یہ سیاہی جسے ہم ظل کہہ رہے ہیں محض ایک امر عدمی ہے جس کے لئے کوئی وجود نہیں، تو ایسی صورت میں اس کی طرف سجدے کی اسناد کیونکر صحیح ہوگی۔ انتہی۔ (تفسیر مظہری)

دیکھئے صاحب تفسیر مظہری نے صاف اور واضح لفظوں میں ظل کے معنی شخص اور قالب کے بیان کئے ہیں۔

اسی طرح تفسیر معالم التنزیل میں ہے:

۲۔ وقیل ظلا لھم ای اشخاصھم یعنی آیت قرآنیہ یتفیؤ ظلالھم میں ان کے اجسام مراد ہیں، اور یہاں ظل بمعنی سایہ نہیں بلکہ بمعنی شخص اور بدن ہے۔ انتہی۔[1]

یہی مضمون تفسیر روح المعانی میں ہے، صاحب تفسیر روح المعانی فرماتے ہیں:

۳۔ ومن الناس من فسر الظلال في في قراء ة العامة بالاشخاص لتكون علي نحو قراء ة عيسي وانشدوا لاستعمال الظلال في ذلك قول عبدة

[1] تفسیر معالم التنزیل، پ ۲۳ ص ۱۱

اذا نزلنا نصبنا ظل اخبية
وفار للقوم باللحم المراجيل

فانه انما تنصب الاخبية لا الظل الذي هو افئي وقول الاخر.

يتبع افياء الظلال عشية فانه اراد افياء الاشخاص۔ انتهي۔

ترجمہ: اور عامہ قراء کی قرأت میں جو لفظ ظلال آیا ہے بعض لوگوں نے اس کی تفسیر اشخاص کے ساتھ کی ہے تاکہ یہ قرأت عیسیٰ کی قرأت کے موافق ہو جائے، اور انہوں نے ظلال بمعنی اشخاص کی تائید میں عبدۃ کا یہ قول پیش کیا ہے۔

جب ہم اُترے تو ہم نے خیموں کے ظل یعنی خیموں کے اشخاص و اجسام کو نصب کیا، اور قوم کے لئے گوشت کی ہانڈیاں پکنے لگیں۔

وجہ استشہاد یہ ہے کہ جو چیز نصب کی جاتی ہے وہ خیمے ہوتے ہیں، ان کا ظل جسے سایہ کہتے ہیں نصب نہیں کیا جاتا، لہذا ثابت ہوا کہ یہاں ظل بمعنی شخص پر انہوں نے استدلال کیا اور وہ قول یہ ہے۔ وہ پیچھے آتا ہے افیاء ظلال کے شام کے وقت، افیاء فئی کی جمع ہے جس کے معنی ہیں سایہ، اب اگر ظلال کے معنی بھی سایہ ہوں تو سایہ سائے کی طرف مضاف ہو جائے گا جو درست نہیں، لہذا ماننا پڑے گا کہ یہاں ظلال بمعنی اشخاص ہے اور مصرعہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ شام کے وقت اشخاص و اجسام کے سایوں کے پیچھے آتا ہے۔

اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ آیت کریمہ میں ظلال بمعنی اشخاص ہے۔

ایک اعتراض کا جواب

صاحب روح المعانی نے اس مقام پر امام راغب اصفہانی کا تعاقب نقل کیا ہے لہذا یہ استدلال مجروح ہے۔

جواباً عرض کروں گا کہ تطریح سے کام لیا جائے تو امام راغب اصفہانی کا تعاقب صحیح نہیں کیونکہ انہوں نے رَفَعْنَا ظِلَّ اَخْبِيَةٍ کے معنی کئے ہیں رفعنا الاخبية فرفعنا به

ظلها اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں لفظ ظل حشو محض ہے اور بالکل بے فائدہ ہو کر رہ جاتا ہے، جو تاویل فساد کلام کا موجب ہو وہ خود فاسد ہے اس لئے یہ تعاقب درست نہیں، علیٰ ہذا القیاس دوسرے قول میں وہ خاص کی اضافت عام کی طرف بتارہے ہیں، اہل علم سے مخفی نہیں کہ اضافت کا فائدہ تخصیص وتعریف مضاف ہے یا تخفیف لفظی، اس اضافت میں تخفیف لفظی تو متصور ہی نہیں، رہی تخصیص تو وہ تحصیل حاصل ہوگی اس لئے کہ مضاف اضافت سے پہلے ہی خاص ہے لہذا اضافت بے فائدہ رہی اور یہ بھی فساد کلام ہے، معلوم ہوا کہ امام راغب اصفہانی کا تعاقب صحیح نہیں اور دونوں قولوں میں ظل بمعنی شخص ہی مستعمل ہے جس کی تائید تفسیر مظہری، تفسیر معالم التنزیل، مجمع بحار الانوار اور لغت کی معتبر کتابوں سے ہوتی ہے، جن کی روشن اور واضح عبارات

ہم ابھی نقل کر چکے ہیں۔

امر دوم

ظل اور فئ کے معنی میں فرق ہے

مصباح المنیر میں ہے :

(الظل) قال ابن قتیبه یذهب الناس الي ان الظل والفئي بمعني واحد ولیس کذلك بل الظل یکون غدوة وعشیة والفئي لا یکون الا بعد الزوال فلا یقال لما قبل الزوال فئي وانما سمي بعد الزوال فیئًا لانه ظل فاء من جانب المغرب الي جانب المشرق والفئي الرجوع وقال ابن السکیت الظل من الطلوع الي الزوال والفئي من الزوال الي الغروب وقال ثعلب الظل للشجرة وغیرها بالغداة والفئي بالعشي وقال رؤبة بن العجاج کل ما کانت علیه الشمس فزالت عنه فهو ظل وفئي ومالم یکن علیه الشمس فهو

ظل، ومن هنا قيل الشمس تنسخ الظل والفيء ينسخ الشمس، وجمع الظل ظلال والظلة وظل۔ [1]

ترجمہ: ابن قتیبہ نے کہا کہ بعض لوگ اس طرف گئے ہیں کہ ظل اور فئی ایک معنی میں ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ ظل صبح اور شام دونوں وقت ہوتا ہے اور فئی صرف بعد الزوال ہوتا ہے، لہذا قبل الزوال سایہ کو فئی نہیں کہا جاتا، اور سایہ بعد الزوال کو اس لئے فئی کہا جاتا ہے کہ فئی کے معنی رجوع کے ہیں اور وہ سایہ (جسے فئی کہا جاتا ہے) وہ مشرق سے مغرب کی جانب ہوتا ہے، ابن سکیت کا قول ہے کہ طلوع سے زوال تک جو سایہ ہوتا ہے اسے ظل کہا جاتا ہے اور زوال کے بعد سے غروب تک فئی ہوتا ہے، اور ثعلب نے کہا کہ ظل درخت وغیرہ کے اس سایہ کو کہتے ہیں جو دوپہر سے پہلے ہوتا ہے اور فئی اسے کہتے ہیں جو دوپہر کے بعد ہوتا ہے اور رؤبہ بن عجاج نے کہا کہ ہر وہ سایہ جو سورج ڈھلنے کے بعد ہو وہ ظل اور فئی ہے اور جو سورج ڈھلنے سے پہلے ہو وہ ظل ہے اور یہی مبنی ہے اس قول کا کہ سورج ظل کو منسوخ کر دیتا ہے اور فئی سورج کو یعنی اسے خطِ استواء سے زائل کر دیتا ہے اور ظل کی جمع ظلال اور اظلہ اور ظلل ہے۔ انتہی۔

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض علماء کے نزدیک سایہ قبل الزوال "ظل" ہے اور بعد الزوال "فئی" ہے اور بعض کا قول ہے کہ قبل الزوال "ظل" ہے اور بعد الزوال "ظل" اور "فئی" ہے، اور پہلے قول پر "ظل" اور "فئی" متباینین ہیں اور دوسرے قول پر "ظل" عام اور "فئی" خاص! تباین کا قول اکثر علماء نے کیا ہے، چنانچہ تفسیر خازن ومعالم جلد ۴، ص ۷۷ اور کتاب التعریفات للسید الشریف الجرجانی، مطبوعہ مصر ص ۴۳ اور جمہرۃ اللغۃ، مطبوعہ دائرۃ المعارف، جلد اول حیدرآباد دکن کی عبارت سے واضح ہے۔

---

[1] مصباح المنیر، مطبوعہ مصر، جلد دوم، ص ۳۶۳

امر سوم

موسم گرما

ناظرین کرام کو یاد ہوگا کہ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکر رنجی کا واقعہ حج الوداع سے واپسی کے موقعہ پر اثناء سفر پیش آیا تھا، چنانچہ مسند امام احمد میں عفان راوی کا قول جزم کے ساتھ موجود ہے کہ ولا اظنیہ الا قال فی حجۃ الوداع۔ (مسند امام احمد، جلد ۶، ص ۱۳۲) اور یہ شکر رنجی ذی الحجہ کے آخری ایام سے لے کر ربیع الاوّل شریف کے چند دنوں تک رہی، جیسا کہ مسند امام احمد اور مجمع الزوائد کی حدیثوں میں اس کی تصریح موجود ہے اور مجمع الزوائد میں بغیر کسی شک کے ایامامن شھر ربیع الاوّل کے الفاظ وارد ہیں، دیکھئے مجمع الزوائد، جلد چہارم، طبع قاہرہ، ص ۳۲۳ (ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث لاہور شمارہ ۸ رجنوری، ۱۹۶۰ء ص ۴) از مکتوب مولانا ابوداؤد محمد صادق صاحب گوجرانوالہ۔

بالآخر ایک دن حضرت زینب نے نصف النہار کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظل کریم کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو یہ دن یقیناً ربیع الاوّل ہی کے دنوں میں سے ہے اور کسی پڑھے لکھے مسلمان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ حجۃ الوداع ۱۰ھ میں ہوا، اور ۱۱ھ میں ۱۲ ربیع الاوّل شریف مطابق ۱۱ رجون کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، دیکھئے رحمۃ للعالمین مؤلفہ قاضی سلیمان منصور پوری، جلد ۲، ص ۲۷۴ اور تاریخ اسلام مؤلفہ شوق امرتسری ص ۳۲۱۔

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ بروز دوشنبہ مطابق ۱۱ رجون ۶۳۲ء بوقت چاشت واقع ہوئی، اس وقت آپ کی عمر تریسٹھ برس اور پانچ یوم کی تھی''۔[1]

اس حساب سے ثابت ہوگیا کہ جس دن حضرت زینب حضور علیہ السلام کے ظل کریم کو دیکھنے کا واقعہ بیان فرما رہی ہیں وہ جون کے مہینہ کا دن تھا جو خاص گرمی کا موسم ہے۔

---

[1] تاریخ اسلام، ص ۳۲۱، رحمۃ للعالمین، جلد ۲، ص ۷۲

ایک شبہ کا ازالہ

اگر اس مقام پر یہ شبہ وارد کیا جائے کہ علامہ شبلی نعمانی کے بیان سے حضور ﷺ کی تاریخ وصال یکم ربیع الاول مطابق ۳۱ رمئی ظاہر ہوتی ہے تو میں جواباً عرض کروں گا کہ اول تو ۳۱ رمئی بھی گرمی کا زمانہ ہے دوسرے یہ کہ اس قول پر مخالفین کی پیش کردہ دونوں حدیثیں ساقط الاعتبار ہو جائیں گی کیونکہ جب یکم ربیع الاول کو حضور ﷺ کا وصال ہو گیا تو اسی ماہ ربیع الاول کے چند دنوں تک لشکر ریخی باقی رہنا اور اس کے بعد ایک دن حضرت زینب کا ظل رسول دیکھنا سب کچھ غلط ہو جائے گا، لہذا علامہ شبلی کا قول کسی طرح پیش کردہ حدیثوں کے مطابق نہیں ہو سکتا، اگر شبلی کے قول کو مانا جائے تو حدیثوں کو چھوڑنا پڑے گا اور حدیثوں کو تسلیم کیا جائے تو شبلی صاحب کے قول سے کنارہ کشی کرنا ہوگی۔

امر چہارم

موسم گرما میں دوپہر کو سایہ نہیں ہوتا

گرمی کے زمانہ میں دوپہر کے وقت کسی جانب کو انسان کا جھکا ہوا سایہ نہ ہونا ایسا روشن اور ظاہر امر ہے جس پر کسی دلیل کی حاجت نہیں لیکن اس کے باوجود آخری اتمام حجت کے لئے ہم اپنے اس بیّن دعویٰ پر بھی دلیل قائم کئے دیتے ہیں تاکہ منکرین کے لئے کوئی عذر بارد باقی نہ رہے، دیکھئے منجد میں ہے:

۱۔ ومشيت على ظلي او انتعلت ظلي اي مشيت وقد انتصف النهار فلم يكن لي ظل ''۔[۱]

ترجمہ: ''مشیت علیٰ ظلی'' اور ''انتعلت ظلی'' کے معنی ہیں کہ میں چلا اس حال میں کہ نصف النہار کا وقت ہو گیا تھا، اس لئے میرا سایہ نہیں تھا''۔

۱۔ المنجد طبع قاہرہ، ص ۴۹۹

۲۔ مصباح اللغات میں ہے :

"ومشيت على ظلي او انتعلت ظلي" [1]

ترجمہ: میں چلا اس حال میں کہ دو پہر ہو چکی تھی اس لئے میرا سایہ نہ تھا۔

۳۔ اقرب الموارد میں ہے :

"(مشيت على ظلي وانتعلت في ظلي) اذا مشيت وقد انتصف النهار في ايقظ فلم يكن لي ظل" [2]

ترجمہ: "مشیت علی ظلی" اور "انتعلت فی ظلی" اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی شخص موسم گرما میں دو پہر کے وقت چلے تو کہتا ہے کہ چونکہ میں دو پہر کے وقت چلا اس لئے میرا سایہ نہ تھا۔ انتہی

۴۔ کرمانی شرح بخاری میں ہے :

"قائم الظهيرة اي نصف النهار وهو استواء حالة الشمس وسمي قائما لان الظل لا يظهر حينئذٍ فكانه قائم واقف"۔ [3]

ترجمہ: قائم الظہیرہ نصف النہار کو کہتے ہیں اور وہ سورج کے خط استواء پر ہونے کی حالت ہے دو پہر کو قائم اس لئے کہتے ہیں کہ اس وقت سایہ ظاہر نہیں ہوتا، تو گویا وہ ایک جگہ کھڑا اور ٹھہرا ہوا ہے۔ انتہی۔

ناظرین کرام بیان سابق میں پڑھ چکے ہیں کہ سایہ دو قسم کا ہے، ایک ظل اور دوسرا فئی، ظل وہ سایہ ہے جو اول نہار میں قبل الزوال ہوتا ہے اور فئی وہ سایہ ہے جو بعد الزوال

---

[1] مصباح اللغات ص ۵۰۱

[2] اقرب الموارد، جلد ۲ ص ۷۳۱، طبع قاہرہ

[3] کرمانی حاشیہ بخاری، جلد اول ص ۳۱۰ مطبوعہ اصح المطابع

غروب تک رہتا ہے۔

نصف النہار کا وقت چونکہ درمیان میں ہوتا ہے اس لئے اس وقت نہ ظل ہوتا ہے نہ فیئ بلکہ چلنے والے کا سایہ اس وقت اس کے پاؤں میں ہوتا ہے، جسے وہ پامال کرتا ہوا چلتا ہے اور گرمی کے دنوں میں کسی جانب جھکے ہوئے سائے کا وجود نہیں ہوتا، لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی آنے والے کے جسم سے پہلے اس کا سایہ نظر آجائے۔

ایسی صورت میں ماہنامہ تجلی، دیوبند کا یہ لکھنا کہ ام المومنین فرماتی ہیں :

''پس ایک دن دوپہر کے وقت دفعۃً رسول اللہ تشریف لے آئے اور میں نے پہلے ان کا سایہ ہی دیکھا''۔[1]

قطعاً غلط اور باطل محض ہے، بلکہ اس واقعہ کی دونوں روایتوں میں لفظ ظل بمعنی شخص ہے جیسا کہ ہم کتب لغت وتفاسیر سے ابھی وہ عبارت نقل کر چکے ہیں، اور ام المومنین حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اس قول کے معنی یہ ہیں کہ ''میں ایک دن دوپہر کے وقت بیٹھی ہوئی تھی کہ ناگہاں میں نے حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات مقدسہ کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا''۔

الحمد للہ! مسند امام احمد اور مجمع الزوائد کی دونوں حدیثوں پر کلام ختم ہوا اور دلائل کی روشنی میں حق واضح ہوگیا، اہل علم منصف مزاج حضرات سے امید ہے کہ وہ ہماری اس تحقیق اور محنت کی قدر کریں گے، اور جن کے دلوں میں زیغ ہے ان سے انصاف کی کوئی امید نہیں، حق واضح کردینا ہمارا فرض تھا جس سے ہم سبکدوش ہوگئے۔ وللہ الحجۃ السامیہ۔[2]

---

1. ماہنامہ تجلی، دیوبند، شمارہ بابت فروری، مارچ ۱۹۵۹ء، ص ۱۸، کالم ۲ کے نیچے
2. ماہنامہ السعید ملتان، شمارہ اپریل مئی ۱۹۶۰ء

حدیث نمبر (۳۱)

سایہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

عن انس بن مالك رضي الله تعالىٰ عنه قال صلي بنا رسول الله صلي الله عليه وسلم ذات يوم صلوٰة الصبح ثم مديده ثم اخرها فلما سلم قيل له يارسول الله لقد صنعت في صلوٰتك شيئا لم تصنعه في غيرها قال اني رايٰت الجنة فرايت فيها دالية قطو فها دانيةٌ حبها كالدباء فاردتان اتناول منها فاوحي الي ان استاخر فاستاخرت ثم رايت النار فيما بيني وبينكم حتي لقد رايت ظلي وظلكم فاومأت اليكم ان استاخروا فاوحي الي اقرهم فانك اسلمت واسلمو وهاجرت وهاجروا وجاهدت وجاهدوا فلم ارلي عليكم فضلاً الا بالنبوة انتهي۔[1]

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک صبح کی نماز پڑھائی، پھر حضور نے اپنا مبارک ہاتھ بڑھایا پھر اسے پیچھے ہٹالیا، سلام پھیرنے کے بعد حضور سے عرض کیا گیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اس نماز میں آپ نے وہ کام کیا جو اس کے علاوہ کسی دوسری نماز میں آپ نے کبھی نہیں کیا تھا (یعنی ہاتھ بڑھا کر پیچھے ہٹانا) حضور علیہ السلام نے فرمایا میں نے جنت دیکھی اور اس میں انگور کی بیل کے خوشے دیکھے جو بہت قریب تھے، ان کے دانے کدو کی طرح (بڑے) تھے، میں نے ان سے لینا چاہا تو میری طرف وحی کی گئی کہ محبوب آپ آگے نہ بڑھیں، چنانچہ

---

[1] حادی الارواح مطبوعہ مصر ص ۴۲ - مطبوعہ دار عالم الفوائد، مکہ مکرمہ ۱۴۲۸ھ ص ۱۴۴ فی بیان حدود الجنۃ الاولیٰ

میں فوراً پیچھے ہٹ گیا، پھر میں نے اپنے اور تمہارے درمیان نار کو دیکھا یہاں تک کہ میں نے اپنے ظل اور تمہارے ظل کو ملاحظہ کیا، (آگ اس قدر قریب تھی کہ) میں نے تمہیں پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا، پھر میری طرف وحی کی گئی کہ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ انہیں ان کی جگہ برقرار رہنے دیں۔ (آپ کی طرح ان کو بھی اس نار جہنم سے کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی) کیونکہ آپ بھی اسلام لائے اور یہ بھی اسلام لائے، آپ نے بھی ہجرت کی اور انہوں نے بھی ہجرت کی، آپ نے بھی جہاد کیا اور انہوں نے بھی جہاد کیا، (لہذا جس طرح آپ اس نار جہنم کی لپیٹ میں نہیں آسکتے اسی طرح آپ کے طفیل یہ بھی اس کی لپیٹ میں نہیں آسکیں گے)۔ (صحابہ کرام سے) حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے نبوت کے سوا تمہارے اوپر اپنے لئے اور کوئی فضیلت نہ دیکھی۔ (نبوت کے سوا کسی فضیلت کے نہ دیکھنے کا ارشاد محض تواضعاً ہے ورنہ فضیلت نبوت ایسی چیز ہے کہ تمام فضائل وکمالات اور جملہ محامد ومحاسن کو حاوی ہے۔ مترجم)

علامہ ابن قیم نے یہ حدیث حضور ﷺ کا سایہ ثابت کرنے کے لئے نہیں لکھی بلکہ دوزخ وجنت کا وجود ثابت کرنے کے لئے ارقام فرمائی ہے، اور یہ بتایا ہے کہ دوزخ وجنت پیدا ہو چکی ہیں جس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی اس دیوار پر جو قبلہ کی جانب واقع ہوئی ہے فجر کی نماز میں جنت اور دوزخ دونوں کو دیکھا، صرف یہی نہیں بلکہ ان کی اشیاء اور جنتیوں اور دوزخیوں کو بھی ملاحظہ فرمایا، طبرانی میں حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا!

"ما رأيتم من شئي في الدنيا له لون. ولا نبئتم به في الجنة ولا في النار الا لقد صور لي من قبل هذا الجدار منذ صليت لكم صلوتي هذه فنظرت اليه مصورا في جدار المسجد"۔ انتهى۔[1]

[1] کنز العمال، جلد ۳، ص ۱۷۸

ترجمہ: تم نے دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی جس کا کوئی رنگ ہو اور نہ تمہیں جنت و دوزخ میں کسی چیز کے ہونے کی خبر دی گئی لیکن وہ سب چیزیں اور تمام دوزخی اور جنتی سب اس دیوار قبلہ کی سمت میں ظاہر کر دیئے گئے جس وقت سے میں نے تمہیں اپنی یہ نماز پڑھائی ہے تو میں نے ہر چیز کی صورت دیوار مسجد میں دیکھ لی۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوزخ و جنت کی ہر چیز کو دیکھ لیا تو اپنے آپ کو اور صحابہ کرام کو بھی یقیناً دیکھا، کیونکہ حضور اور آپ کے صحابہ کرام بھی تو جنتی ہیں، معلوم ہوا کہ یہاں بھی ظل کے معنی جسم کے تاریک سایہ کے نہیں بلکہ وہی "شخص" اور جسم کے معنی ہیں جو ہم پہلے ثابت کر آئے ہیں، اور رأیت ظلی وظلکم کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اپنے آپ کو اور تم سب کو دیکھا اور یہ بات کوئی تعجب انگیز نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ دنیا میں ہوتے ہوئے جنت میں کیسے موجود تھے؟ دیکھئے شب معراج جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے آسمان پر پہنچے اور آدم علیہ السلام سے ملاقات کی اور ان کے دائیں بائیں ان کی نیک اور بد اولاد کو دیکھا تو نیکوں میں حضور علیہ السلام نے اپنے آپ کو بھی دیکھا، امام شعرانی فرماتے ہیں:

"ورأى رسول الله ﷺ صورته هناك في اشخاص السعداء فشكر الله تعالىٰ وعلم عند ذلك كيف يكون الانسان في مكانين"۔[1]

ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نیکوں کی ذاتوں میں اپنی صورت مبارکہ بھی دیکھی اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عین الیقین کے ساتھ جان لیا کہ ایک انسان کس طرح دو جگہوں میں ہوتا ہے۔

لہٰذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، جس طرح حضور علیہ السلام آسمان اول پر اشخاص سعداء سے باہر بھی تھے اور ان کے اندر بھی اپنے آپ کو ملاحظہ فرما رہے تھے، اسی طرح اس موقعہ پر

---

[1] الیواقیت والجواہر، جلد ۲ ص ۳۴، مطبوعہ مصر

بھی حضور اور آپ کے صحابہ جنت سے باہر بھی تھے اور جنت میں بھی حضور اپنے ساتھ اپنے صحابہ کو دیکھ رہے تھے۔

معلوم ہوا کہ "ظلی وظلکم" سے حضور علیہ السلام اور صحابہ کرام کا جسمانی سایہ مراد نہیں بلکہ ذوات قدسیہ مراد ہیں اور حدیث کے معنی وہی ہیں جو ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ میں نے جنت میں اپنے آپ کو بھی دیکھا اور تمہیں بھی دیکھا۔

مخالفین کی بے بصری پر حیرت

کمالات رسالت کے منکرین کی بے بصری موجب حیرت ہے، ان لوگوں نے ظلی وظلکم کی حدیث سے حضور ﷺ کا جسمانی سایہ ثابت کرتے وقت اتنی بات بھی نہ سوچی کہ اگر اس حدیث سے حضور کا سایہ ثابت ہوا تو یا مسجد نبوی میں ہوگا یا دوزخ میں یا جنت میں، کیونکہ یہ واقعہ عین نماز فجر کا ہے جس وقت حضور اور صحابہ کرام مسجد نبوی میں تھے، ذرا غور کرنے سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ تینوں جگہوں میں سے ایک جگہ پر بھی اس وقت سایہ کا وجود ممکن نہ تھا، کیونکہ نماز فجر کا وقت آخر شب کی ہلکی سیاہی کا وقت ہوتا ہے، اس وقت کسی سایہ دار چیز کا سایہ ظاہر نہیں ہوتا، اور جنت میں بھی کسی جنتی کا سایہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ جنت میں ہر وقت ایسا سایہ رہتا ہے جیسے طلوع فجر اور طلوع آفتاب کے درمیانی وقت میں سایہ ہوتا ہے اور سایہ میں کسی کا سایہ نظر نہیں آتا، اس لئے جنت میں بھی سایہ دیکھنا متصور نہیں۔ اب تیسری جگہ دوزخ ہے، تو مجھے امید نہیں کہ مخالفین دوزخ میں حضور کا سایہ مانتے ہوں اور اگر خلاف امید ان کا مسلک فی الواقع یہی ہے تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ سایہ ہمیشہ روشنی میں ہوتا ہے اور دوزخ کی آگ دنیاوی آگ کی طرح روشن نہیں بلکہ وہ سیاہ اور تاریک ہے۔[1]

اور ظاہر ہے کہ سیاہی اور تاریکی میں سایہ نہیں ہوتا، اب مخالفین بتائیں کہ "حتی رأیت ظلی وظلکم" کے معنی جو آپ کرتے ہیں کہ "میں نے اپنا اور تمہارا سایہ دیکھا" یہ معنی کیسے

[1] ترمذی، جلد ۲ ص ۸۳، مشکوٰۃ، جلد ۲ ص ۵۰۳۔

درست ہو سکتے ہیں۔

اگرچہ میرا یہ بیان محتاج دلیل نہیں لیکن ہر قسم کا تردد زائل کرنے کے لئے دلائل پیش کرتا ہوں، اور ساتھ ہی بعض شکوک وشبہات کے جوابات بھی عرض کروں گا تاکہ اتمام حجت کا حق ادا ہو جائے۔

دنیا والوں کے عرف میں سایہ اسے کہتے ہیں جو سورج کی گرمی اور تکلیف سے بچائے لیکن جنت کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے "لا یرون فیھا شمسا ولا زمھریرا" انہ اس میں سورج کی گرمی معلوم ہوگی نہ زمہریر کی سردی۔

جب وہاں سورج کی گرمی اور اس کی تکلیف واذیت نہیں تو اس سے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جس کے لئے سایہ کی ضرورت ہو۔

ہاں! البتہ اس میں ایسا سایہ ضرور ہے جو ہر طرف پھیلا ہوا ہے، جس میں کسی سایہ دار چیز کا سایہ نظر نہیں آتا، دیکھئے سورہ واقعہ میں "وظل ممدود" یعنی جنتی جنت میں ایسے سایہ میں ہوں گے جو ہر طرف پھیلا ہوا، دائم اور غیر منقطع ہوگا، تفسیر مدارک میں اسی آیت کے تحت ہے:

(وظل ممدود) ممتد منبسط کظل مابین طلوع الفجر وطلوع الشمس۔ انتھی۔[1]

یعنی جنتی جنت کے ایسے سایہ میں ہوں گے جو لمبا اور ہر طرف پھیلا ہوا ہوگا، جیسے صبح صادق اور طلوع آفتاب کے درمیانی وقت میں طویل، بڑا اور چاروں طرف پھیلا ہوا خوشگوار سایہ ہوتا ہے۔

[1] تفسیر مدارک، جلد ۴ ص ۱۶۳ مطبوعہ مصر

تفسیر نیشاپوری میں ہے:

" (وظل ممدود) اي ممتد منبسط کظل الطلوع والغروب لا يتقلص ويحتمل ان يراد انه دائم باق لا يزول ولا تنسخه الشمس والعرب تقول لكل شئي طويل لا ينقطع انه ممدود " انتهی۔[۱]

ترجمہ: اور ظل ممدود سے مراد یہ ہے کہ جنت کا سایہ دراز اور ہر طرف پھیلا ہوا ہوگا جیسے طلوع اور غروب کے وقت ہر طرف پھیلا ہوا ہلکا، دراز اور خوشگوار سایہ ہوتا ہے، وہ سایہ ایسا ہوگا کہ نہ سمٹے گا نہ سکڑے گا اور اس امر کا بھی احتمال ہے کہ "ظل ممدود" سے یہ مراد لیا جائے کہ جنت کا سایہ ایسا دائم و باقی ہے جو کبھی زائل نہ ہو، اور سورج بھی اسے منسوخ نہ کرے گا (کیونکہ وہاں سورج کا وجود ہی نہ ہوگا) اور اہل عرب ہر ایسی طویل چیز کو ممدود کہتے ہیں جو کبھی منقطع نہ ہو۔ انتہی۔

قرآن کریم کی ان دونوں آیتوں اور مفسرین کی تصریحات کی روشنی میں ثابت ہوگیا کہ جنت میں ہر طرف طویل و دائم اور غیر منقطع سایہ پھیلا ہوا ہے اور سایہ کی جگہ میں کسی کا سایہ نظر نہیں آتا، لہذا اچھی طرح واضح ہوگیا کہ "رأيت ظلي وظلكم" کے یہ معنی ہرگز درست نہیں ہو سکتے کہ "میں نے (جنت میں) اپنا اور تمہارا سایہ دیکھا"۔

ایک اشکال اور اس کا حل:

اس مقام پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب نہایت ضروری ہے، وہ یہ کہ قرآن و حدیث میں کئی جگہ جنت کے درختوں کا سایہ مذکور ہے اگر سایہ کی جگہ کسی چیز کا سایہ نہیں ہو سکتا تو جنت میں وہاں کے درختوں کا سایہ کیسے ہوگا؟

---

[۱] تفسیر نیشاپوری، پ ۲۷، ص ۸۹، مطبوعہ مصر

اس کا جواب امام فخر الدین رازی، علامہ ابو سعود اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے دیا ہے جو ان ہی کی عبارات میں ہم نقل کر کے ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر کبیر میں آیہ مبارکہ "ودانية عليهم ظلالها" کے تحت ارقام فرماتے ہیں:

"(السوال الثاني) الظل انما يوجد حيث توجد الشمس فان كان لا شمس في الجنة فكيف يحصل الظل هناك (والجواب) المراد ان اشجار الجنة تكون بحيث لوكان هناك شمس لكانت تلك الاشجار مظلة منها"۔ انتهي[1]

ترجمہ: آیت میں دوسرا سوال یہ ہے کہ سایہ وہیں پایا جاتا ہے جہاں سورج ہو، جنت میں جب سورج نہیں تو درختوں کا سایہ کیسے ہوگا؟ (الجواب) مراد یہ ہے کہ جنت کے درخت اس حیثیت سے ہوں گے کہ اگر وہاں سورج ہو تو وہ اس کی وجہ سے سایہ دار ہو جائیں۔ انتہی۔

۲۔ علامہ ابو سعود اسی آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں:

"علي معني انه لوكان هناك شمس موذية لكانت اشجارها مظلة عليهم مع انه لا شمس ثمة ولا قمر"۔ انتهي۔[2]

ترجمہ: ("جنت کے درختوں کے سائے جنتیوں پر جھکے ہوں گے") یہ کلام اس معنی پر محمول ہے کہ اگر وہاں دھوپ کی تکلیف ہو تو وہ درخت جنتیوں پر اپنے سائے ڈالنے لگیں باوجود اس کے کہ وہاں نہ سورج ہے نہ چاند (جس کی وجہ سے سایہ ہو)۔ انتہی۔

---

[1] تفسیر کبیر، جلد ۸، ص ۳۹۶، مطبوعہ مصر

[2] تفسیر ابو سعود بہامش کبیر، جلد ۸، ص ۳۹۶، مطبوعہ مصر

۳۔ حافظ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری میں فرماتے ہیں :

"(في ظلها) اي في نعيمها وراحها ومنه قولهم "عيش ظليل" وقيل معني ظلها ناحيتها واشار بذلك الي امتدادها ومنه قولهم انا في ظلك اي نا حيتك قال القرطبي والمحوج الي هذا لتاويل ان الظل في عرف اهل الدنيا مايقي من حرالشمس واذا ها وليس في الجنة شمس ولا اذي"۔ انتهي۔

ترجمہ: (" حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، جنت میں ایک درخت ہے جس کے ظل میں کوئی شخص سوار ہو کر سو برس تک چلتا رہے تو اسے قطع نہ کر سکے۔ اس حدیث میں") "فی ظلہا" کے معنی ہیں فی نعیمہا و راحہا (یعنی اس کی نعمتوں اور راحتوں میں) اور اسی معنی سے اہل عرب کا یہ قول ماخوذ ہے "عیش ظلیل" (نعمت و راحت کی زندگانی) اور بعض نے کہا کہ یہاں "ظل" "بمعنی" "ناحیۃ" ہے (یعنی گردونواح) حضور ﷺ نے اس کے ساتھ اس درخت کی درازی کی طرف اشارہ فرمایا یعنی وہ درخت اتنا بڑا اور لمبا ہوگا کہ اس کے گردونواح کی مسافت سو برس تک بھی کسی سوار سے طے نہ ہو سکے گی، اور اسی معنی سے اہل عرب کا یہ قول ماخوذ ہے "انا فی ظلک" یعنی میں تیرے گردونواح (قرب وجوار، حفظ وامان) میں ہوں، قرطبی نے کہا اس تاویل کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ اہل دنیا کے عرف میں ظل وہ ہے جس کے ذریعہ سورج کی گرمی اور اس کی تکلیف سے بچاؤ حاصل کیا جائے، جنت میں نہ سورج ہوگا نہ اس کی تکلیف (اس لئے وہاں اس سے بچاؤ کے لئے کسی چیز کے سایہ کی ضرورت ہی نہیں)۔ انتہی

الحمد للہ! جنت میں کسی سایہ دار چیز کا سایہ نہ ہونا آفتاب سے زیادہ روشن ہوگیا، اب ہمارے اس بیان کو بیان سابق سے ملا کر نتیجہ ذہن نشین کر لیجیے کہ حضور ﷺ نے جو "حتی

رأیت ظلی وظلکم" فرمایا یہ اس واقعہ کا بیان ہے جو مدینہ منورہ میں مسجد نبوی میں عین نماز فجر کے درمیان پیش آیا تھا، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حقیقی جنت و دوزخ کا پیش کیا جانا مذکور ہے، اس وقت حضور اور صحابہ مسجد نبوی میں تھے اور دوزخ و جنت حضور کے پیش نظر تھے، ظاہر ہے کہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو چیز دیکھی وہ مسجد نبوی میں ہوگی یا دوزخ میں، یا جنت میں، اس کے علاوہ اور کسی جگہ کچھ دیکھنا متصور نہیں، اگر حضور نے اپنا اور صحابہ کا سایہ مسجد نبوی میں دیکھا تو یہ ممکن نہیں، اس لئے کہ وہ فجر کا وقت تھا اس وقت کسی سایہ دار چیز کا سایہ ظاہر نہیں ہوتا۔

اور اگر بفرض محال مان بھی لیا جائے کہ اس وقت سایہ ظاہر تھا تو اسے تمام حاضرین دیکھ رہے ہوں گے حالانکہ یہ دیکھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاص تھا جیسا کہ الفاظ حدیث "حتی رأیت ظلی وظلکم" (یہاں تک کہ میں نے اپنا اور تمہارا ظل دیکھا) میں لفظ حتیٰ (یہاں تک) سے ظاہر ہے، کیونکہ حتیٰ بیان غایت کے لئے آتا ہے اور یہ غایت جنت و دوزخ دیکھنے کی ہے، جس طرح مُغیا (جنت و دوزخ کا دیکھنا) حضور کے ساتھ خاص ہے اسی طرح اس کی غایت (ظلی وظلکم کا دیکھنا) بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مختص ہوگا، لہذا ثابت ہوگیا کہ نماز فجر کے وقت کسی کا سایہ نہ تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا اور صحابہ کا ظل مسجد نبوی میں ہرگز نہیں دیکھا۔

اس کے بعد دو چیزیں رہیں دوزخ اور جنت، بیان سابق میں ہم دلائل سے ثابت کر چکے ہیں کہ سایہ روشنی میں ظاہر ہوتا ہے اور جہنم سیاہ اور تاریک ہے اس لئے اس میں بھی سایہ ظاہر نہیں ہوسکتا، اب رہی جنت تو اس کے متعلق بھی ہم نے آیات قرآنیہ وعبارات مفسرین سے ثابت کر دیا کہ جنت میں کسی سایہ دار چیز کا سایہ ظاہر نہیں ہوتا۔ اب بتائیے کہ اگر ظلی وظلکم میں لفظ ظل کے معنی سایہ ہیں تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہاں دیکھا؟ لہذا تسلیم کر لیجئے کہ یہاں سایہ کے معنی مراد نہیں بلکہ وہی "شخص" کے معنی مراد ہیں جو اس سے قبل دلائل

وبراہین کی روشنی میں ہم ثابت کر چکے ہیں اور حدیث کے واضح معنی یہ ہیں کہ میں نے دوزخ وجنت کو دیکھا یہاں تک کہ (جنت میں) اپنے اور تمہارے اشخاص کریمہ کو بھی دیکھا، غایت مافی الباب یہ کہ جنت ودوزخ کو ان کے وجود مثالی پر محمول کر دیا جائے تب بھی "ظلی وظلکم" سے اشخاص مثالیہ مراد ہوں گے، جسمانی تاریک سایہ اس تقدیر پر بھی ثابت نہیں ہوسکتا۔ واللہ الحجۃ البالغہ

انصاف کیجئے

یہ تینوں حدیثیں جو مخالفین نے حضور سید عالم نور مجسم ﷺ کا جسمانی سایہ ثابت کرنے کے لئے پیش کی ہیں اگر واقعی ان کے دعویٰ کی مثبت ہوتیں تو وہ جلیل القدر علماء محدثین ومفسرین جن کے اسماء گرامی ہم عرض کر چکے ہیں کس طرح حضور کے سایہ کی نفی کرتے، شاید آپ کہہ دیں کہ یہ حدیثیں ان سے مخفی رہیں، تو میں عرض کروں گا کہ یہ امر ہرگز قابل تسلیم نہیں کہ ایسے ماہرین حدیث ائمہ دین سے آپ کی پیش کردہ حدیثیں مخفی رہی ہوں، دیکھئے آپ کی پیش کردہ حدیث "حتی رأیت ظلی وظلکم" کو امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب خصائص کبریٰ میں لکھا، مگر اس کے باوجود اسی خصائص کبریٰ حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کا باب منعقد کیا اور روایات وعبارات علماء سے اپنے دعویٰ کو ثابت ومؤید کیا اور حضور ﷺ کے جسمانی سایہ سے پاک ہونے کو آفتاب سے زیادہ روشن کر دکھایا۔ معلوم ہوا کہ مخالفین کی پیش کردہ احادیث سے یہ ائمہ حدیث بے خبر نہ تھے۔

پھر یہ کہ آج سے پہلے کسی نے ان حدیثوں سے حضور علیہ السلام کا سایہ ثابت نہیں کیا، حتیٰ کہ علامہ ابن قیم کو بھی یہ جرأت نہ ہوئی، حالانکہ ان سے پہلے اکابر محدثین متقدمین کے وہ تمام ارشادات ان کے سامنے موجود تھے، جن میں حضور ﷺ کے نور خالص ہونے کی وجہ سے حضور کے سایہ نہ ہونے پر استشہاد کیا گیا ہے، جیسے حکیم ترمذی (متوفی ۲۵۵ھ)، عبداللہ بن

مبارک (متوفی ۱۸۱ھ)، امام راغب اصفہانی (متوفی ۵۰۲ھ)، حافظ رزین محدث (متوفی ۵۲۰ھ)، علامہ ابن سبع (متوفی)، قاضی عیاض (متوفی ۵۴۴ھ)، علامہ ابن جوزی محدث (متوفی ۵۹۷ھ)، مولانا جلال الدین رومی (متوفی ۶۷۰ھ)، علامہ احمد نسفی صاحب تفسیر مدارک (متوفی ۷۰۱ھ)، یہ سب علماء اعلام علامہ ابن قیم (متوفی ۷۵۲ھ) سے متقدم ہیں اور ان سب نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسمانی سایہ کی نفی فرمائی ہے لیکن علامہ ابن قیم نے حدیث "ظلی وظلکم" سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جسمانی سایہ ثابت کر کے ان حضرات کا رد نہیں کیا۔

علی ہذا القیاس علامہ ابن قیم کے بعد ہونے والے اجلہ محدثین مثلاً امام جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ)، امام قسطلانی (متوفی ۹۲۳ھ)، علامہ حسین بن محمد دیار بکری (متوفی ۹۶۶ھ)، امام ابن حجر مکی (متوفی ۹۷۳ھ)، علامہ شہاب الدین خفاجی (متوفی ۱۰۶۹ھ)، امام زرقانی (متوفی ۱۱۲۲ھ)، علامہ سلیمان جمل، علامہ ابراہیم بیجوری، علامہ برہان الدین حلبی وغیرہم نے ابن قیم کی کتاب حادی الارواح میں حدیث "ظلی وظلکم" دیکھنے کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسمانی سایہ کا قول نہیں کیا، اور بدستور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نور اور بے سایہ مانتے رہے، اور اسی مسلک کا بیان اپنی تصانیف جلیلہ میں کرتے رہے جیسا کہ ہم ان کے بیانات سابقاً نقل کر چکے ہیں۔[1]

---

[1] ماہنامہ "السعید" ملتان، شمارہ اپریل، مئی ۱۹۶۰ء

حدیث نمبر (۳۲)

آٹھ تراویوں کے متعلق حدیث

''عن جابر رضي الله تعالىٰ عنه قال صلي بنا رسول الله ﷺ ليلةً في رمضان ثماني ركعات، والوتر'' [۱]

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں رمضان میں آٹھ رکعتیں پڑھائیں اور وتر۔

اگر بالفرض اس حدیث کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو اس سے صرف اتنا ثابت ہوگا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آٹھ رکعت بیان فرمائیں۔ لیکن آٹھ کے عدد پر حصر کا قول نہیں کیا جو آٹھ سے زیادہ عدد کے منافی اور معارض ہو اور عدم حصر کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت جابر بعد میں آئے ہوں اور حضور ﷺ ان کے آنے سے قبل زائد رکعات پڑھ چکے ہوں، نیز اس امر کا بھی احتمال ہے کہ حضور ﷺ نے پہلے یا بعد میں آٹھ کے علاوہ زائد رکعات پڑھی ہوں، جن کی نفی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے قول سے ثابت نہیں ہوتی۔

علاوہ ازیں حضرت جابر رضی اللہ عنہ صرف ایک رات کا واقعہ اور وہ بھی اپنے علم کے مطابق بیان کررہے ہیں، اس میں بقیہ دو راتوں میں بیس کے عدد رکعات تراویح کی نفی اس حدیث سے کہاں ثابت ہوئی۔

اس کے بعد عرض ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے، کسی محدث نے اس کو صحیح نہیں کہا، اس کی سند میں عیسیٰ بن جاریہ ہے، جس کے متعلق میزان الاعتدال میں ہے:

''قال ابن معين: عنده مناكير، وقال النسائي: منكر الحديث، وجاء عنه، متروك وقال ابو زرعة: لا بأس به''

---

[۱] امام شمس الدین ذہبی، میزان الاعتدال، جلد ۳، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت ص ۳۱۱

مگر ابوزرعہ کا " لاباس بہ " کہنا ابن معین اور نسائی کی جرح شدید کے مقابلہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتا۔

رہا یہ شبہ کہ علامہ ذہبی نے اس حدیث کو وسط کہا ہے، ہرگز اس حدیث کی صحت کی دلیل نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ وسط کے معنی دنیا کی کسی لغت یا اصطلاح میں صحیح نہیں، وسط کے معنی ہیں درمیانی، اور اس میں کئی احتمال ہیں، صحیح، حسن، ضعیف، سب کا درمیانی مراد ہوسکتا ہے، لیکن عیسیٰ بن جاریہ کے حق میں خود علامہ ذہبی کا اسے منکر الحدیث ہونے کو نقل کرنا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ لفظ وسط سے مراد درمیانہ درجہ کی ضعیف ہے۔

اس مقام پر یہ کہنا کہ علامہ ابن حجر نے التزام کیا ہے کہ فتح الباری میں کوئی ایسی حدیث نہیں لائی جائے گی، جو صحیح یا حسن کے درجہ سے کم ہو، اور چونکہ یہ "حدیث جابر" فتح الباری میں موجود ہے اس لئے وہ صحیح نہیں تو حسن ضرور ہوگی، انتہائی ابلہ فریبی اور سخن پروری ہے۔

اتنی بات تو قابل قبول ہوسکتی ہے کہ فتح الباری کی اکثر و بیشتر روایات یا وہ احادیث جن کے راویوں پر ائمہ جرح وتعدیل کی جرح کتب معتبرہ میں مصرح نہیں صحیح یا حسن ہیں، لیکن محض اپنی ضد پوری کرنے کے لئے آنکھیں بند کر کے علی الاطلاق اس کی ہر روایت پر مہر تصدیق ثبت کر دینا اور ائمہ حدیث کی جرح شدید کے باوجود اس کی حدیث کو صحیح یا حسن قرار دینا کسی اہل علم کے نزدیک صحیح نہیں ہوسکتا۔

ابن حجر تو بخاری کے شارح ہیں، خود امام بخاری ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے التزام کیا ہے کہ صحیح بخاری میں سوائے صحیح حدیث کے کوئی غیر صحیح روایت داخل نہ کروں گا، لیکن اس کے باوجود اس میں بھی بعض ایسی روایات موجود ہیں جو صحیح نہیں، اگرچہ ان کا وجود نادر ہے، یہی وجہ ہے کہ شارحین کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی تاویل کرنی پڑی، دیکھئے مقدمہ فتح الباری جلد اول ص ۱۳ پر حافظ ابن حجر نے علامہ نووی کا کلام نقل کیا ہے۔

" وعلی ھذا فیحمل قولہ ما ادخلت في الجامع الا ما صح اي

مماسقت اسنادہ واللہ تعالیٰ اعلم ''[۱]

(یعنی اس تقدیر پر امام بخاری کا یہ قول کہ میں نے اپنی جامع صحیح بخاری میں صرف وہی حدیثیں داخل کی ہیں جو صحیح ہیں، اس امر پر محمول ہوگا کہ جن کی سند میں نے بیان کی ہے، علامہ نووی کا کلام ختم ہوا۔)

اس کے بعد متصلاً علامہ ابن حجر فرماتے ہیں :

''وقد تبین مما فصلنا بہ اقسام تعالیقہ انہ لا یفتقر الی ھذا الحمل وان جمیع ما فیہ صحیح باعتبار انہ کلہ مقبول لیس فیہ مایرد مطلقا الا النادر ''۔[۲]

(یعنی تعلیقات بخاری کی جو تفصیل ہم نے بیان کی ہے، اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوگئی کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے قول مذکور کو "مما سقت اسنادہ" پر محمول کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور یہ امر بھی واضح ہوگیا کہ بخاری کی تمام حدیثیں اس اعتبار سے صحیح ہیں کہ وہ سب مقبول ہیں، ان میں کوئی حدیث ایسی نہیں جسے مطلقاً رد کردیا جائے سوائے نادر (حدیثوں) کے۔

حیرت ہے کہ جو لوگ توثیق رواۃ پر صحت حدیث کو موقوف سمجھتے ہیں ان کے نزدیک حدیث جابر محض فتح الباری میں درج ہوجانے کی وجہ سے کیونکر صحیح ہوگئی، حالانکہ اس کے راوی پر اہل نقد ونظر ائمہ حدیث کی جرح شدید موجود ہے، جیسا کہ ہم نقل کرچکے ہیں، جس طرح ڈوبتا ہوا آدمی تنکے کا سہارا تلاش کرتا ہے، بالکل اسی طرح غیر مقلدین حدیث جابر کے فتح الباری میں آجانے کو دلیل صحت قرار دے رہے ہیں، بہر حال یہ قول صحت حدیث کے دلائل میں ایک شاندار اضافہ ہے۔[۳]

---

[۱] مقدمہ فتح الباری، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت ۱۳۷۹ھ، ص ۱۹

[۲] مقدمہ فتح الباری، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت ۱۳۷۹ھ، ص ۱۹، مطبوعہ دہلی ۱۳۰۲ھ، ص ۱۹

[۳] علامہ سید احمد سعید کاظمی، کتاب التراویح، مطبوعہ ملتان، ص ۳۵ تا ۳۸

حدیث نمبر (۳۳)

خوف الٰہی

" واللہ انی لاتقاکم للہ واخشاکم لہ "[۱]

(اللہ تعالیٰ کی قسم میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا اور خوف کرتا ہوں)

خوف الٰہی ایمان کا محافظ اور انسانیت کا نگہبان ہے، جس کی روشنی عہد رسالت سے لے کر آج تک مؤمنین، عارفین کے قلوب کو روشن کر رہی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

"واللہ انی لاتقاکم للہ واخشاکم لہ"۔

معرفت کے بغیر خوف نہیں ہو سکتا، جو شخص کسی کو پہچانتا نہیں وہ اس سے ڈرتا نہیں، چھوٹے بچے کے سامنے اگر خوبصورت زہریلا سانپ آجائے تو وہ اس کے ظاہر نقش ونگار کو دیکھ کر اسے پکڑنے کی کوشش کرے گا لیکن اس کے والدین خوفزدہ ہو کر بچے کو ہٹا لیں گے اور سانپ کو مارنے کی تدبیر سوچیں گے، بچہ اس سے محض اس لیے نہیں ڈرتا کہ اس کی معرفت سے محروم ہے، وہ یہ نہیں جانتا کہ سانپ کاٹ کھاتا ہے، لیکن اس کے والدین چونکہ سب کچھ جانتے ہیں اور سانپ کی پوری معرفت رکھتے ہیں، اس لئے اس سے ڈرتے اور خوف کھاتے ہیں۔

خوف اور قرب

جس طرح معرفت کے بغیر خوف نہیں ہوتا اسی طرح قرب کے بغیر بھی خوف پیدا نہیں ہوتا، بہت سی خوفناک چیزوں کو ہم اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں، لیکن جب ہم ان سے دور ہوتے ہیں تو ہمیں ان سے کوئی ڈر اور خوف نہیں ہوتا، البتہ جب وہ خوفناک چیزیں ہمارے قریب ہو جائیں تو ہم خوف زدہ ہوتے ہیں۔

---

[۱] مسلم شریف، کتاب الصیام، باب بیان أن القبلۃ، حدیث ۱۱۰۸

ابو عمر، دار الطیبہ، الریاض، ج ۱، ص 393

چونکہ خدا کا قرب اور اس کی معرفت دونوں ایک چیز ہیں، اس لئے جب کسی کو معرفت الہی ہوگی تو قرب الہی ضرور ہوگا، اس لئے ہمیں ماننا پڑے گا کہ عارفین ہی مقربین ہیں، جب قرب ومعرفت کی دونوں صفتیں انہیں حاصل ہوگئیں تو اب ان کے دلوں میں خدا کا خوف لازمی طور پر پیدا ہوگیا، اس لئے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے:

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء

(اللہ کے بندوں میں سے عارفین ہی اللہ سے ڈرتے ہیں)

یہ ڈر اور خوف ایسی نعمت عظمیٰ ہے کہ جب تک یہ نعمت میسر نہ ہو کوئی نعمت، نعمت نہیں ہوسکتی، گناہ سے بچنا خوف کے بغیر ممکن نہیں، عصمت وعفت کا راز اس میں مضمر ہے، اسی کی شب تار میں امید کی جھلک نظر آتی ہے، اسی خوف کے آنسوؤں کی جھڑی امید کے موتیوں کی لڑی کہلاتی ہے، اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے ہم کنز العمال، جلد اول ص ۲۶۷ سے ایک طویل حدیث کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

یحییٰ بن ایوب خزاعی فرماتے ہیں کہ سیدنا فاروق اعظم عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ایک عابد زاہد صالح نوجوان تھا، جو اکثر وبیشتر مسجد میں رہتا تھا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کی عبادت وریاضت وصالحیت کی وجہ سے اسے بہت پسند فرماتے تھے، اس کا باپ بوڑھا تھا، ایک مرتبہ وہ عشاء کی نماز سے فارغ ہوکر اپنے باپ کی طرف جارہا تھا، اس کا راستہ ایک ایسی عورت کے دروازہ کی طرف سے تھا جو اس پر مفتون اور فریفتہ تھی، اس عورت کا معمول تھا کہ وہ اس نوجوان کے راستہ میں آکر کھڑی ہوجاتی تھی، اس رات جب وہ نوجوان راستہ سے گزرا تو حسب معمول وہ عورت برسر راہ آکھڑی ہوئی اور اسے ورغلانے لگی، یہاں تک کہ وہ نوجون اس کے پیچھے ہولیا، جب اس کے دروازہ تک پہنچا تو وہ عورت اپنے دروازہ میں داخل ہوگئی، یہ نوجوان جب داخل ہونے لگا تو اسے فوراً اللہ یاد آگیا، اللہ تعالیٰ کے یاد آتے ہی اس کے دل کے حجاب ظلمت اور پردہ غفلت دور ہوگیا اور یہ

آیت اس کی زبان پر جاری ہوگئی :

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ۔ (سورۃ الاعراف، آیت ۲۰۱)

یعنی بے شک پرہیزگاروں کو جب کوئی شیطانی خیال چھو جاتا ہے تو وہ فوراً ہوشیار ہو جاتے ہیں اور پردۂ غفلت ان کی آنکھوں سے دُور ہو جاتا ہے اور وہ اسی وقت پاکیزگی اور صواب کی راہوں کو دیکھنے لگتے ہیں۔

اس آیت کریمہ کے یاد آتے ہی وہ نوجوان بے ہوش ہو کر گر پڑا، اس مفتونہ عورت نے اپنی باندی کو بلایا اور دونوں نے بصد مشکل اس نوجون کو اُٹھا کر اس کے دروازہ تک پہنچایا اور دروازہ کھٹکھٹا کر جلدی سے بھاگ آئیں۔

باپ اپنے بیٹے کی تلاش میں باہر آیا اور دیکھا کہ اس کا پیارا بیٹا دروازے پر بے ہوش پڑا ہے، اس نے فوراً اپنے اہل خانہ کو بلایا اور وہ اسے اُٹھا کر اندر لے گئے، لڑکا بڑی دیر تک بے ہوش رہا، جب رات زیادہ گذر گئی تو اسے ہوش آیا، باپ نے پوچھا! پیارے بیٹے تیرا کیا حال ہے؟ اس نے کہا ابا جان میں بخیریت ہوں، باپ نے کہا بیٹے! میں اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر تجھ سے پوچھتا ہوں تو مجھے تفصیلی حالات بتا دے، لڑکے نے تمام ماجرا بیان کر دیا، باپ نے کہا! بیٹے اس وقت تو نے کون سی آیت پڑھی تھی؟ لڑکے نے وہی آیت پڑھ کر سنائی اور آیت پڑھتے ہی پھر بے ہوش ہو گیا، گھر والوں نے اسے بلایا تو اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی، بالآخر اسے غسل دے کر تجہیز و تکفین کی اور رات ہی میں قبرستان لے جا کر دفن کر دیا، صبح کو یہ واقعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے پیش آیا تو امیر المومنین رضی اللہ عنہ اس نوجوان کے والد کے پاس تشریف لے گئے اور اس کی تعزیت فرمائی، اور فرمایا کہ تم نے ہمیں رات کو اطلاع کیوں نہیں دی؟ مرحوم نوجوان کے باپ نے عرض کیا! حضور رات کا وقت تھا، آپ کی تکلیف کے خیال سے ہم آپ کو اطلاع نہ دے سکے،

فرمایا اچھا! اب ہمیں اس کی قبر پر لے چلو، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور آپ کے ہمراہی اس کی قبر پر آئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی قبر پر کھڑے ہو کر فرمایا:

''یا فلان ولمن خاف مقام ربہ جنتن''

اے فلاں! جو شخص اپنے اعمال کی جواب دہی کے لئے اپنے رب کی بارگاہ میں کھڑے ہونے سے (دنیا میں) ڈرتا رہا اس کے لئے بہشت کے دو باغ ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جواب میں اس نوجوان نے قبر کے اندر سے کہا!

''فاجابہ الفتي من داخل القبر یا عمر قد اعطائیھما ربي في الجنۃ مرتین''

اے عمر فاروق! میرے رب نے اپنے وعدہ کے مطابق بہشت میں دو مرتبہ یعنی دو باغ عطا فرمائے، اس واقعہ کو حاکم نے مستدرک میں روایت کیا۔[1]

اس حدیث سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوتے:

☆۔ خلوص قلب سے اللہ تعالیٰ کی یاد اور دل کی گہرائی سے ذکر الٰہی کرنا صفائی قلب اور تزکیۂ باطن کا سبب ہے۔

☆ جو لوگ سچے دل سے اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں، ان کے دل میں ایسا نور بصیرت پیدا ہو جاتا ہے جس کی روشنی میں انہیں غیر محسوس چیزیں محسوسات کی طرح نظر آتی ہیں، وہ روح کی پاکی اور پلیدی کو دیکھ سکتے ہیں، حق و صواب کی راہیں اور ابدی نجات کی منزلیں ان پر روشن ہو جاتی ہیں۔

☆ شیطان بڑے صالحین و عابدین کو بہکانے کی کوشش کرتا ہے، ان کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، انہیں معصیت کی راہوں پر لاتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی یاد کا بے پناہ

---

[1] کنز العمال، تفسیر سورۃ الرحمٰن، حدیث نمبر ۴۶۳۴۔ تفسیر ابن کثیر، جز ثالث، سورۃ الاعراف، زیر آیت ۲۰۱۔ احکام تمنی الموت، محمد بن عبد الوہاب نجدی، مطبوعہ ریاض سعودی عرب، ص ۴۷، ۴۸

طوفان جب مرد صالح کے قلب سلیم کی گہرائیوں سے اٹھتا ہے تو وہ گناہوں کے تمام خیلات، ناپاک تصورات اور شیطان کی تمام تر کوششوں اور قوتوں کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے اور اس وقت اہل بصیرت کو "ان عبادی لیس لك علیهم سلطان" کا منظر نظر آتا ہے۔

☆۔ جو لوگ خشیت الٰہیہ اور خوف خداوندی میں جان دیتے ہیں اور اللہ کی راہ میں نفس امارہ سے جہاد کرتے ہوئے ریاضت کی تلوار سے قتل ہو جاتے ہیں، وہ مردہ نہیں بلکہ زندہ ہوتے ہیں اور "فلنحیینه حیوة طیبة" کا مصداق ہو جاتے ہیں۔

☆۔ خدا کی راہ میں اس کے خوف سے مرجانے والے ایسے زندہ جاوید ہیں کہ اگر مومن کامل ان کی قبر پر کھڑے ہو کر انہیں پکارے تو وہ جواب دیتے ہیں۔

☆۔ کاملین کی قبور پر انہیں پکارنا شرک نہیں بلکہ جائز ہے اور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طریقہ مبارک ہے، جن کے متعلق زبانِ رسالت نے ارشاد فرمایا: "فاقتدوا باللذین من بعدی ابی بکر و عمر"۔[1]

---

[1] مشکوٰۃ، حدیث ۶۰۶۱ (ماہنامہ ترجمان اہل سنت، کراچی، شمارہ دسمبر ۱۹۷۱ء)

حدیث نمبر (۳۴)

شہید کو قتل کی تکلیف

عن ابی ھریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ مایجد الشھید من مس القتل الا کما یجد احدکم من مس القرصۃ۔[1]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شہید قتل کی تکلیف محسوس نہیں کرتا لیکن صرف ایسی کہ جیسے تم میں سے کوئی شخص چٹکی (بھرنے) یا چیونٹی کے کاٹنے کی تکلیف محسوس کرتا ہے۔

اس حدیث کو ترمذی، دارمی اور نسائی نے روایت کیا، الفاظ حدیث کا مفہوم بالکل واضح ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے نام پر قتل ہونے والا قتل کی شدید تکلیف محسوس نہیں کرتا، جہاں تک ایمان اور عقیدہ کا تعلق ہے، مرد مومن بارگاہ رسالت میں یہ کہہ کر جھک جاتا ہے کہ ع

عقل قرباں کن بہ پیش مصطفیٰ

لیکن تاوقتیکہ زبان رسالت کے ادا کئے ہوئے الفاظ کو عقل سلیم کے معیار پر دنیا کے روشن خیال اور صالح افراد کے ذہن نشین نہ کرادیا جائے تو علم وعقل کی دنیا میں عظمت نبوت کا وزن صحیح قائم نہیں کیا جاسکتا۔

مقتول کا قتل کی تکلیف محسوس کرنا ایک ایسا فطری امر ہے جس کو واقعات کی روشنی میں جھٹلایا نہیں جاسکتا، ہم دیکھتے ہیں کہ مقتولین کا قتل کے وقت کیا حال ہوتا ہے، ان کی چیخ وپکار، آہ وفغاں صاف اور واضح طور پر اس حقیقت کو بے نقاب کر رہی ہے کہ یہ لوگ شدید ترین تکلیف وآلام میں مبتلا ہیں، ایسی صورت میں ضروری ہے کہ حدیث شریف میں کامل غور وخوض کے بعد اس استبعاد ظاہری کو دور کریں تاکہ زبان رسالت سے نکلے ہوئے الفاظ کے مرادی معنی

[1] ترمذی شریف، کتاب فضائل الجهاد، حدیث نمبر ۱۶۶۸، مطبوعہ دار الغرب الاسلامی، بیروت ۱۹۹۶ء

ص ۲۶۸

اچھی طرح واضح ہو جائیں اور علم وعقل کی دُنیا میں نبوت و رسالت کے وقار کو نافہموں کی طرف سے کوئی صدمہ نہ پہنچے۔

حدیث زیر بحث کے فہم کو آسان کرنے کے لئے ناظرین کرام کو بخاری شریف کی ایک حدیث کے مضمون کی طرف متوجہ کرتا ہوں، خلاصہ مضمون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جنتیوں سے ارشاد فرمائے گا کہ میں تم کو تمام دُنیا کی نعمتیں عطا فرما کر دنیا میں واپس بھیجتا ہوں، تم جنت چھوڑ کر دُنیا میں واپس جانا چاہتے ہو؟ اس ارشاد کے جواب میں تمام جنتی دُنیا میں جانے سے انکار کر دیں گے، لیکن شہید عرض کرے گا، مولا تعالیٰ مجھے دُنیا میں واپس بھیج دے، اس لئے نہیں کہ دُنیا اور اس کی نعمتیں جنت کی نعمتوں سے بہتر ہیں، بلکہ صرف اس واسطے کہ دُنیا میں پھر تیرے نام پر قتل کیا جاؤں اور زندہ ہو کر پھر دُنیا میں جاؤں اور پھر جام شہادت نوش کروں، مطلب یہ ہے کہ جنت میں سب کچھ ہے مگر ایک لذت ایسی ہے کہ جو جنت میں بھی میسر نہیں، اور وہ تیرے نام پر سر کٹانے کی لذت ہے، غیر شہید چونکہ لذتِ شہادت سے واقف نہیں، اس لئے وہ سب انکار کر دیں گے اور شہید اس لذت سے آشنا ہو چکا ہے، اس لئے تمنا کرے گا۔

یہاں اس بات کو غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جنت کی لذتوں کے سامنے سارے جہان کی لذتیں ہیچ ہیں، لیکن شہید پھر بھی یہی چاہے گا کہ میں ان سب کو چھوڑ کر شہادت کا مزہ حاصل کرنے کے لئے دنیا میں چلا جاؤں، اس سے اندازہ کیجئے کہ لذتِ شہادت کیسی ہوگی؟

یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ جنت کی ہر چیز راحت و آرام پر مشتمل ہے، اور قتل ہونا سراسر تکلیف واذیت کا موجب ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ شہید راحت و آرام کو چھوڑ کر اذیت ومصیبت کی طرف جانا چاہے گا، یہ بات تو قانونِ فطرت کے خلاف ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عام قانون تو یہی ہے کہ تکلیف ومصیبت سے بچنے اور راحت و آرام حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، مگر محبت کا قانون اس کے برعکس ہے، احساس محبت کا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر الم میں

راحت پاتا ہے اور ہر درد میں لذت محسوس کرتا ہے، محبت کا مزاج، اس کا شعور وادراک سب کچھ جداگانہ ہے، اس کے نزدیک موت میں حیات ہے، رنج میں راحت ہے، لوٹنے تڑپنے میں اسے مزہ آتا ہے، محبت کا خاصہ یہ ہے کہ وہ کانٹے کو پھول سمجھتی ہے اور نار کو گلزار، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ محبت کی نگاہوں میں اس کے محبوب کا حسن و جمال سمایا ہوا ہوتا ہے، اس کے قلب و روح کی گہرائیوں بلکہ تمام روحانی نظام میں جلوہ ہائے محبوب کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اس کا دماغ شراب محبت میں چور اور آنکھیں نشۂ محبت میں مخمور ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر کسی مریض کا اپریشن کرنا چاہتا ہے تو پہلے اسے کلوروفارم سنگھاتا ہے، مریض اس کے نشہ میں ایسا بے ہوش ہوتا ہے کہ اسے اپنے جسم کے کٹنے اور پھاڑے جانے کا کچھ احساس نہیں ہوتا۔

جب کلوروفارم کے نشہ کا یہ حال ہے تو نشۂ شراب محبت کا کیا حال ہوگا، نشہ سونگھنے والے مریض کو جسم کے کاٹے جانے کا پتہ نہیں لگتا تو شراب الفت کے نشہ میں مخمور ہونے والوں کو سر کٹنے کا کیا احساس ہو سکتا ہے؟

یقین نہ ہو تو قرآن کریم میں سیدنا یوسف علیہ السلام کا قصہ پڑھ لیجئے، زنانِ مصر نے جب حضرت یوسف علیہ السلام کا جمال دیکھا اور چھری سے پھل تراشا چاہا تو پھل کاٹنے کی بجائے انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وقطعن ایدیھن (سورۃ یوسف)

(ان عورتوں نے پھلوں کی بجائے اپنے ہاتھوں کو کاٹ لیا)

لیکن انہیں اپنے ہاتھوں کے کٹنے کا قطعاً احساس نہ ہوا، اگر انہیں احساس ہوتا تو فوراً کہتیں کہ ہمارے ہاتھ کٹ گئے، مگر اپنے ہاتھوں کے کٹنے کا ذکر نہیں کرتیں، بلکہ یہ کہتی ہیں کہ :

''حاش للہ ماھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم''

(خدا کی قسم یہ بشر نہیں، یہ تو بزرگ فرشتہ ہے)

جن کی نگاہوں میں حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال کے جلوے تھے، انہیں ہاتھوں کے کٹنے کا پتہ نہ چلا تو جن کی نظروں میں جمال مصطفیٰ ﷺ کے جلوے سمائے ہوئے ہوں انہیں سر کٹنے کا کیا احساس ہو سکتا ہے؟

امام احمد رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا خوب فرمایا!

حسن یوسف پہ کٹیں مصر میں انگشت زناں
سر کٹاتے ہیں تیرے نام پہ مردانِ عرب [1]

معلوم ہوا کہ شہداء چونکہ شراب محبت محمدی کے نشہ میں مخمور ہوتے ہیں اور ان کی نگاہوں میں حسن مصطفیٰ ﷺ کے جلوے سمائے ہوتے ہیں اس لئے انہیں الم قتل کا احساس نہیں ہوتا۔ [2]

---

[1] حدائق بخشش

[2] ماہنامہ ترجمان اہل سنت، کراچی، شمارہ نومبر ۱۹۷۶ء

حدیث نمبر (۳۵)

بیس تراویح

”یزید بن ھارون قال: اخبرنا ابراھیم بن عثمان، عن الحکم، عن مقسم، عن ابن عباس: أن رسول اللہ ﷺ کان یصلي في رمضان عشرین رکعۃ، والوتر“۔[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ وتر کے علاوہ بیس رکعت پڑھتے تھے۔

اعتراض: بیس رکعت تراویح کے ثبوت میں مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی جو حدیث مرفوع پیش کی گئی ہے، وہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کا راوی ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان جو امام ابوبکر ابن محمد کا دادا ہے، باتفاق آئمہ حدیث ضعیف ہے۔

جواب: یہ صحیح ہے کہ ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں حضرت ابن عباس سے بیس رکعت تراویح کے متعلق جو مرفوع حدیث روایت کی ہے، اس کا راوی ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان ضعیف ہے، مگر ایسا ضعیف نہیں کہ اس کی روایات کو بالکل نظرانداز کر دیا جائے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فتاویٰ عزیزی، جلد اول، (فارسی) ص ۱۱۹ پر فرماتے ہیں:

”حال آنکہ ابوشیبہ جد ابوبکر آنقدر ضعف ندارد کہ روایت او مطروح مطلق ساختہ شود“۔[2]

یعنی ابوبکر ابوشیبہ اس قدر ضعف نہیں رکھتا کہ اس کی روایت کو مطلقاً نظر انداز کر دیا جائے۔

---

۱ مصنف ابن ابی شیبہ من کتاب الصلوٰۃ، حدیث ۷۷[illegible]

۲ فتاویٰ عزیزی (فارسی) مطبوعہ مجتبائی دہلی ۱۳۴۱ھ ص ۱۱۹

ہاں اگر کوئی حدیث ضعیف کسی حدیث صحیح کے معارض ہو تو البتہ ساقط ہو گی، لیکن حدیث مذکور کسی حدیث صحیح کے ساتھ معارض نہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اسی فتاویٰ عزیزی جلد اوّل، ص ۱۱۹ پر فرماتے ہیں:

''آرے اگر معارض او حدیث صحیح می شد البتہ ساقط می گشت وقد سبق ان ما توھم معارضالہ اعنی حدیث ابی سلمۃ عن عائشۃ المتقدم ذکرہ لیس معارضالہ بالحقیقۃ فبقی سالما''۔

یعنی اس حدیث کے معارض کوئی حدیث صحیح ہوتی تو وہ ضرور ساقط ہوتی، حالانکہ سابقاً گزر چکا ہے کہ ابوسلمہ سے حضرت عائشہ کی جس متقدم الذکر حدیث کے معارض ہونے کا وہم کیا جاتا ہے، وہ حقیقتاً اس کے معارض نہیں، لہذا حدیث (ابن عباس) معارضہ سے سالم رہی۔

علاوہ ازیں حدیث مرفوع ضعیف اگر فعل صحابہ سے مؤید ہو تو وہ اپنے مؤید ہونے کی حیثیت سے ضرور قابل احتجاج ہوتی ہے۔

یہی شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ علیہ اسی حدیث ابن عباس کے تحت فرماتے ہیں:

''کیف وقد تاید بفعل الصحابة کما رواه البیهقي في سننه باسناد صحیح''۔

یعنی یہ حدیث مرفوع کیونکر ساقط ہوسکتی ہے حالانکہ اس کی تائید فعل صحابہ سے ہو چکی ہے جیسا کہ بیہقی نے اپنی سنن میں سند صحیح کے ساتھ صحابہ کرام کا بیس رکعت پڑھنا روایت کیا ہے۔

بالخصوص ایسی صورت میں جب کہ وہ فعل صحابہ، روایات کثیرہ سے ثابت ہو، اور سوائے ایک گروہ قلیل کے جمہور امت علمائے مجتہدین نیز آئمہ اربعہ کا مذہب اس کے موافق ہو[1]

---

[1] کتاب التراویح، از علامہ سید احمد سعید کاظمی

حدیث نمبر (۳۶)

دنیا کی محبت اور کراہت موت

''عن ثوبان رضي الله تعالىٰ عنه قال قال رسول الله ﷺ يوشك الامم ان تداعي عليكم كما تداعي الاكلة الى قصعتها فقال قائل ومن قلة نحن يومئذ قال بل انتم يومئذ كثير ولكنكم غثاء كغثاء السيل ولينزعن الله من صدور عدوكم المهابة منكم وليقذفن في قلوبكم الوهن قال قائل يارسول الله وما الوهن قال حب الدنيا وكراهية الموت رواه ابوداوٗد والبيهقي في دلائل النبوة'' [1]

حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، حضور سید عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا! قریب ہے کہ گمراہوں اور بے دینوں کی جماعتیں تم پر حملہ آور ہونے کے لئے ایک دوسرے کو اس طرح بلائیں گی جیسے کھانے والے کاسۂ طعام کی طرف کھانے کے لئے ایک دوسرے کو بلاتے ہیں، ایک کہنے والے نے کہا کہ حضور! کیا اس زمانہ میں ہماری تعداد کم ہونے کی وجہ سے کفار ہم پر اس طرح چڑھائی کریں گے؟ فرمایا نہیں! اس وقت تمہاری تعداد بڑی کثیر ہوگی لیکن تم سیلاب کے جھاگ اور پانی پر بہنے والے خس وخاشاک کی طرح ہوگے، اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارے رعب کو نکال لے گا اور تمہارے دلوں میں سستی ڈال دے گا، ایک عرض کرنے والے نے عرض کیا حضور! سستی سے کیا مراد ہے یا سستی کا سبب کیا ہوگا؟ ارشاد فرمایا! دنیا کی محبت اور موت سے کراہت۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے اور بیہقی نے دلائل النبوۃ میں روایت کیا۔

---

[1] ابوداؤد شریف، کتاب الملاحم، حدیث ۴۲۹۷ مطبوعہ مکتبۃ العصریۃ بیروت، الجزء ۴، ص ۱۱۱
باب فی تداعی الامم علی الاسلام، ص

حضور تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مبارک حدیث میں ایسے عظیم الشان غیب کی خبر دی ہے جس کی عظمت واہمیت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے قلوب میں خوف وخشیت الٰہی کے نشانات پائے جاتے ہوں، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لسان رسالت نے اُمت مرحومہ کے آخری دور کا جو نقشہ اس حدیث شریف میں بیان فرمایا ہے، اس کے نشانات نمایاں طور پر اس زمانہ میں پائے جاتے ہیں۔

حدیث پاک میں اس امر کی تصریح موجود ہے کہ اطراف عالم کے کفار کا ہم پر چڑھائی کرنا اور لقمۂ تر سمجھ کر ہمیں ہضم کر جانے کے لئے ان کا ہماری طرف دوڑنا صرف اس لئے ہوگا کہ ہم اس وقت پانی کے جھاگ کی طرح کمزور اور بے وزن ہوں گے، اسی لئے ہمارے دشمنوں کے دلوں میں ہمارا کوئی رعب نہ ہوگا اور ہمارے دل سستی اور بزدلی کے اثرات سے متاثر ہوں گے، ہماری اس سستی کا سبب بھی یہاں مذکور ہے اور وہ دنیا کی محبت اور موت کی کراہیت ہے، درحقیقت ہماری کمزوری، بے وزنی، بزدلی اور تباہی کا سنگ بنیاد یہی آخری چیز ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں مسلمانوں میں بھی ایسا ایک مسلمان ملنا مشکل ہے جس میں حب دنیا اور کراہیت موت کے نشانات نہ پائے جاتے ہوں، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انسانی عظمت کا نشان یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دل حب دنیا اور کراہیت موت سے خالی ہو، اور بجائے اس کے آخرت کی محبت اور خدا کی راہ میں جان دینے کا جذبہ کامل اس کے دل میں پایا جائے، آج ایسے ہی لوگوں کو تلاش کرتے ہوئے نگاہیں بے ساختہ بول اٹھتی ہیں کہ ؎

یارب وہ کہیں مرد مسلماں نظر آئے
جس میں اثر عظمت انساں نظر آئے

قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں انسانی عظمت کے یہ نشانات بدرجہ اتم پائے جاتے تھے، ان کے مقدس دلوں میں دنیا کی محبت نہ تھی، اسی لئے انہوں نے یہاں کی لذتوں اور

راحتوں اور دنیا کی رنگینیوں سے نفرت فرمائی، اور رضائے الٰہی کے پیش نظر ہمیشہ آخرت کی طرف متوجہ رہے، اور یہ ظاہر ہے کہ جسے دنیا کی لذتوں اور راحتوں سے نفرت ہو وہ یہاں کی زندگانی سے کب خوش ہوگا، جس عالم سے اس کو محبت ہے وہیں جانے کی فکر میں لگا رہے گا اور وہیں کی حیات کو پسند کرے گا، نتیجہ یہ نکلا کہ جس کا دل حب دنیا سے خالی ہے وہ حیات دنیا کی محبت میں بھی گرفتار نہیں، اس لئے موت سے اس کو کراہت نہیں ہوتی. بلکہ وہ اسے لقاء حبیب کا وسیلہ سمجھ کر نہایت خندہ پیشانی سے قبول کر لیتا ہے، اور اس کے برعکس دنیا کی محبت میں مبتلا ہونے والا حیات دنیا پر حریص ہوتا ہے اور موت سے اس کو کراہت ہوتی ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ موت ہادم لذات ہے، جب اس کا دل لذات دنیویہ میں گرفتار ہے تو وہ موت کو کب پسند کر سکتا ہے؟ اس لئے حب دنیا کے لئے کراہیت موت لازم ہے۔

اس حدیث سے کفار کے مقابلہ میں مسلمانوں کی فتح وشکست کا سبب بھی معلوم ہوگیا کہ جب مسلمانوں میں حب دنیا اور کراہیت موت کے اثرات پائے جائیں گے تو ان کی ہوا اکھڑ جائے گی، وہ بے وزن ہو جائیں گے، دشمن کے دل میں ان کا رعب باقی نہ رہے گا اور انقلاب زمانہ کی گردشیں انہیں پانی کے جھاگ اور سیلاب کے خس وخاشاک کی طرح بہادیں گی، اور جس وقت قلوب مومنین حب دنیا اور کراہیت موت کے اثرات سے پاک ہوں گے اور ان میں اس کی بجائے آخرت کی چاہت اور لقائے حبیب کی خواہش ہوگی تو ان کے دشمن مرعوب ومغلوب، خائب وخاسر اور بری طرح شکست خوردہ ہو کر ذلیل وناکام ہوں گے، اور فتح ونصرت مسلمانوں کا استقبال کرے گی، یہی وجہ تھی کہ ہمارے سلف صالحین کو باوجود قلت تعداد اور شدید مشکلات کے وہ حیرت انگیز فتوحات حاصل ہوئیں، جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی، اور اب ہم کروڑوں کی تعداد میں ہیں مگر دشمن کی نگاہ میں ہمارا کوئی وزن نہیں اور ہر طرف سے کفار ومشرکین ہم پر یورش کر رہے ہیں، اس کا علاج صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ہمارے دل ایک مرتبہ پھر حب دنیا سے خالی ہو کر لقاء حبیب کی آرزو سے لبریز ہو جائیں

اور اسی دھن میں یہ زندگی ہمیں وبال جان محسوس ہونے لگے اور اس طرح موت سے کراہیت کی بجائے ہم خندہ پیشانی سے اس کے استقبال کا جذبہ اپنے دل میں پائیں اور یہ سمجھ لیں کہ خدا کی محبت کے ساتھ اس کی راہ میں جان دینا مرنا نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے جینا ہے۔ ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما[1]

[1] ماہنامہ "قائد" ملتان، شمارہ مارچ، اپریل ۱۹۵۱ء

حدیث نمبر (۳۷)

حدیثوں میں اختلاف اور رائے کی اہمیت

"عن ابن عمر رضي الله تعالیٰ عنهما قال: قال النبي ﷺ يوم الاحزاب: لا يصلين احد العصر الا في بني قريظة: فادرك بعضهم العصر في الطريق فقال بعضهم: لا نصلي حتي ناتيها وقال بعضهم: بل نصلي لم يرد منا ذلك فذكر ذلك للنبي ﷺ فلم يعنف واحدا منهم"۔[1]

خلاصہ حدیث یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے صحابہ کی ایک جماعت کو بنو قریظہ (یہودیوں کا ایک قبیلہ) کی جانب بھیجا اور ارشاد فرمایا!

لا يصلين احد العصر الا في بني قريظة
یعنی تم میں سے کوئی بھی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ جا کر۔

اور مسلم شریف، باب المبادرۃ (حدیث ۱۷۷۰) میں حدیث یوں ہے کہ:

لا يصلين احد الظهر الا في بني قريظة
تم میں سے کوئی ظہر کی نماز بنو قریظہ کے پاس پہنچے بغیر نہ پڑھے۔

اب دیکھئے کہ ظہر، عصر کا مغائر ہے کہ نہیں؟ اگر کوئی عصر کی نیت کر کے ظہر کی نماز پڑھ لے تو کیا اس کی نماز ہوگی؟ ہرگز نہیں ہوگی کیونکہ عصر اور ہے اور ظہر اور ہے، اب بنو قریظہ کی جانب جس جماعت کو حضور ﷺ نے بھیجا اس کے لئے حضور ﷺ کے الفاظ بخاری میں ہیں کہ تم میں سے کوئی بھی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ جا کر، اور مسلم شریف کے الفاظ ہیں کہ تم میں سے کوئی ظہر کی نماز بنو قریظہ کے پاس پہنچے بغیر نہ پڑھے، معلوم ہوا کہ دونوں حدیثوں میں تغائر ہے اور حدیثوں میں یہ اختلاف ایک حقیقت ثابتہ ہے۔

---

[1] بخاری شریف، باب مرجع النبی ﷺ، حدیث ۴۱۱۹

آپ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ پر رائے کا الزام لگانے والوں سے میں پوچھتا ہوں کہ بتاؤ جو جماعت حضور ﷺ نے بنو قریظہ کی جانب بھیجی، اس جماعت کو آپ نے ظہر کی نماز کے بارے میں فرمایا یا عصر کی نماز کے متعلق؟ بتاؤ ان مختلف احادیث میں تطبیق کیسے کرو گے؟

کیا رائے کے بغیر کام چلے گا؟ ہرگز نہیں، رائے کے بغیر یقیناً کام نہیں چلے گا، کیونکہ تم رائے کے بغیر دونوں حدیثوں میں تطبیق نہیں کر سکتے، زیادہ سے زیادہ محدثین کے حوالے سے یہ کہو گے کہ دونوں حدیثیں تعدد واقعہ پر محمول ہیں، یعنی ایک جماعت کو حضور ﷺ نے ظہر سے پہلے بھیجا اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی بھی ظہر کی نماز بنو قریظہ کے پاس پہنچے بغیر نہ پڑھے، اور دوسری جماعت کو حضور ﷺ نے عصر سے پہلے روانہ کیا اور فرمایا تم میں سے کوئی بھی عصر کی نماز بنو قریظہ کے پاس پہنچے بغیر نہ پڑھے، لیکن میں کہتا ہوں کہ تعدد واقعہ پر کوئی دلیل لاؤ اور کوئی ایسی حدیث بھی پیش کرو جس سے ثابت ہو کہ حضور ﷺ نے ایک جماعت کو ظہر سے پہلے بھیجا اور دوسری جماعت کو ظہر کے بعد بھیجا ہو، لیکن دس ہزار مرتبہ بھی تم مر کر زندہ ہو جاؤ تو تعدد واقعہ پر تم حدیث نہیں لا سکتے، معلوم ہوا کہ محدثین نے یہ توجیہ اپنی رائے سے کی ہے، اور رائے کو ہم مانتے ہیں تم نہیں مانتے، اگر تم پاؤں چھپاتے ہو تو سر کھلتا ہے اور سر چھپاتے ہو تو پاؤں کھلتے ہیں۔

اب ہوا یہ کہ جب حضور ﷺ نے اس جماعت کو بھیجا اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص عصر کی نماز بنو قریظہ پہنچے بغیر نہ پڑھے، لیکن بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے ہی وقت اتنا تھوڑا رہ گیا کہ اگر بنو قریظہ پہنچتے ہیں تو عصر کی نماز قضاء ہو جاتی ہے، اب مسئلہ پیدا ہو گیا کہ حضور ﷺ کا تو حکم یہ ہے کہ لا یصلین احد العصر الا فی بنی قریظۃ یعنی تم میں سے کوئی شخص عصر کی نماز بنو قریظہ پہنچے بغیر نہ پڑھے لیکن اس صورت میں تو نماز قضاء ہو جاتی ہے اور اگر نماز پہلے ادا کرتے ہیں تو حضور ﷺ کی حکم عدولی ہوتی ہے، اب اس اختلاف کی صورت میں بعض صحابہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

''اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا'' [1]

''بے شک نماز ایمان والوں پر وقت مقرر کیا ہوا فرض ہے'' [2]

نماز فرض موقت ہے لہذا وقت سے مفر نہیں کیا جائے گا اور ہم ابھی نماز عصر ادا کریں گے تا کہ نماز وقت پر ادا ہو جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کا مطلب یہ تھا کہ تم اتنی جلدی چلنا کہ نماز عصر بنو قریظہ جا کر ادا کرو، اب اتنی جلدی نہیں چلے تو یہ ہماری غلطی ہے، چنانچہ ہم نماز ادا کر لیتے ہیں، اس لئے ایک جماعت نے بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے نماز عصر ادا کی، مگر کچھ صحابہ نے کہا کہ قضا اور ادا تو ہم جانتے نہیں، ہم تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان پر عمل کریں گے کہ نماز عصر بنو قریظہ پہنچے بغیر نہیں پڑھیں گے، اب صحابہ کرام کی دونوں جماعت میں اختلاف ہو گیا، کیونکہ دونوں نے اپنے اجتہاد سے کام لیا، اور جب یہ دونوں جماعتیں یعنی اپنی رائے سے کام لینے والی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پہنچیں تو حدیث میں آتا ہے کہ ''فلم یعنف واحدا منهم'' یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی بھی جماعت سے ناراضگی نہیں فرمائی۔

مجھ سے درس حدیث میں کسی طالب علم نے سوال کیا کہ حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اظہار ناراضگی کسی جماعت کے لئے نہیں فرمایا، لیکن یہ بتایئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کیوں نہ فرمایا کہ فلاں جماعت صواب پر تھی اور فلاں خطاء پر، میں نے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم تھا کہ میری اُمت میں قیامت تک اجتہاد کا سلسلہ جاری رہے گا اور لوگ قیامت تک مجتہدین کے اجتہاد پر عمل کرتے رہیں گے اور ان کے اجتہاد کی خطاء ظاہر نہیں ہوگی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پردہ پوشی فرمائی، تاکہ دونوں جماعتوں کو ان کا ثواب ملتا رہے، اب اللہ تعالیٰ بھی اجتہاد کرنے پر ان سے ناراض نہیں اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے ناراض ہیں، اگر کوئی ناراض ہوتا پھرے تو ہوا کرے۔ [3]

---

[1] سورۃ النساء، آیت ۱۰۳ [2] البیان ترجمہ قرآن از علامہ کاظمی قدس سرہ

[3] خطبات کاظمی، حصہ اوّل، مطبوعہ علی پور ضلع مظفر گڑھ

حدیث نمبر (۳۸)

حدیث افک: ام المؤمنین کی پاکدامنی

حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ صَالِحٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ حَدَّثَنِي عُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ وَسَعِيدُ بْنُ الْمُسَيَّبِ وَعَلْقَمَةُ بْنُ وَقَّاصٍ وَعُبَيْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُودٍ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَ قَالَ لَهَا أَهْلُ الْإِفْكِ.........

طویل حدیث افک کے متعلق یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تہمت کے معاملہ میں حضور ﷺ نے لاعلمی ظاہر فرمائی۔[1]

بخاری شریف میں اسی حدیث افک میں یہ الفاظ موجود ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا!

''واللہ ما علمت علی اھلی الا خیرا''

(خدا کی قسم! میں نے اپنے اہل مقدس پر بجز خیر کے کچھ نہیں جانا)

اللہ تعالیٰ کے پیارے حبیب ﷺ قسم ارشاد فرما کر اپنے علم کا اعلان فرما رہے ہیں، مگر منکرین کو حضور ﷺ کی قسم پر یقین نہیں آتا۔

اس واقعہ میں حضور ﷺ کا حضرت عائشہ صدیقہ کی طرف سے توجہ کو کم کر دینا لاعلمی کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ اس تہمت کے بعد غیرت محمدیہ کا تقاضا یہ تھا کہ جب تک یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صاف نہ ہو، اُس وقت تک سرکار ﷺ توجہ میں کمی فرمائیں، تاکہ کسی دشمن کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ حضور ﷺ کو اس قسم کی تہمت سے کوئی نفرت نہیں۔

حضور ﷺ کا غمگین ہونا بھی اسی وجہ سے تھا کہ حضور ﷺ حضرت صدیقہ کی بے گناہی کا یقین رکھتے تھے، صدمہ تو یہی تھا کہ بے گناہ پر تہمت لگی، اگر ان کی بے گناہی کا علم نہ ہوتا تو

---

[1] بخاری شریف، کتاب المغازی، حدیث ۴۱۴۱

مطبوعہ مکتبۃ الصفا قاہرہ ۲۰۰۵ء ۱۴۲۶ھ۔ کے جز ثالث باب حدیث الافک ص ۱۲۳

اس قدر صدمہ بھی نہ ہوتا، اگر آج ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص کو بے گناہ پھانسی پر لٹکا دیا گیا تو ہمیں ضرور صدمہ ہوگا، اور اگر اس کی بے گناہی کا علم نہ ہو تو اس قدر صدمہ بھی نہ ہوگا۔

حضور ﷺ نے حضرت صدیقہ کے معاملہ کی تفتیش خود علم حاصل کرنے کے لئے نہیں فرمائی بلکہ حضرت صدیقہ کی پاکدامنی کو ان مسلمانوں کے ذہن میں قائم کرنے کے لئے فرمائی جو مسلمان ہونے کے باوجود تہمت لگانے والوں میں شامل ہو گئے تھے، جب ان کے دلوں میں حضرت صدیقہ کی طرف سے بدگمانی راسخ ہو چکی تھی تو بمقتضائے فطرت بشریہ یہ بات قرین قیاس تھی کہ اگر حضور ﷺ ان سے بذاتِ خود صدیقہ کی پاکی پر زور دیں تو شاید وہ سرکار ﷺ کے حق میں بھی بدگمان ہو جائیں اور یہ خیال کریں کہ ان کی عزت کا معاملہ ہے، اس لئے اس طرح فرما رہے ہیں، یہی وجہ تھی کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ان پر اس معاملہ میں زور نہیں دیا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ ہمارے حق میں بدگمان ہو کر کفر و ارتداد تک پہنچ جائیں، یہاں یہ شبہ کرنا کہ حضور ﷺ کا مقولہ "واللہ ما علمت علی اھلی الا خیرا" ان اصحاب نے بھی سنا ہوگا، پھر بھی یہ اپنی بدگمانی پر قائم رہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اس کے متعلق عرض ہے کہ اول تو یہ ثابت نہیں کہ بدگمانی کرنے والے صحابہ نے یہی جملہ حضور ﷺ سے سنا ہو، اور اگر بالفرض سنا بھی ہو تو اپنے قیاس سے اس کو محض حسن ظن پر محمول کیا ہوگا۔

بہر حال اس تحقیق و تفتیش کی حکمت صرف یہ تھی کہ اسباب عادیہ مالوفہ طبائع بشریہ کے ذریعہ حضرت صدیقہ کی پوزیشن کو بدگمانی کرنے والے مسلمانوں کے ذہن میں بھی واضح اور صاف کر دیا جائے اور منافقین پر بھی حجت قائم کر دی جائے کہ دیکھو اتنی تحقیق کے بعد بھی کوئی برائی ظاہر نہیں ہوئی، اس سے معلوم ہوا کہ ان میں کوئی برائی پائی ہی نہیں جاتی۔

ایک مہینہ یا اس سے زائد تک اس معاملہ کو طول دینے کی حکمت بھی یہی تھی کہ اگر جلدی سے معاملہ ختم کر دیا جاتا تو لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات رہ جاتے، سرکار دو عالم ﷺ نے حکمت عملی کے مطابق معاملہ کو طول دیا کہ جس طرح چاہو اس طویل عرصہ میں

واقعات کی چھان بین کرلو، جب کوئی برائی موجود ہی نہیں تو ظاہر کہاں سے ہوگی۔

دیکھئے اگر کسی پر تہمت لگائی جائے کہ تم نے ہمارے سو روپے چرالئے ہیں، اور وہ شخص متہم کو اپنے کپڑوں کی تلاشی دینے لگے اور اپنے گھر اور سامان کی ایک ایک چیز لا کر دکھادے اور لوگوں سے دریافت کرائے کہ بھائی تم نے میرے پاس سو روپے دیکھے ہیں؟ تمہیں علم ہے بھائی! تم بتاؤ میں نے کبھی چوری کی ہے؟ تو اس کا کیا مطلب ہے، کیا اس تحقیق کرنے والے کو اپنا حال معلوم نہیں؟ کیا یہ خود اپنا علم حاصل کرنے کے لئے معاملہ کو طول دے کر اس کی تحقیق کر رہا ہے؟

نہیں، نہیں! بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر اچھی طرح اس معاملہ کی تحقیق نہ کرائی گئی تو میری بے گناہی واضح نہ ہوگی، اور لوگوں کے دلوں میں میری طرف سے بدگمانی باقی رہے گی۔

بالکل یہی معاملہ یہاں تھا، سرور کائنات ﷺ کو صدیقہ کی پاکی کا یقین تھا مگر ان حکمتوں کے پیش نظر بے توجہی اور تحقیق و تفتیش کرائی گئی اور معاملہ کو طول دیا گیا تاکہ حضرت صدیقہ کی پاکدامنی ہر طریقہ سے ظاہر ہو جائے، اسی حکمت کے تحت ان کی برأت قرآن مجید میں تاخیر سے نازل ہوئی۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جب سرکار مدینہ ﷺ نے فرمایا کہ اے صدیقہ! اگر تم سے کوئی گناہ ہوا ہے تو تم توبہ کرلو، اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرماتا ہے، حضرت صدیقہ اچھی طرح سمجھتی تھیں کہ حضور ﷺ خود علم حاصل کرنے کے لئے یہ بات نہیں فرما رہے، بلکہ دوسروں کے اذہان کو میرے حق میں بدگمانی سے پاک فرمانے کے لئے یہ کلمات طیبات ارشاد ہو رہے ہیں، لہٰذا جواب میں جمع کے صیغے بولتی ہیں، اور ایسے الفاظ فرماتی ہیں جن کے مخاطب حقیقتاً حضور ﷺ ہو ہی نہیں سکتے، فرماتی ہیں!

إِنِّي وَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُ لَقَدْ سَمِعْتُمْ هٰذَا الْحَدِيثَ حَتّٰى اسْتَقَرَّ فِي أَنْفُسِكُمْ وَصَدَّقْتُمْ بِهِ فَلَئِنْ قُلْتُ لَكُمْ إِنِّي بَرِيئَةٌ لَا تُصَدِّقُونِي

وَلَئِنْ اعْتَرَفْتُ لَكُمْ بِأَمْرٍ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ أَنِّي مِنْهُ بَرِيئَةٌ لَتُصَدِّقُنِّي فَوَاللّٰهِ لَا أَجِدُ لِي وَلَكُمْ مَثَلًا إِلَّا أَبَا يُوسُفَ حِينَ قَالَ (فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَى مَا تَصِفُونَ)

(خدا کی قسم مجھے معلوم ہے کہ تم لوگوں نے یہ بات سنی ہے اور تمہارے دلوں میں قرار پکڑ چکی ہے اور تم نے اس کی تصدیق بھی کر دی ہے، اگر میں تم سے کہوں کہ میں بے گناہ ہوں تو تم ہرگز میری تصدیق نہ کرو گے اور اگر تمہارے سامنے کسی ایسے امر کا اقرار کر لوں جس کے متعلق اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ میں اس سے پاک ہوں تو مجھے سچا مان لو گے! تو خدا کی قسم جب میرے اور تمہارے لئے سوائے حضرت یعقوب علیہ السلام کے اور مثل نہیں، جیسا انہوں نے یہ فرمایا کہ "فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَى مَا تَصِفُونَ۔

خدا کے لئے ان الفاظ پر غور فرمائیے کہ یہ بات تمہارے دلوں میں قرار پکڑ چکی ہے اور تم نے اس کی تصدیق بھی کر دی ہے، کیا اس کلام کے مخاطب حضور ﷺ ہو سکتے ہیں؟ کیا سرورِ عالم ﷺ کے قلب اطہر میں نعوذ باللہ حضرت صدیقہ کی برائی بیٹھ چکی تھی؟ کیا حضور ﷺ نے اس کی تصدیق فرما دی تھی؟ جو لوگ اس معاملہ میں حضور ﷺ کے علم کے منکر ہیں، وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتے، کیونکہ حضور ﷺ نے تو قسم کھا کر ارشاد فرمایا تھا کہ واللہ ما علمت علی اھلی الا خیرا، اس کلام کو اگر حسن ظن پر بھی محمول کر دیا جائے تب بھی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق حضور ﷺ کا حسن ظن ثابت ہوگا، حسن ظن کے ساتھ ان کی برائی کا دل میں بیٹھ جانا اور اس کی تصدیق کر دینا کیسے جمع ہو سکتا ہے؟

معلوم ہوا کہ حضرت صدیقہ نے اگرچہ بظاہر حضور ﷺ کو مخاطب بنایا، مگر اپنے اس خطاب کا رخ ان ہی لوگوں کی طرف رکھا جو منافقین کے بہکانے میں آکر مسلمان ہونے کے باوجود تہمت لگانے میں مبتلا ہو گئے تھے، اور ان کے دل میں حضرت صدیقہ کی طرف سے

برائی بیٹھ گئی تھی، اور انہوں نے تہمت لگا کر اس کی تصدیق بھی کر دی تھی، اگر اس کلام کے مخاطب حضور علیہ السلام ہوں تو نعوذ باللہ حضور ﷺ بھی تہمت لگانے والوں میں شامل ہوں گے، کیونکہ کسی پر برائی کی تصدیق کرنا ہی تہمت ہے، اللہ کے پیارے حبیب ﷺ اس سے پاک ہیں۔

تفسیر کبیر میں (سورۃ التحریم، آیت ۱۲ کے تحت) امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک حدیث نقل کی:

"ما بغت امرأة نبي قط"

(کسی نبی کی بیوی نے کبھی بے حیائی کا کام نہیں کیا)

حضرت ابن عباس ایسی بات جو عقل سے وراء الوراء ہے اپنی طرف سے نہیں کہہ سکتے، یقیناً حضور علیہ السلام سے سُن کر فرما رہے ہیں، لہٰذا حدیث حکماً مرفوع ہوئی۔

اس حدیث میں حضور سرورِ عالم ﷺ نے ایک ایسے امر کا بیان فرمایا جو لوازمات نبوت سے ہے اور وہ یہ کہ کسی نبی کی بیوی بدکار نہیں ہو سکتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس شخص کی بیوی بدکار ہو وہ لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل ہوتا ہے، اور اس کی بات بالکل حقیر ہوتی ہے، لوگوں کے ذہن میں ایسے شخص کی بات کا کوئی وزن قائم نہیں ہو سکتا، پھر یہ کہ اس میں ذرا بھی حیا کا مادہ ہے تو وہ لوگوں کے سامنے منہ نہیں دکھا سکتا، لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام ہدایت خلق اور پیغامات ربانی پہنچانے کے لئے دنیا میں مبعوث ہوتے ہیں، نعوذ باللہ وہ ذلیل نہیں ہوتے، اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کو ذلت کے اسباب سے محفوظ رکھتا ہے، نہ ان کی بات حقیر ہو سکتی ہے، اگر نعوذ باللہ انبیاء علیہم السلام کی بیویوں سے ایسی ناشائستہ حرکات سرزد ہوں تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں، ایسی صورت میں احکام الٰہی کی تبلیغ کس طرح ہو سکتی ہے، لہٰذا انبیاء علیہم السلام کی بیویوں سے بے حیائی متصور نہیں، بعض انبیاء کی بیویاں کافر ہوئیں لیکن بے حیا نہیں ہوئیں، کفر تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے، مگر اس میں فحش اور بے حیائی نہیں۔

جب آپ نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ خود حضور نبی کریم ﷺ نے ازواج انبیاء کی پاکدامنی اور عفت کا لازمہ نبوت ہونا بیان فرمایا ہے، تو اب اس امر پر غور فرمائیے کہ حضور سرورِ عالم ﷺ حضرت صدیقہ کی پاکی میں کس طرح شک فرما سکتے ہیں، اگر صدیقہ کی پاکی حضور ﷺ کے نزدیک یقینی نہ ہو تو پھر اپنی نبوت بھی نعوذ باللہ سرکار ﷺ کے نزدیک یقینی نہ رہے گی، جب حضور ﷺ کا اپنی نبوت پر ایمان ہے اور حضور ﷺ یہ جانتے ہیں کہ نبی کی بیوی پاک ہوتی ہے تو ان دونوں کے ملانے سے نتیجہ واضح ہو جاتا ہے کہ آقائے نامدار ﷺ کو حضرت صدیقہ کی پاکی میں ذرہ برابر بھی شک نہ تھا، کیونکہ حضرت صدیقہ کی پاکی میں شک خود حضور ﷺ کی اپنی رسالت میں شک کو مستلزم ہے، اور حضور ﷺ اپنی رسالت میں شک کرنے سے بالکل پاک ہیں، لہذا حضرت صدیقہ کی پاکی میں شک کرنے سے بھی حضور ﷺ قطعاً پاک اور مبرا ہیں۔[1]

[1] تقریر منیر از علامہ سید احمد سعید کاظمی، مطبوعہ اسلامی کتب خانہ کچہری بازار ملتان، تیسرا ایڈیشن، صفحہ ۲۶ تا ۳۳

حدیث نمبر(۳۹)

ابلاغ درود

"اخبرنا علي بن محمد بن بشران انبأ ابو جعفر الرازي ثنا عيسي بن عبدالله الطيالسي ثناء العلاء بن عمرو الحنفي ثنا ابو عبدالرحمن عن الاعمش عن ابي صالح عن ابي هريرة عن النبي ﷺ قال "من صلي علي عند قبري سمعته و من صلي علي نائياً منه ابلغته" ابو عبدالرحمن هذا هو محمد بن مروان السدي فيما اُري وفيه نظر"۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ من صلی علی عند قبری سمعته و من صلی علی نائیاً منه ابلغته۔ یعنی جس شخص نے میری قبر کے پاس آکر مجھ پر درود پڑھا، میں اُسے سنتا ہوں، اور جس نے مجھ پر دور سے درود پڑھا تو وہ مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو درود کا علم کس طرح ہوتا ہے، حضور ﷺ خود سنتے ہیں یا حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو پہنچا دیا جاتا ہے، تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ کہ قبر انور پر درود پڑھا جائے تو حضور ﷺ سنتے ہیں، اور دور سے پڑھنے والوں کا درود حضور ﷺ نہیں سنتے، بلکہ فرشتے حضور ﷺ کو پہنچا دیتے ہیں، یہ لوگ اپنے قول کی دلیل میں حضرت ابوہریرہ کی حدیث پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ من صلی علی عند قبری سمعته و من صلی علی نائیاً منه ابلغته۔ یعنی جس شخص نے میری قبر کے پاس آکر مجھ پر درود پڑھا، میں اُسے سنتا ہوں، اور جس نے مجھ پر دور سے درود پڑھا تو وہ مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔

---

[1] رسالہ حیات الانبیاء للبیہقی، مطبوعہ مکتبہ العلوم والحکم، مدینہ منورہ، ۱۹۹۳ء، ص ۱۰۳

معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کا سننا اسی وقت ہوتا ہے جب قبر شریف کے پاس درود پڑھا جائے، اور جو درود دور سے پڑھا جائے اُسے حضور ﷺ نہیں سنتے، وہ فرشتوں کے ذریعے حضور ﷺ کو پہنچا دیا جاتا ہے۔

لیکن ہمارے نزدیک ہر شخص کا درود وسلام حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سنتے ہیں، درود وسلام پڑھنے والا خواہ قبر انور کے پاس حاضر ہو یا کہیں دور ہو، قریب اور دور کا فرق رسول اللہ ﷺ کے لئے نہیں، بلکہ درود وسلام پڑھنے والے کے لئے ہے، نزدیک اور دور کی قید عالم امر کے لئے نہیں، اس لئے کہ روح زمان ومکان کی قید سے آزاد ہے، جب عام ارواح اس قید میں مقید نہیں تو روح اقدس جو روح الارواح ہے قرب وبعد کی قید میں کیونکر مقید ہو سکتی ہے؟

علاوہ ازیں اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے یہ کہاں ارشاد فرمایا ہے کہ دور سے درود پڑھنے والے کا درود صرف فرشتوں کے ذریعہ مجھے پہنچتا ہے میں اسے مطلقاً نہیں سنتا، حضور ﷺ کے درود وسلام سننے اور آپ کی خدمت میں پہنچائے جانے کے متعلق متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں، اگر ان سب کو سامنے رکھ کر فکرِ سلیم سے کام لیا جائے تو یہ مسئلہ بہت آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتا ہے۔

یہ حدیث تو ناظرین پڑھ چکے ہیں کہ جس نے میری قبر کے پاس آ کر مجھ پر درود پڑھا، میں اُسے سنتا ہوں، اور جس نے مجھ پر دور سے درود پڑھا تو وہ مجھے پہنچا دیا جاتا ہے، دوسری حدیث میں وارد ہے:

''عن ابي هريرة قال قال رسول الله ﷺ من صلي علي عند قبري وكل الله به ملكا يبلغني وكفي امر دنياه وآخرته وكنت له يوم القيامة شهيدا او شفيعا''۔

حضرت ابو ہریرہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص میری قبر کے پاس

آ کر مجھ پر دُرود پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس پر ایک فرشتہ مقرر کیا ہوا ہوتا ہے جو اس کا دُرود مجھے پہنچا دیتا ہے اور وہ اپنے امر دنیا اور آخرت کی کفایت کیا جاتا ہے، اور میں اس کے لئے قیامت کے دن شہید یا شفیع ہوں گا۔

یہ حدیث "جذب القلوب" ص ۱۸۲ میں شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمائی اور جلاء الافہام ص ۱۴۲ میں ابن قیم نے لکھی اور اس کے ایک راوی "محمد بن موسیٰ" کے متعلق لکھا۔ لکن محمد بن موسیٰ هذا هو محمد بن موسیٰ الکدیمی متروك الحدیث۔ ، میں عرض کرتا ہوں کہ بعض محدثین نے اسے متروک الحدیث کہا ہے، مگر جلیل القدر محدثین نے اس کی توثیق بھی کی ہے، چنانچہ خطیب نے کہا کان حافظا کثیر الحدیث اور ابو الاحوص کا قول ہے تسألونی عن الکدیمی هو اکبر منی واکثر علما ما علمت الا خیرا۔ اور امام احمد بن حنبل کے بیٹے (عبداللہ بن احمد بن حنبل) نے فرمایا سمعت ابی یقول کان محمد بن یونس الکدیمی حسن المعرفۃ حسن الحدیث اور خلیلی نے کہا بذاك القوی ومنهم من یقویه۔ [1]

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ قبر شریف پر جو دُرود پڑھا جاتا ہے، اسے بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے فرشتہ پیش کرتا ہے، اب اگر فرشتہ کا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں دُرود پیش کرنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سننے کے منافی ہو تو اس حدیث کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ میری قبر انور پر جو دُرود پڑھا جائے میں اسے بھی نہیں سنتا، ایسی صورت میں یہ حدیث پہلی حدیث کے معارض ہوگی جس میں صاف موجود ہے "من صلی علی عند قبری سمعتہ" (جو میری قبر پر دُرود پڑھتا ہے، میں اُسے سنتا ہوں)

علاوہ ازیں جس طرح اس حدیث سے قبر انور کے پاس دُرود پڑھنے والے کے

---

[1] تہذیب التہذیب، جلد ۹ ص ۵۴۰، ۵۴۳

دُرود کا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پہنچایا جانا ثابت ہوا، اسی طرح بعض دیگر احادیث سے دُور کا دُرود شریف سننا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ثابت ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ما من احدٍ یسلم علی الا ردّ اللّٰہ الی روحی حتی اردّ علیه السلام" [۱]

(نہیں کوئی جو سلام پڑھے مجھ پر لیکن اللہ تعالیٰ میری طرف میری روح لوٹا دیتا ہے، یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دوں)

اس حدیث میں "ما" نافیہ ہے، "احد" نکرہ ہے، سب جانتے ہیں کہ نکرہ حیز نفی میں عموم کا فائدہ دیتا ہے، پھر "من" استغراقیہ عموم واستغراق پر نص ہے یعنی مجھ پر سلام بھیجنے والا کوئی شخص ایسا نہیں، جس کے سلام کی طرف میری توجہ مبذول نہ ہوتی ہو، خواہ وہ قبر انور کے پاس ہو یا دُور ہو، ہر ایک کے سلام کی طرف میں متوجہ ہوتا ہوں، اور ہر شخص کے سلام کا خود جواب دیتا ہوں۔

یہ حدیث اس امر کی روشن دلیل ہے کہ دُرود پڑھنے والے ہر فرد کا دُرود حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود سنتے ہیں، اور سن کر جواب بھی دیتے ہیں خواہ وہ شخص قبر انور کے پاس ہو یا دُور ہو، دیکھئے امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اسی حدیث "الا ردّ اللّٰہ روحی" پر کلام کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

"ویتولد من هذا الجواب جواب آخر وهو ان یکون الروح کنایة عن السمع ویکون المراد ان اللّٰہ تعالیٰ یردّ علیه سمعه الخارق للعادة بحیث یسمع سلام المسلم وان بعد قطره"۔

(اور اس جواب سے ایک اور جواب پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ ردّ روح سے یہ مراد ہو کہ اللہ

---

[۱] رواہ احمد وابو داؤد والبیہقی فی شعب الایمان

تعالیٰ حضور ﷺ پر آپ کی سمع خارق للعادۃ کو لوٹا دیتا ہے، اس طرح کہ حضور ﷺ پر سلام بھیجنے والے کے سلام کو سنتے ہیں خواہ وہ کتنی ہی دُور کیوں نہ ہو، اس حدیث سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ دُور سے پڑھنے والے کا دُرود بھی سنتے ہیں)

اس باب میں اور بھی احادیث وارد ہیں، لیکن ہم نے قدر ضرورت پر اکتفا کیا اور ہماری پیش کردہ حدیثوں سے ثابت ہوگیا کہ جس طرح قبر انور کے پاس دُرود پڑھنے والے کا دُرود حضور ﷺ سنتے ہیں اسی طرح دُور کا دُرود بھی حضور ﷺ اپنے سمع مبارک سے سنتے ہیں اور جس طرح دُور کا دُرود حضور ﷺ کو پہنچایا جاتا ہے، اسی طرح قبر انور پر جو دُرود پڑھا جائے، اسے بھی ایک فرشتہ حضور ﷺ پر پہنچاتا ہے۔

ثابت ہوا کہ پہنچانا سننے کے منافی نہیں اور سننا پہنچانے کے معارض نہیں، یعنی قرب اور دُور کا دُرود حضور ﷺ سنتے بھی ہیں اور یہی دُور اور نزدیک کا دُرود حضور ﷺ کو پہنچایا بھی جاتا ہے۔

اس تقریر پر یہ شبہ وارد ہوگا کہ پہلی حدیث "من صلی علی عند قبری سمعته ومن صلی علی نائیاً ابلغته میں "ابلغته" اور "سمعته" باہم متقابل معلوم ہوتے ہیں اور تقابل کی صورت میں سمع کا ابلاغ کے ساتھ جمع ہونا محال ہے، لہذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ جب فرشتے دُرود پہنچاتے ہیں تو اس وقت حضور ﷺ نہیں سنتے۔

جس کے جواب میں ہم یہ عرض کریں گے کہ جب ہم نے احادیث کی روشنی میں ثابت کردیا کہ جو دُرود قبر انور کے پاس پڑھا جائے اسے بھی فرشتے پہنچاتے ہیں، نیز یہ کہ نزدیک و دُور سے ہر ایک دُرود پڑھنے والا جب دُرود پڑھتا ہے تو وہ اس حال میں پڑھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کی طرف حضور کی روح مقدس اور سمع مبارک لوٹائی ہوئی ہوتی ہے اور حضور ﷺ ہر ایک کا دُرود سُن کر خود جواب دیتے ہیں، تو اس کے بعد اس شبہ کے لئے کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

رہا تقابل، تو اس کے لئے مطلق سمع ضروری نہیں بلکہ سمع مخصوص بھی تقابل کے لئے کافی ہے، اور وہ التفات خصوصی ہے اور بر تقدیر صحت حدیث مطلب یہ ہے کہ قبر انور پر آ کر دُرود پڑھنے والا چونکہ حاضری کی خصوصیت کا حامل ہے اس لئے اس کا دُرود اس قابل ہے کہ اسے التفات خاص کے ساتھ سنا جائے۔

بلکہ قبر انور پر حاضری کی خصوصیات پر کیا منحصر ہے، دُور کے لوگ بھی اگر اسی قسم کی کوئی خصوصیت رکھتے ہوں، مثلاً کمال محبت واشتیاق سے دُرود پڑھیں تو ان کے دُرود و سلام کے لئے بھی سمع خصوصی اور مخصوص التفات و توجہ کے ساتھ سمع اقدس کا پایا جانا کچھ بعید نہیں، بلکہ دلائل الخیرات کی ایک حدیث اس دعویٰ کی مثبت ہے، صاحب دلائل الخیرات نے حضور ﷺ کا ارشاد بایں الفاظ وارد کیا:

"اسمع صلوٰۃ اهل محبتي واعرفهم"

(صاحب دلائل الخیرات نے اگرچہ اس حدیث کی سند بیان نہیں کی، لیکن تمام اکابر اولیاء اللہ اور جمیع سلاسل عالیہ کے مشائخ کرام کا دلائل الخیرات کے ضمن میں اس کی تلقی بالقبول اور عدم انکار، صحت مضمون حدیث کی روشن دلیل ہے، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ دیگر احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ۱۲ منہ)

مختصر یہ کہ ابلاغ اور سمع خصوصی کا تقابل مراد لینے کے بعد حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص (خصوصیت کے ساتھ) میری قبر انور پر حاضر ہو کر (یا مثلاً کمال محبت واشتیاق کی خصوصیت کا حامل ہو کر) مجھ پر دُرود پڑھتا ہے، میں اس کے دُرود کو خاص توجہ کے ساتھ سنتا ہوں اور جو شخص دُور سے (ان خصوصیات کے بغیر) مجھ پر دُرود پڑھتا ہے (سماع معتاد کے باوجود) میں اس کی طرف خاص توجہ نہیں فرماتا، صرف ملائکہ میری بارگاہ میں پہنچا دیتے ہیں۔

ابلاغ ملائکہ

فرشتوں کے درود پہنچانے کو جن لوگوں نے مطلق سماع اقدس کے منافی قرار دیا ہے، دراصل وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ابلاغ اور تبلیغ ملائکہ کا سبب حضور ﷺ کی لاعلمی ہے، حالانکہ یہ محض غلط ہے، کیونکہ اس سے پہلے بھی ہم ثابت کر چکے ہیں کہ قبر انور پر جو درود پڑھا جائے اسے حضور ﷺ سنتے بھی ہیں اور اسے ملائکہ بھی حضور ﷺ کے دربار میں پہنچاتے ہیں، اگر فرشتوں کا پہنچانا لاعلمی کی وجہ سے ہوتا تو مزار مبارک پر جس درود کو حضور ﷺ خود سن رہے ہیں، اس کے ابلاغ کی کیا ضرورت تھی؟

فرشتوں کے درود پہنچانے کی حکمت

درود کے الفاظ درحقیقت ایک تحفہ اور ہدیہ ہیں، تحفہ اور ہدیہ کے معنی کی تکمیل "مہدیٰ لہ" کے محض سننے اور جاننے سے نہیں ہوتی، بلکہ انہیں الفاظ کی پیشکش سے ہوتی ہے جو درود شریف کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔

معلوم ہوا کہ فرشتوں کے درود پہنچانے کو مُہدیٰ لہ کے جاننے یا نہ جاننے سے کوئی تعلق نہیں، یہ پہنچانا تو صرف اس لئے ہے کہ ہدیہ اور تحفہ کے معنی متحقق ہو جائیں اور بس، ہم اپنے اس بیان کی تائید کے لئے فیض الباری کی ایک عبارت ہدیہ ناظرین کرتے ہیں:

''واعلم ان حديث عرض الصلوة على النبي ﷺ لا يقوم دليلاً على نفي علم الغيب وان كانت المسئلة فيه ان نسبة علمه ﷺ وعلمه تعالىٰ كنسبة المتناهي بغير المتناهي لان المقصود بعرض الملئكة هو تلك الكلمات بعينها في حضرة العالية علمها من قبل اولم يعلم كعرضها عند رب العزة ورفع الاعمال اليه فان تلك

الکلمات مما یحیا بہ وجہ الرحمن فلا ینفي العرض العلم فالعرض قد یکون للعلم واخري لمعان اخر فاعرف الفرق''۔ انتھي[1]

ترجمہ: ''جاننا چاہئے کہ نبی کریم ﷺ پر درود پیش کرنے کی حدیث علم غیب کی نفی پر دلیل نہیں بن سکتی اگر چہ علم غیب کے بارہ میں مسئلہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے علم کی نسبت اللہ تعالیٰ کے علم کے ساتھ ایسی ہے جیسے غیر متناہی کے ساتھ متناہی کی نسبت، یہ دلیل نہ ہونا اس لئے ہے کہ فرشتوں کی پیشکش کا مقصد صرف یہ ہے کہ درود شریف کے کلمات بعینہا بارگاہ عالیہ نبویہ میں پہنچ جائیں، حضور ﷺ نے ان کلمات کو پہلے جانا ہو یا نہ جانا ہو (بارگاہ رسالت میں کلمات درود کی پیشکش) بالکل ایسی ہے جیسے رب العزۃ کی بارگاہ میں یہ کلمات پیش کئے جاتے ہیں، اور اس کی بارگاہ الوہیت میں اعمال اُٹھائے جاتے ہیں، کیونکہ یہ کلمات ان چیزوں میں سے ہیں، جن کے ساتھ ذات رحمٰن جل مجدہ کو تحفہ پیش کیا جاتا ہے، اس لئے یہ پیشکش علم کے منافی نہیں، لہٰذا کسی چیز کا پیش کرنا کبھی علم کے لئے بھی ہوتا ہے، اور بسا اوقات دوسرے معانی کے لئے بھی، اس فرق کو خوب پہچان لیا جائے''۔ انتہٰی

سماع کا تعلق صرف آواز سے ہے اور فرشتوں کی پیش کش صلوٰۃ وسلام کے کلمات بعینہا سے متعلق ہے، رہا یہ امر کہ وہ کلمات بعینہا فرشتے کیونکر پیش کرتے ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ صلوٰۃ وسلام کے بعینہا اصل کلمات کا پیش کئے جانے کا قابل ہو جانا امر محال نہیں، لہٰذا تحت قدرت داخل ہوگا۔ واللہ علی ما یشاء قدیر

فیض الباری کی منقولہ بالا عبارت سے اچھی طرح واضح ہوگیا کہ بارگاہ رسالت میں فرشتوں کا درود شریف پیش کرنا حضور ﷺ کی لاعلمی پر مبنی نہیں، بلکہ کلمات درود بعینہا کو بطور

---

[1] فیض الباری شرح بخاری: جزء ۲: ص ۳۰۲

تحفہ و ہدیہ پیش کرنا مقصود ہوتا ہے، سننے اور جاننے کو اس پیشکش سے کوئی تعلق نہیں۔

اس لئے قبر انور پر جو درود پڑھا جائے، حضور ﷺ اسے سنتے بھی ہیں اور فرشتہ بھی اسے پیش کرتا ہے، علیٰ ہذا دور سے جو لوگ درود شریف پڑھتے ہیں اسے فرشتے بھی پیش کرتے ہیں اور سمع خارق للعادۃ سے حضور ﷺ استماع بھی فرماتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ "سمعتہ" اور "ابلغتہ" کے مابین تقابل پر زور دے کر جس سماع کی نفی کی جاتی ہے وہ مطلق سماع نہیں بلکہ سماع مقید (بقید التفات خصوصی) ہے، جس کے نظائر قرآن و حدیث میں بکثرت پائے جاتے ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ولهم اعين لا يبصرون بها ولهم آذان لا يسمعون بها" (پ ۹)

"ان (کفار جن وانس) کی آنکھیں ہیں کہ ان سے دیکھتے نہیں اور کان ہیں کہ ان سے سنتے نہیں"۔

یہاں مطلق سمع و بصر کی نفی مراد نہیں بلکہ سمع مخصوص اور بصر خصوصی کی نفی مراد ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "ولا ينظر اليهم يوم القيامة" (اور نہ دیکھے گا اللہ تعالیٰ ان کی طرف قیامت کے دن)۔

یہاں بھی مطلقاً دیکھنے کی نفی نہیں، بلکہ ایک خاص قسم کے دیکھنے کی نفی فرمائی گئی ہے، جو نظر رحمت کے ساتھ دیکھنا ہے۔

حدیث شفاعت میں وارد ہے "قل تسمع" "آپ کہے سنے جائیں گے" (بخاری شریف) یہاں بھی مطلق سماع مراد نہیں، بلکہ سمع خاص مراد ہے، ایسے ہی "سمعتہ" سے سماع خصوصی، یعنی توجہ اور التفات خاص کے ساتھ سننا مراد ہے، اور اگر بر بنائے تقابل ابلغتہ کو نفی سماع پر محمول کیا جائے تو نفی اس کی ہوگی، جس کا سمعتہ سے ثبوت ہوا تھا، اور ہم ثابت کر چکے ہیں کہ ثبوت سماع خصوصی کا ہے لہذا نفی بھی اسی سماع خاص کی ہوگی۔

ایک شبہ ازالہ

اگر ابلاغ ملائکہ کے باعث سماع خاص کی نفی مراد لی جائے تو جو درود قبر انور پر پڑھا جاتا ہے، اس کو بھی ملائکہ پہنچاتے ہیں، ایسی صورت میں قبر انور پر پڑھے جانے والے درود کا بھی سماع خصوصی کے ساتھ سننا منفی قرار پائے گا۔

جواب

ہم نے جس ابلاغ کو سماع خصوصی کا مقابل مانا ہے، وہ "من صلی علی نائیاً" کی شرط سے مشروط ہے، مطلق ابلاغ ہمارے نزدیک سماع خصوصی کے منافی نہیں، پھر "نائیاً" سے بھی محض ظاہر دوری والے مراد نہیں، بلکہ وہ تمام افراد مراد ہیں جو قرب ظاہری ومعنوی کی خصوصیت سے محروم ہیں، جیسا کہ من صلی علی عند قبری کے عموم میں وہ تمام اشخاص شامل ہیں، جو عندیت ظاہری یا باطنی کی خصوصیت کے حامل ہوں۔

یہ تمام گفتگو اس تقدیر پر ہے کہ اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے، اور اگر صحیح نہ ہو، جیسا کہ ہم ابھی اس کی سند پر کلام کریں گے تو نفی سماع کی بنیاد ہی باقی نہیں رہتی۔ [1]

---

[1] ماہنامہ "السعید" ملتان، شمارہ جولائی، اگست ۱۹۶۲ء

حدیث نمبر (۴۰)

سماعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

''قال الطبراني: حدثنا يحيٰ بن ايوب العلاف حدثنا سعيد بن ابي مريم عن خالد بن زيد عن سعيد بن ابي هلال عن ابي الدرداء قال: قال رسول الله صلي الله عليه وسلم اكثروا الصلاة علي يوم الجمعة فانه يوم مشهود تشهده الملائكة، ليس من عبد يصلي الا بلغني صوته حيث كان. قلنا: وبعد وفاتك؟ قال: وبعد وفاتي، ان الله حرم الارض ان تاكل اجساد الانبياء''۔ ذكره الحافظ المنذري في الترغيب. وقال رواه ابن ماجه باسناد جيد[1]

ترجمہ: طبرانی نے بسند مذکور کہا، حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جمعہ کے دن مجھ پر زیادہ درود پڑھا کرو، اس لئے کہ وہ یوم مشہود ہے، اس دن فرشتے حاضر ہوتے ہیں، کوئی بندہ (کسی جگہ سے) مجھ پر درود نہیں پڑھتا مگر اس کی آواز مجھ تک پہنچ جاتی ہے وہ جہاں بھی ہو، حضرت ابودرداء فرماتے ہیں ہم (صحابہ) نے عرض کیا حضور آپ کی وفات کے بعد بھی؟ فرمایا ہاں میری وفات کے بعد بھی، بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کے جسموں کو کھائے۔

اس حدیث کو حافظ منذری نے ترغیب (والترہیب) میں ذکر کیا اور کہا کہ ابن ماجہ نے اسے بسند جید روایت کیا۔

---

[1] حافظ ابن قیم جوزی (متوفی ۷۵۱ھ)، جلاء الافہام فی الصلوٰۃ والسلام علی خیر الانام (عربی)، مطبوعہ دار الطباعۃ المحمدیۃ بالازہر بالقاہرۃ مصر ۱۳۹۲ھ، ص ۶۳

(یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ سنن ابن ماجہ میں یہ حدیث نہیں ہے پھر حافظ منذری کا رواہ ابن ماجہ بسند جید کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟ اس لئے کہ حافظ منذری نے رواہ ابن ماجہ کہا ہے "فی سُننہ" نہیں کہا، مرویات ابن ماجہ سنن ابن ماجہ میں منحصر نہیں بلکہ تفسیر و تاریخ بھی ان کی تصانیف ہیں)۔

حدیث جلاء الافہام پر تھانوی صاحب کا کلام

یہ حدیث ابن قیم نے اپنی مشہور کتاب جلاء الافہام میں نقل کی ہے، جس میں صراحۃً مذکور ہے کہ درود شریف پڑھنے والا جہاں بھی ہو اس کی آواز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچ جاتی ہے۔

مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کو کسی نے یہ حدیث مع سند لکھ کر بھیجی اور سوال کیا کہ:

''اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کی آواز کو سماع فرماتے ہیں، علاوہ اس کے کوئی معنی بیان فرمادیں تاکہ تردد رفع ہو یا ایسا ہی عقیدہ رکھنا چاہئے، آنحضور کا کیا ارشاد ہے''۔[1]

تھانوی صاحب نے اس کے جواب میں سند اور متن حدیث دونوں پر کلام کیا ہے، سند پر کلام کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

''اس سند میں ایک راوی یحیٰی بن ایوب بلانسب مذکور ہیں جو کئی راویوں کا نام ہے۔ جن میں سے ایک غافقی ہیں، جن کے باب میں ربما اخطأ لکھا ہے یہاں احتمال ہے کہ وہ ہوں''۔ انتہی[2]

تھانوی صاحب جس سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ احتمال پیدا کر رہے ہیں، اس سوال کو انہوں نے بوادر النوادر کے ص ۲۰۵ پر خود ارقام فرمایا ہے اور اس میں یہ عبارت

---

[1] بوادر النوادر، جلد اول، ص ۲۰۵ [2] ایضاً

موجود ہے۔

حدثنا یحیی بن ایوب العلاف حدثنا سعید بن ابی مریم الخ

کتب اسماء الرجال میں یحییٰ بن ایوب العلاف اور یحییٰ بن ایوب الغافقی دونوں کو "علاف" اور "غافقی" کے الفاظ سے ممتاز کر کے الگ الگ ذکر کیا گیا ہے، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ احتمال کہاں سے پیدا ہوگیا؟

دیکھئے تہذیب التہذیب، جلد ۱۱، صفحہ ۱۸۵ پر یحییٰ بن ایوب العلاف کا تذکرہ ان الفاظ میں موجود ہے:

یحیی بن ایوب بن بادی الخولانی العلاف روی عن ابی صالح عبدالغفار بن دائود وعمرو بن خالد الحرانی ویحیی بن عبداللہ بن بکر وسعید بن ابی مریم... قال النسائی صالح۔

اس عبارت میں یحییٰ بن ایوب العلاف کا نسب مذکور ہے، اور ساتھ ہی ان کے شیوخ میں سعید بن ابی مریم کا نام بھی لکھا ہے (جن سے انہوں نے زیر بحث حدیث کو روایت کیا ہے) اور امام نسائی کی توثیق منقول ہے اور توثیق کے سوا کسی کی کوئی جرح منقول نہیں۔

اس کے بعد اگلے صفحہ ۱۸۶ پر یحییٰ بن ایوب الغافقی کا تذکرہ ہے، اُن کے متعلق بعض کی توثیق اور بعض کا تخطیہ طویل عبارت میں بالتفصیل منقول ہے۔

تھانوی صاحب کا بلا دلیل نہیں بلکہ خلاف دلیل "علاف" کے بارے میں "غافقی" کا احتمال پیدا کرنا، دیانت اور انصاف کا خون نہیں تو اور کیا ہے؟

آگے چل کر تھانوی صاحب نے فرمایا:

"دوسرے ایک راوی خالد بن زید ہیں، یہ بھی غیر منسوب ہیں، اس نام کے رواۃ میں سے ایک کی عادۃ ارسال کی ہے، اور یہاں عنعنہ ہے جس میں راوی کے متروک ہونے کا

اور اس متروک کے غیر ثقہ ہونے کا احتمال ہے"۔ انتہی [1]

حدیث معنعن پر کلام

اقول: تھانوی صاحب کے یہ تمام احتمالات بلا دلیل ہونے کی وجہ سے مردود ہیں، ورنہ حدیث معنعن کا مطلقاً ساقط الاعتبار ہونا لازم آئے گا، خالد بن زید نام کے کسی راوی میں ارسال کی عادت کا پایا جانا زیر نظر راوی کو متعین نہیں کرتا، اور اگر بالفرض تعین ہو بھی جائے تو ارسال اتصال کے منافی نہیں، تاوقتیکہ معنعن (بالکسر) کا مدلس ہونا ثابت نہ ہو اور راوی و مروی عنہ کی لقاء کا امکان منتفی نہ ہو جائے، تدریب الراوی میں ہے:

ا۔ فروع: احد ها الاسناد المعنعن وهو قول الراوي (فلان عن فلان) بلفظ عن من غير بيان للتحديث والاخبار والسماع (قيل انه مرسل) حتي يتبين اتصاله (والصحيح الذي عليه العمل وقاله الجماهير من اصحاب الحديث والفقه والاصول انه متصل)... (بشرط ان لا يكون المعنعن) بكسر العين (مدلسا وبشرط امكان لقاء بعضهم بعضا) اي لقاء المعنعن من روي عنه بلفظ عن فحينئذٍ يحكم بالاتصال الا ان يتبين خلاف ذلك۔ انتهي [2]

یہ عبارت اس مضمون میں صریح ہے کہ عنعنہ میں اگر راوی کا مروی عنہ سے امکان لقاء پایا جائے اور معنعن مدلس نہ ہو تو وہ حدیث متصل مانی جائے گی، تاوقتیکہ اس کا خلاف ظاہر نہ ہو۔ اگر تھانوی صاحب میں ہمت تھی تو وہ کسی دوسرے طریق سے اس کا خلاف ثابت کرتے،

---

[1] بوادر النوادر، جلد اول، ص ۱۰۵

[2] تدریب الراوی، ص ۱۳۲

محض کسی ہم نام راوی کی عادت ارسال کا دعویٰ اس حدیث کے ساقط الاعتبار ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔

ارسال اور تدلیس کا فرق

علاوہ ازیں یہ کہ تھانوی صاحب نے ارسال کو اتصال کے منافی قرار دیا تھا، مگر عبارت منقولہ بالا سے ثابت ہوگیا کہ تدلیس اتصال کے منافی ہوسکتی ہے، محض ارسال کو اس کے منافی قرار دینا غلط ہے۔

ممکن ہے تھانوی صاحب ارسال ہی کو تدلیس سمجھتے ہوں، تو واضح رہے کہ تدلیس وارسال ایک نہیں، ملاحظہ فرمائیے "تدریب الراوی" ص ۱۴۰:

۲۔ (تدلیس الاسناد بان یروی عمن عاصره) زاد ابن صلاح اولقیه (مالم یسمعه منه بل سمعه من رجل عنه (موهما سماعه) حیث اورد بلفظ یوهم الاتصال ولا تقتضیهاور ارسال کے معنی هیںان الارسال روایته عمن لم سمع منه۔ (تدریب الراوي، ص۱۴۰)

معلوم ہوا کہ تدلیس وارسال دونوں الگ الگ ہیں، عنعنہ میں تدلیس مضر ہے، ارسال مضر نہیں، لہذا تھانوی صاحب کے وہ تمام احتمالات جو بلا دلیل محض اُن کے ظن فاسد کی بنا پر پیدا ہوئے تھے لغو اور بے بنیاد ہو کر رہ گئے۔

اس کے بعد تھانوی صاحب نے فرمایا:

"تیسرے ایک راوی سعید بن ابی ہلال ہیں جن کو ابن حزم نے ضعیف اور امام احمد نے مختلط کہا وہذا کلہ من التقریب، پھر کئی جگہ اس میں عنعنہ ہے جس کے حکم بالاتصال کے لئے ثبوت تلاقی کی حاجت ہے"۔ انتہیٰ (بوادر النوادر، جلد اول، ص ۱۰۵)

اقول: عنعنہ کے مسئلہ میں تھانوی صاحب کا یہ کلام ہی غلط ہے کیونکہ حدیث معنعن میں حکم بالاتصال کے لئے ثبوتِ تلاقی ضروری نہیں، صرف امکان تلاقی کافی ہے، جیسا کہ تدریب الراوی سے نقل کر چکا ہوں (وبشرط امکان لقاء بعضهم بعضاً[1]

رہے تیسرے راوی سعید بن ابی ہلال جن کی تضعیف تھانوی صاحب نے ابن حزم سے نقل کی ہے، تو مجھے حیرت ہے کہ تھانوی صاحب نے تضعیف تو دیکھ لی مگر توثیق انہیں نظر نہ آئی، ذرا میزان الاعتدال اٹھا کر دیکھئے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں :

"سعید بن ابي هلال (ع) ثقه معروف حديثه في الكتب الستة، يروي عن نافع، ونعيم المجمر، وعنه سعيد المقبري أحد شيوخه، قال ابن حزم وحده: ليس بالقوي"۔[2]

ناظرین کرام غور فرمائیں! جو راوی کتب ستہ (بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ) میں معروف اور ثقہ ہو اور اس کے بعض شیوخ بھی اس سے روایت کرتے ہوں اُسے ابن حزم کے قول کی آڑ لے کر متروک قرار دینا تعصب نہیں تو کیا ہے؟

اگر ابن حزم کا قول تھانوی صاحب کے نزدیک ایسا ہی معتبر ہے تو انہیں جامع ترمذی سے بھی ہاتھ اٹھا لینا چاہئے، کیونکہ ابن حزم نے ترمذی کو مجہول کہا ہے۔ (كما ذكر في ما تمس اليه الحاجة، ص ۲۵، عن التعليق الممجد ناقلا وعن ذهبي)

آخر میں اتنی بات عرض کروں گا کہ حدیث زیر بحث کے متعلق حافظ منذری کا یہ قول کہ "رواه ابن ماجة بسند جيد" تھانوی صاحب کے تمام احتمالات واہیہ کا قلع قمع کر دیتا ہے، اور اس بحث میں ان کی پوری دردسری کو مہمل اور بیکار بنا کر چھوڑ دیتا ہے، کیونکہ تھانوی صاحب کے کسی احتمال میں ذرا بھی جان ہوتی یا ان کی تضعیف منقول میں کچھ

---

[1] تدریب الراوی، ص ۱۳۲

[2] میزان الاعتدال، جلد اول، ص ۳۹۳

بھی قوت پائی جاتی تو ایک عظیم وجلیل محدث اس کے بارے میں بسند جید کے الفاظ نہ بولتا، شاید کوئی کہے کہ وہ کوئی اور سند ہوگی، تو میں عرض کروں گا کہ سند جید سے کسی اور سند کا مراد ہونا ہمارے لئے مزید تقویت کا موجب ہے کیونکہ تعدد طرق زیادتی قوت کا موجب ہے، بالخصوص ایسی صورت میں جب کہ سند بھی جید ہو۔

ناظرین کرام نے تھانوی صاحب کی تحقیق کو ہمارے کلام سے ملا کر اندازہ کرلیا ہوگا کہ ان کی تحقیق کہاں تک تحقیق کہلائے جانے کی مستحق ہے؟

آگے چل کر تھانوی صاحب ارشاد فرماتے ہیں :

"یہ تو مختصر کلام ہے سند میں، باقی رہا متن، سو اولاً معارض ہے دوسری احادیث صحیحہ کے ساتھ، چنانچہ مشکوٰۃ میں نسائی اور دارمی سے بروایت ابن مسعود یہ حدیث ہے " قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ ملائکۃ سیاحین فی الارض یبلغون من اُمتی السلام "۔ اور یہی حدیث حصن حصین میں بحوالہ مستدرک حاکم وابن حبان بھی مذکور ہے، اور نیز مشکوٰۃ وبیہقی سے بروایت ابوہریرہ حدیث ہے "قال رسول اللہ ﷺ من صلی علی عند قبری سمعتہ ومن صلی علی نائیاً ابلغتہ "۔ اور نسائی کی کتاب الجمعہ میں بروایت اوس ابن اوس یہ حدیث مرفوع ہے فان صلوتکم معروضۃ علی یہ سب حدیثیں صریح ہیں عدم السماع عن بعید میں ظاہر ہے کہ جلاء الافہام ان کتب کے برابر قوی نہیں ہو سکتی لہذا اقوی کو ترجیح ہوگی"۔ [1]

اقول : سند میں جو کلام فرمایا تھا، اس کی حقیقت واضح ہو چکی، اب متن میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کا حال بھی ناظرین کرام پر کھل جائے گا۔

[1] بوادر النوادر، جلد اول، ص ۲۰۵

دُور سے سننے کی بحث

تھانوی صاحب کے اس کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ جلاء الافہام کی حدیث "بلغني صوته حيث كان" ان تینوں صحیح حدیثوں کے معارض ہے، جو تھانوی صاحب نے نقل فرمائی ہیں، وجہ یہ ہے کہ جلاء الافہام کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر ایک دُرود پڑھنے والے کے دُرود کی آواز سُن لیتے ہیں، اور ان تینوں حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ دُرود جو دُور سے پڑھا جائے، اسے حضور ﷺ کے سامنے فرشتے پیش کرتے ہیں، فرشتوں کا عرض و ابلاغ عدم سماع میں صریح ہے اور سماع عدم سماع کے معارض ہے، لہٰذا جلاء الافہام کی حدیث ان تینوں صحیح حدیثوں کے معارض قرار پائی۔ یہ تینوں حدیثیں جن کتابوں میں پائی جاتی ہیں چونکہ جلاء الافہام ان کی برابر قوۃ میں نہیں، لہٰذا ان ہی تینوں حدیثوں کو ترجیح ہوگی جو اقوی ہیں، اور جلاء الافہام کی حدیث ساقط الاعتبار ہوگی۔

میں عرض کروں گا کہ نسائی اور دارمی کی حدیث بروایت ابن مسعود "ان الله ملئكة سياحين فى الارض يبلغون عن اُمتي السلام" اور اسی طرح نسائی کی دوسری حدیث بروایت اوس بن اوس فان صلوتكم معروضة علي میں صرف اتنا مذکور ہے کہ ملائکہ سیاحین فی الارض حضور ﷺ کی خدمت میں اُمت کا سلام پہنچاتے ہیں، اور اُمت کا دُرود بارگاہ رسالت میں پیش ہوتا ہے۔ ملائکہ کے اس "عرض و تبلیغ" کو تھانوی صاحب کا عدم سماع میں صریح قرار دینا یقیناً ظلم صریح ہے، کیونکہ عرض و تبلیغ کا علم اور لا علمی، سماع، یا عدم سماع سے قطعاً کوئی تعلق نہیں، فیض الباری کی عبارت میں صاف موجود ہے کہ عرض صلوٰۃ علم کے منافی نہیں۔[1]

---

[1] انور شاہ کشمیری، فیض الباری، جلد ۳، ص ۳۰۲

ایک فرشتہ ساری مخلوق کی آوازیں سنتا ہے

"جلاء الافہام" کی حدیث ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا" صلی علی عند قبری و کل اللہ بہ ملکا یبلغنی "[1] "جو شخص میری قبر کے پاس مجھ پر دُرود پڑھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے میری قبر انور پر ایک فرشتہ مقرر کیا ہوا ہوتا ہے جو اُس کا دُرود مجھے پہنچا دیتا ہے، اگر تبلیغ ملائکہ عدم سماع میں صریح ہو تو اس حدیث سے لازم آئے گا کہ جو دُرود قبر انور پر پڑھا جاتا ہے حضور ﷺ اُسے بھی نہیں سنتے، جو بالاتفاق باطل ہے، جب یہ فرشتوں کا پہنچانا عدم سماع کے معنی میں نہ ہوا تو تعارض باقی نہ رہا، عدم تعارض کی صورت میں ترجیح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، رہی حدیث بیہقی بروایت ابو ہریرہ جسے تھانوی صاحب نے مشکوۃ شریف سے نقل فرمایا ہے تو درحقیقت اس مسئلہ میں تھانوی صاحب کے استدلال کی جان یہی ایک حدیث ہے۔

تھانوی صاحب کی پیش کردہ حدیث پر کلام

جس طرح تھانوی صاحب نے ہماری پیش کردہ حدیث کی سند اور متن پر کلام کیا ہے ہمیں بھی حق حاصل ہے کہ تھانوی صاحب کے دعویٰ کی بنیادی حدیث کے متن و اسناد پر ہم بھی کلام کریں، متن حدیث پر ہمارا کلام کتاب "حیات النبی ﷺ" کے صفحات پر ناظرین کرام نے ملاحظہ فرمالیا ہوگا، اب اس کی اسناد پر کلام کرتے ہیں۔

تھانوی صاحب نے بیہقی کی اس حدیث کو بروایت ابو ہریرہ مشکوۃ سے نقل کیا ہے جس میں سند مذکور نہیں ہے، ہم اس حدیث کو خود امام بیہقی کی تصنیف رسالہ "حیاۃ الانبیاء" سے مع سند نقل کرتے ہیں اور امام بیہقی نے، نیز ان کے رسالہ حیاۃ الانبیاء کے شارح نے اس کی سند پر جو کلام کیا ہے اسے بھی بلفظہٖ نقل کرتے ہیں:

---

[1] (جلاء الافہام، مطبوعہ مکتبۃ القاہرۃ، ص ۱۴)

'' اخبرنا علي بن محمد بن بشران انبأ ابو جعفر الرازي ثنا عيسي بن عبدالله الطيالسي ثناء العلاء بن عمرو الحنفي ثنا ابو عبدالرحمن عن الاعمش عن ابي صالح عن ابي هريرة عن النبي ﷺ قال '' من صلي علي عند قبري سمعته ومن صلي علي نائياً منه ابلغته '' ابو عبدالرحمن هذا هو محمد بن مروان السدي فيما اُري وفيه نظر ''۔ [1]

حدیث ابو ہریرہ پر امام بیہقی کی جرح

دیکھئے امام بیہقی نے اس حدیث کے راوی کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ میرے نزدیک ابوعبدالرحمن ہی محمد بن مروان سدی ہے اور اس میں نظر ہے "وفیہ نظر" الفاظ جرح میں سے ہے دیکھئے میزان الاعتدال، جلد اول، ص ۳ طبع مصر۔

حدیث ابو ہریرہ پر شارح حیاۃ الانبیاء کی جرح

اس حدیث کے تحت محمد بن محمد الحاجی الیوسفوی شارح حیات الانبیاء فرماتے ہیں :

'' حديث ابي هريرة هذا نسبه السيوطي في الخصائص الكبري الي الاصبهاني في الترغيب والترهيب ونسبه في الجامع الصغير الي البيهقي ومحمد بن مروان السدي الصغير ضعيف اتهم بالكذب وقد ذكر الحافظ الذهبي هذا الحديث في ميزان الاعتدال في ترجمة السدي المذكور ''۔ [2]

ترجمہ: ''ابوہریرہ کی اس حدیث کو سیوطی نے خصائص کبری میں اصبہانی کی طرف منسوب کیا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب ''الترغیب والترہیب'' میں اس کی روایت کی ہے.

[1] رسالہ حیات الانبیاء للبیہقی، ص ۱۲ [2] حیاۃ الانبیاء للبیہقی مع شرح، ص ۱۳

اور جامع الصغیر میں بیہقی کی طرف منسوب کیا ہے اور (ابوعبدالرحمن) محمد بن مروان السدی الصغیر ضعیف ہے، متہم بالکذب ہے، اور حافظ ذہبی نے اس حدیث (ابوہریرہ) کو میزان الاعتدال میں اسی سدی مذکور کے ترجمہ میں ذکر کیا ہے"۔

حدیث ابوہریرہ پر امام ذہبی کی جرح

اب میزان الاعتدال اصل کتاب کو ملاحظہ فرمائیے، امام ذہبی فرماتے ہیں :

" (محمد بن مروان) السدي الكوفي وهو السدي الصغير عن هشام بن عروة والاعمش تركوه واتهمه بعضهم بالكذب وهو صاحب الكلبي قال البخاري سكتوا عنه وهو مولي الخطابيين لا يكتب حديثه البتة وقال ابن معين ليس بثقة وقال احمد ادركته وقد كبر فتركته العلاء بن عمرو الحنفي حدثنا محمد بن مروان عن الاعمش عن ابي صالح عن ابي هريرة مرفوعا من صلي عند قبري سمعته ومن صلي علي نائيا ابلغته " انتهي [1]

ترجمہ: " محمد بن مروان السدی کوفی ہے اور وہ سدی صغیر ہے، وہ ہشام بن عروہ اور اعمش سے روایت کرتا ہے، محدثین نے اسے ترک کر دیا ہے اور بعض نے اسے متہم بالکذب کہا اور وہ صاحب کلبی ہے، بخاری نے کہا "سکتوا عنہ" اور وہ مولائے خطابیین ہے، اس کی حدیث یقیناً نہیں لکھی جاتی اور ابن معین نے کہا کہ وہ ثقہ نہیں ہے، امام احمد نے کہا میں نے اسے پایا وہ بوڑھا ہوگیا تھا، میں نے اسے ترک کر دیا، علاء بن عمرو الحنفی نے کہا ہم سے محمد بن مروان نے حدیث بیان کی اس نے اعمش سے روایت کی، اعمش نے ابوصالح سے، ابوصالح نے ابوہریرہ سے مرفوعاً روایت کی کہ جس نے میری قبر کے پاس آ کر مجھ پر

[1] میزان الاعتدال، جلد ثالث، ص ۱۳۲ طبع مصر

درود پڑھا، میں اُسے سنتا ہوں اور جس نے مجھ پر دُور سے درود پڑھا وہ مجھے پہنچا دیا جاتا ہے"۔ انتہیٰ

میزان الاعتدال سے علامہ ذہبی کا جو بیان ہم نے نقل کیا، اس سے یہ شبہ بھی دور ہو گیا کہ امام بیہقی نے فیما اُری فرمایا ہے جو تردد کا مظہر ہے، میں عرض کروں گا کہ اگر فی الواقع یہ محل تردد ہوتا تو امام ذہبی اس کو ظاہر فرمادیتے لیکن انہوں نے اس کے ترجمہ میں بعینہا اسی روایت کو نقل کر کے اس شبہ کی جڑ کاٹ دی، اور اس حقیقت حال کو بے نقاب کر دیا۔

ہمارے ناظرین نے تھانوی صاحب کی جرح بھی دیکھی، اب ان کی پیش کردہ روایت پر ہماری جرح بھی ملاحظہ فرمائیں، ہماری پیش کردہ حدیث کی سند میں کسی راوی کو تھانوی صاحب متہم بالکذب ثابت نہیں کر سکے، مگر ان کی پیش کردہ حدیث کی سند میں محمد بن مروان کو ہم نے متہم بالکذب ثابت کر دیا، اگرچہ جرح رواۃ کے باب میں صحت روایت کا معیار اپنے مسلک کی روشنی میں ہم نے یہاں بیان نہیں کیا، لیکن تھانوی صاحب کے پیش کردہ معیار پر تو یقیناً محل گفتگو باقی نہیں رہا، اور یہ بات صاف ہو گئی کہ تھانوی صاحب نے سمعتہ کا ابلغتہ سے تقابل کر کے ابو ہریرہ کی جس حدیث کو عدم سماع میں صریح قرار دیا تھا، وہ حدیث صحیح نہیں اور اس کی صحت پر انہوں نے اپنے احتمالات اور تاویلات کی جتنی عمارت قائم کی تھی وہ سب منہدم ہو کر رہ گئی۔

اس کے بعد جناب تھانوی صاحب نے ثانیاً کی بجائے ثالثاً فرما کر بلغنی صوتہ کو محتمل تاویل قرار دیا ہے اور صوتہ کی تاویل صلوٰۃ کے ساتھ فرمائی ہے، اور اس احتمال تاویل کی دلیل ان ہی احادیث منقولہ بالا کو قرار دیا ہے، لیکن ناظرین کرام نے سمجھ لیا ہو گا کہ احادیث منقولہ بالا احتمال تاویل کی دلیل اس وقت ہو سکتی ہے جب کہ تبلیغ و عرض ملائکہ عدم سماع پر مبنی ہو، حالانکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ عرض و تبلیغ لا علمی کو مستلزم نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبر انور کا درود سماع فرماتے ہیں اور ملائکہ اس کی تبلیغ بھی بارگاہِ رسالت میں کرتے ہیں، معلوم ہوا کہ

فرشتوں کا درود وسلام بارگاہِ اقدس میں پہنچانا یا پیش کرنا علم وسماع کے منافی نہیں، جب یہ منافات ختم ہوگئی تو ان احادیث کا احتمال تاویل کے لئے دلیل قرار پانا بھی ختم ہوگیا، جب دلیل نہ رہی تو احتمال تاویل خود باطل ہوگیا، ایسی صورت میں بلغنی صوتہ کو بلغنی صلوٰۃ کے ساتھ موؤل کرنا قطعاً باطل قرار پایا۔

جواب لکھنے کے بعد تھانوی صاحب اس حدیث کا ایک اور جواب تحریر فرماتے ہیں :

''بعد تحریر جواب ہذا بلا توسط فکر قلب پر وارد ہوا کہ اصل حدیث میں صوتہ نہیں ہے، بلکہ صلوٰۃ ہے، کاتب کی غلطی سے لام رہ گیا ہے'' الخ

اقول : یہ جواب واقعی بہترین جواب ہے، کیونکہ اس پر کسی قسم کا نقض منع یا معارضہ وارد نہیں ہوسکتا، الہامات کا جواب الہام ہی سے ہوسکتا ہے، ہمیں اَب تک اس باب میں کوئی الہام نہیں ہوا، مگر تھانوی صاحب کے جواب کی داد دیئے بغیر ہم نہیں رہ سکتے، کہ جب کسی بات کا جواب نہ ہوسکے تو اُسے کاتب کی غلطی قرار دے کر اپنے الہام کو اس کی دلیل میں پیش کردیا جائے۔[1]

---

[1] ماہنامہ السعید ملتان، شمارہ جولائی، اگست ۱۹۶۲ء

حرمتِ تکفیرِ مسلم

ڈاکٹر عمیر محمود صدیقی

شعبہ علوم اسلامیہ جامعہ کراچی

ورلڈ ویو پبلشرز

خانقاہوں میں چھپتی رافضیت و تفضیلیت کا تحقیقی جائزہ

بوارق العذاب لاعداء الاصحاب

۵۳ ھ ۱۳

تنقیص صحابہ رضی اللہ عنہم کا علمی تعاقب

سید شاہ مصباح الحسن چشتی پھپھوندوی

ورلڈ ویو پبلشرز

تحقیق الاصابیر فی

سماعِ المزامیر

(اردو ترجمہ)

ساز کے ساتھ مجلس سماع کی لاجواب تحقیق

تالیف

فخر العارفین حضرت علامہ سید شاہ عبد الحق

قادری چشتی ابوالعلائی، اسلام آبادی

(۱۲۷۶ - ۱۳۳۹ھ)

ورلڈ ویو پبلشرز

مجلسِ میلادِ مصطفیٰ

تحقیق، تقدیم و ترتیب

نوشاد عالم چشتی (علیگ)

تخریج و ترجمہ

ارشاد عالم نعمانی

ورلڈ ویو پبلشرز

آثار مطبوعہ "ورلڈ ویو پبلشرز"

۱ سیف الجبار	علامہ شاہ فضل رسول قادری بدایونی
۲ فقہ اسلامی کے سات بنیادی اصول	نظام الدین رضوی برکاتی
۳ حرمت تکفیر مسلم	ڈاکٹر عمیر محمود صدیقی
۴ حضرت مجدد اور انکے ناقدین	حضرت شاہ ابوالحسن زید مجددی
۵ تفہیم استشراق	ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی
۶ مجلس میلاد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم	بحر العلوم علامہ شاہ محمد گل خاں
۷ تحقیق الاضابیر فی سماع المزامیر	فخر العارفین سید شاہ عبدالحیؒ
۸ علمائے فرنگی محل (احوال و آثار)	(مترجم) ڈاکٹر خوشتر نورانی
۹ تنقیص صحابہ کا علمی تعاقب	سید مصباح الحسن شاہ چشتی پھپھوندوی
۱۰ ایک زمانہ ایسا آئے گا	علامہ مفتی محمد احسن اویسی
۱۱ سچے مرید کے اوصاف (مترجم)	علامہ عبدالوہاب شعرانی
۱۲ تحریک ختم نبوت 1974ء	محمد ثاقب رضا قادری
۱۳ غلام معین الدین نعیمی (حیات و خدمات)	محمد ثاقب رضا قادری
۱۴ غازیان ناموس رسالت	محمد ثاقب رضا قادری
۱۵ قادیانیت (ایک تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر غلام زرقانی قادری
۱۶ سید سلیمان اشرف بہاری اور دو قومی نظریہ	محمد احمد ترازی
۱۷ سرور القلوب فی ذکر المحبوب (جدید کمپیوٹرائز)	رئیس المتکلمین مولانا نقی علی خاں

۱۸ تذکرہ علمائے ہندوستان (زیر طبع) (مولانا سید محمد حسین بدایونی) (تحقیق: ڈاکٹر خوشتر نورانی)

آثار مطبوعہ ورلڈ ویو پبلشرز

سیف الجبار	علامہ شاہ فضل رسول قادری بدایونی
حرمت تکفیر مسلم	ڈاکٹر عمیر محمود صدیقی
تنقیص صحابہ کا علمی تعاقب	سید شاہ مصباح الحسن چشتی پھپھوندوی
تہذیب العقائد شرح العقائد النسفیہ	علامہ محمد نجم الغنی خاں رامپوری
مرام الکلام (مترجم)	علامہ عبد العزیز پرہاروی
تحفہ محمدیہ (تقویۃ الایمان کارد)	سید عبد الفتاح المدعو اشرف علی گلشن آبادی
حضرت مجدد اور انکے ناقدین	حضرت شاہ ابو الحسن زید مجددی
تفہیم استشراق	ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی
مجلس میلاد مصطفےٰ ﷺ	بحر العلوم علامہ شاہ محمد گل خاں کابلی
تحقیق الاضابیر فی سماع المزامیر	فخر العارفین سید شاہ عبد الحی ابو العلائی
القول المنیر فی جواز سماع المزامیر	علامہ سید غلام قادر چشتی اصدقی
سچے مرید کے اوصاف (مترجم)	علامہ عبد الوہاب شعرانی
ایک زمانہ ایسا آئے گا	علامہ مفتی محمد احسن اویسی
فقہ اسلامی کے سات بنیادی اصول	مفتی محمد نظام الدین رضوی برکاتی
احوال وآثار شاہ برکت اللہ مارہروی	ڈاکٹر سید محمد امین میاں برکاتی
تذکرے اپنے آباء کے	خلیل احمد رانا
علمائے فرنگی محل (احوال وآثار)	ڈاکٹر خوشتر نورانی

تذکرہ علمائے ہندوستان (زیر طبع) مولانا سید محمد حسین بدایونی، تحقیق: ڈاکٹر خوشتر نورانی

ورلڈ ویو پبلشرز دکان نمبر 11 فرسٹ فلور الحمد مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
04237236426 03333585426
worldviewforum786@gmail.com
Rs 600